۳، ۱۲، ۵۵، ۵۹، ۶۲-۶۵، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۶،

- ۳۶

1774

کارنامۂ سروری

یعنی

سوانح خودنوشت

سرور الملک سرور الدولہ نواب آغا مرزا بیگ خان بہادر
سرور جنگ مرحوم

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ

کارنامۂ سروری

سوانح خودنوشت

عالی جناب سرور الملک سرور الدولہ نواب آغا مرزا بیگ خان بہادر سرور جنگ مرحوم و مغفور

سابق معتمد پیشی و استادِ خاص

اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

طاب اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ

جناب نواب والا قدر جنگ بہادر ایم اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا

"خلافت اندلس" (حصہ اول۔ دوم۔ سوم) "وکیاولے" (انگریزی)

خلفِ اکبر حضرت مصنف مرحوم سابق رکن عدالت العالیہ (ہائی کورٹ جج) معتمد فوج طبابت

حال ہوم سکریٹری دولتِ آصفیہ۔ حیدرآباد (دکن)

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

نواب ذوالقدر جنگ بہادر (خلف اکبر مصنف مرحوم)

کلا انہا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ

تعارف

کارنامۂ سروری

یا

تذکرۂ سروری خودنوشت

(از قلم نواب ذوالقدر جنگ بہادر خلف الرشید مصنف کارنامہ)

حامداً و مصلیاً

نواب آغا مرزا بیگ المخاطب بہ سرور جنگ سرور الدولہ سرور الملک بہادر مرحوم کے حالاتِ زندگی شخصی سوانح کی جملہ دلچسپیوں کے علاوہ "حیدرآباد جدید" کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اُس زمانے میں حیدرآباد آئے جب کہ یہاں کے بیدار مغز و نامور وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست کو برطانی

آئین و انتظام کے قالب میں ڈھال رہے تھے اور بالارادہ یا بلاارادہ اس نئی عمارت کے بنانے میں مصروف تھے جس کی داغ بیل ممالک ایشیا میں پہلی مرتبہ مغربی نقشے کے مطابق ڈالی گئی تھی۔

یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ ممالک ہندوستان کی مخلوط و منقسم، قدامت پسند وا وہام پرست آبادی میں یورپ کے جمہوری اصول کس حد تک موثر اور کس طرز پر قابلِ عمل ہوں گے، مجھے یہاں صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ آئین جدید کی اس تاریخ میں مملکت آصفیہ کے نظم و نسق کا ارتقا بھی ضروری اور کئی اعتبار سے نہایت سبق آموز عنوان ہے اور والد مرحوم کی خود نوشتہ سوانح عمری میں سیاسیات کے طالب علم کی نظر اس عنوان کے بعض ایسے پہلوؤں تک رسا ہو جائے گی جو اور کسی تاریخ میں شاید ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکیں گے۔

اسی مطالعے کا ایک دوسرا موضوع حکومت کے ممتاز ارکان و افراد کے وہ اوصاف و خصائل ہیں جن پر کسی سیاسی تنظیم کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ حضرت مصنف مرحوم اُس وقت حیدرآباد آئے ہیں جب کہ یہ ریاست قرونِ وسطیٰ کے سادہ اور شخصی طرزِ ملک داری کو چھوڑ کر ایک اجتماعی نظامِ حکومت کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جہاں ذاتی اخلاق و محاسن سے بڑھ کر اجزائے دولت کے مل کر کام کرنے کی قابلیت اور آئین و ضوابط کی سچی پابندی کی آزمائش کی جاتی ہے اور جہاں ضبط نفس اور محنتِ شاقہ ہی کو سب سے بڑی دلیری اور وفاداری سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ وہ دل چسپ درسِ بصیرت ہے جسے اہلِ خرد آیندہ اوراق میں بلامنتِ اُستاد حاصل کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان صفحات پر گزشتہ

نسل کے اکثر ممتاز ترین عمّال واکابر اپنی اپنی زندگی کا کھیل دکھاتے نظر آتے ہیں اور ان کے طرزِ عمل کے نتائج خود بخود اُن کی قابلیت اور کردار کی تفسیر کرتے چلے جاتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو کسی ملک کی تاریخ میں شخصیات کا یہ بحث جس قدر دشوار و مخدوش ہے اسی قدر زیادہ دل فریب و کارآمد ہے اور غالباً یہی سبب تھا کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ جسے برادرعزیز نواب جیون یار جنگ بہادر نے دو سال پہلے شائع کیا، ملک بھر میں نہایت مقبول ہوا اور طبع اول کے سارے نسخے چند ماہ میں ختم ہوگئے۔ ترجمے کی یہ قبولیت دیکھکر حضرت والد مرحوم کو اور بھی زیادہ خیال ہوا کہ اصل اُردو کتاب جلد طبع کردی جائے مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ کام تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور اُن کے انتقال سے کچھ مدت بعد اسے اب چھاپ کر شائع کیا جارہا ہے۔

اجمالی طور پر اسے تین بڑے ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بچپن[۱] تعلیم[۲]۔ ملازمت[۳] یہ عجیب اتفاق ہے کہ والد مرحوم کے یہ تینوں عہد ہندوستان کے تین مرکزی مقامات میں گزرے بچپن دہلی میں گزرا جہاں شاہی اقتدار کو بگڑتے دیکھا۔ تعلیم کا زمانہ لکھنؤ میں گزرا جہاں انگریزی اقتدار کو قائم ہوتے دیکھا۔ ملازمت کا عہد فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں گزرا۔ جہاں شاہی شان و شوکت کا پھر جاہ و جلال دیکھا۔ ان تینوں زمانوں کو جس حسن و خوبی سے والد مرحوم نے بیان فرمایا وہ انھیں کا حق تھا۔ مرحوم و مغفور نے اپنی تمام کتاب قلعۂ معلّٰی کی اُردو میں لکھی ہے جس کا انھوں نے اپنے دیباچہ کے علاوہ کتاب میں بھی بعض مواقع پر تذکرہ کیا ہے اور اسی لئے وہ ادبیت کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ پھر تعلیمی عہد کو چھوڑ کر بچپن اور ملازمت کے لئے

سفر میں جو صعوبتیں اُٹھائیں اور جس تحمل و برداشت سے ان کا مقابلہ کیا وہ کچھ کم عبرت خیز نہیں ہیں۔ "کارنامہ سروری" کا ابتدائی حصہ مغلیہ دور کے دمِ آخر کا جامع و مانع مرقع ہے جس میں پہلے تو اُس زمانہ کے اشراف و اعیان و متوسط و عوام کے تمدن معاشرت کو بیان کیا اُس کے بعد دہلی کی جو تباہی اور شریف گردی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے مرحوم بھی مع اپنے کنبے کے شکار رہ چکے تھے، اُس کو نسبتاً وضاحت سے لکھا ہے۔ چنانچہ اپنے چشم دید واقعات تباہی و پریشانی بیان فرماتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"مسلح گورے مع ہندوستانیوں اور افغانیوں کے فتح کے نشے میں سرشار اور لوٹ کے خیال میں گرفتار عورتوں کو چھوڑتے تھے نہ بچوں کو نہ بوڑھوں پر رحم کرتے تھے نہ جوانوں پر۔ محلات میں گروہ کے گروہ گھس کر تاخت و تاراج شروع کر دیتے تھے۔ اُدھر مستورات جن پر فردوسی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

منیژہ منم دختِ افراسیاب ۔۔۔ برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اپنے خاوندوں کے مقدر سے بے خبر ادھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔"

اسی پریشانی اور تباہی کا طفیل تھا کہ دادا مرزا مغل بیگ مع کنبہ کے الور کی طرف چلے گئے جہاں والد مرحوم کے بڑے ماموں وزیر اعظم تھے۔

کتاب کے دوسرے وسطی حصے میں الور کی گردش کو بیان کیا ہے جہاں سے تباہ و پریشان دہلی ہوتے ہوئے مرحوم مع اپنے کنبہ کے اپنے چچا مرزا عباس بیگ مرحوم کی طلبی پر ان کے پاس پہنچے جو اُس وقت سیتا پور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور بعد میں

بڑے گاؤں ضلع سیتا پور کے تعلقدار رہوئے اُس کے بعد لکھنؤ میں آکر اپنے چچا کی نگرانی میں اپنے تعلیمی عہد کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہی جس کے ساتھ ساتھ اہل لکھنؤ کے تمدنی اور معاشرتی زندگی کی بھی چاشنی ہی۔جہاں شاہی اقتدار زائل ہو کر انگریزی پرچم لہرا رہا تھا۔ مرحوم کی علمی اور تعلیمی زندگی چوں کہ لکھنؤ ہی میں شروع ہوتی ہی اور ایک حد تک یہیں ختم ہوجاتی ہی اس لئے اس حصۂ کتاب کو ابتدائے سفر کے سرسری حالات لکھنے کے بعد اپنے تعلیمی مشغلے علمی مذاکرے اور ادبی ذوق ہی پر ختم کیا ہی۔

کتاب کا تیسرا حصہ نہ صرف بحیثیت حجم کے بڑا ہی بلکہ حقیقت یہ ہی کہ یہی حصّہ مقصود بالذات اور مرحوم کی زندگی کا اصلی کارنامہ ہی۔ یہی حصہ وہ ہی جس نے مرحوم کے نام اور شہرت کو حیاتِ جاوید عطا کی۔ اس میں ابتدائے لکھنؤ سے بعزم حیدرآباد روانگی کا تذکرہ ہی جس میں راستہ کی صعوبتوں کو جو بالخصوص اُس زمانہ میں پیش آتی تھیں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہی اور بعض بعض جگہ محققانہ انداز بھی اختیار کیا ہی جس سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُس دشوار گزار سفر میں والد مرحوم نے صرف راستہ ہی نہیں طے کیا بلکہ بہت سی باتوں کی گہرائیوں پر بھی عمیق نظر ڈالی تھی۔اس ابتدا کو ختم کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنی حیدرآبادی زندگی کو از اول تا آخر نہایت تفصیل اور وضاحت سے بیان فرمایا ہی جس میں مرحوم نے سنہ ۱۸۶۹ء سے سنہ ۱۸۹۷ء تک جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کا جس طرح سے مقابلہ کیا اُن کو نسبتاً تفصیل سے لکھا ہی۔ایک اصول والد مرحوم کی زندگی کا محور تھا وہ ملک اور مالک کی بہی خواہی۔یہی وہ کارنامہ تھا جس نے اُن کو تا دمِ زیست باوقار رکھا۔

خدا ہم سب لوگوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ اپنے بادشاہ خلّد اللہ ملکہٗ کی ظلِّ حمایت میں اُس کے وفادار اور دیانت و امانت کے ساتھ ملک و مالک کی خدمت میں سرگرم رہیں

ع این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

آخر میں مولوی سید ہاشمی مولوی ابرار حسین صاحب عالم، منشی فاضل، ایم اے (علیگ) فاروقی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں جنھوں نے "کارنامۂ سروری" کی طباعت کے سلسلہ اور نظرِ ثانی وغیرہ میں پوری پوری مدد دی۔ اس کے ساتھ ہی مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ کا بھی میں شکرگزار ہوں جنھوں نے اُس کی طباعت میں پوری دل چسپی کا اظہار کیا اور اغلاط کی اصلاح پر کافی توجہ کی۔

حیدرآباد دکن
۳۰ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ
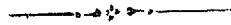
ذوالقدر جنگ

دیباچہ

از

مصنف مرحوم و مغفور

نواب سرور الملک بہادر (مصنف کتاب)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

(از مصنف مرحوم و مغفور)

یَا مَنْ[1] وَضَعَ فَرَائِدَ لَآلِی الْحِکَمِ فِی اَجْوَافِ اَصْدَافِ الْکَلِمِ تاکہ گلشن صدور اہلِ وجود و چمنِ جنانِ اہلِ شہود اذکار سلف کے ازہار و ثمار سے مالا مال ہوں وَ یَا مَنْ[2] اَبْدَعَ مِصْبَاحَ الْمَعْنٰی فِی مِشْکٰوۃِ الْحَرْفِ وہ نور کہ جس سے رموز و اسرار سلف مانند لوامع مہر با وقات ہوا جز خواطر روشن و ظاہر ہوں وَ یَا مَنْ اَوْجَدَ قَلَمًا جس نے اختراع شمۂ خور و لوحۂ قمر سے اوراق سمٰوات کو مزین فرما کر عبارت عبرت خیز ثوابت و سیّارات سے بہ فحوائے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ تاریخ تبدلات و تغیرات و حوادث عالم تحریر فرمائی ؎

اے صفاتِ تو بیا نہا از زباں انداختہ	عزتِ ذاتت یقیں را در گماں انداختہ
ہرچہ آں برہم نہادہ دست وہم و حس و عقل	کبریایت سنگ بطلاں اندراں انداختہ

[1] اے وہ ذات جس نے الفاظ کی سیپیوں کے پیٹ میں حکمتوں کے یکتا موتی بھر دیئے ۱۲ [2] اور اے وہ ذات جس نے حروف کے چراغ میں معنی کی روشنی پیدا کی ۱۲

و درود نامحدود و بے شمار امطار بر طبق صدور فرمان اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا بر صاحب لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہ و ازواجہ تا یوم القیام ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند

امّا بعد میرے فرزند دلبند سعادت مند مرزا یحییٰ محبوب قلی بیگ مرحوم نے بجد و کد و بجبر و قہر بقولِ غالب ؎

ایک بیداد گرِ جور و جفا اور سہی

مجھ سے یہ چند اوراق لکھوائے اور میں نے بہت سہل اور عام فہم اُردو میں مطابق محاورہ قلعۂ معلّٰی لکھے جو شاید اس چودھویں صدی ہجری مقدسہ میں ناظرین باتمکین کو ناپسند ہوں اس واسطے کہ شان اس زبان کی زمانۂ عم بزرگوار سر سید احمد خاں سے بدلتی چلی گئی اور اس قرن کے ادیب و مصنفین نے اس لغت دل فریب کو نیا لباس اہل یورپ سے وام لے کر پہنا دیا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علتِ غائی ایجاد لسانِ انسان یہ ہے کہ مدرکات نفوس و حواس بر صحیفۂ بیان بے التباس ارمغان اہلِ نظر کیے جائیں تو اپنے ملکی محاورات و لغات بوجہ خصوصیات معاشرت و رسم و رواج ہمارے ادائے مطالب و مقاصد کے واسطے لائق تر و موزوں تر ہیں نسبت بالسنۂ اغیار جن کے لغات فقط خصوصیات و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ لازم نہیں آتا کہ قوم مفتوحہ و مقہورہ کا روزمرّہ بھی قوم فاتحہ کے محاورات کا مفتوح و مقہور ہو جائے بلکہ اس کے خلاف تواریخ ممالک عالم شاہد و عادل ہیں مثلاً زبان

اعلیٰ حضرت ظل سبحانی میر عثمان علیخان
خلداللہ ملکہ آصفجاہ سابع

یونان مفتوحہ نے لسان رومۃ الکبریٰ فاتحہ کو مقہور کیا اور اقلیم ہند میں اردوئے معلیٰ کہ دختر بلند اختر مادر بھاشا و سنسکرت ہی، زبان ترکی و فارسی پر غالب ہوئی چنانچہ خود مرزا اسد اللہ خاں غالب کہتے ہیں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

آج یہ نازنین صنم برہمن نژاد از اقصائے مغرب - ارض الجدید - افریقہ تا ممالک مشرق چین و یا فان و شمال و جنوب میں تا کنارۂ ظلمات و جزائر اوقیانوسی بہ ہزار ناز و انداز جلوہ افروز ہی اور ہماری دعا ہی کہ ؎

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بملکِ دلبری پایندہ باشی

ہندی ہندوستان میں، بنگالی بنگلہ میں، مرہٹی مرہٹواڑی میں گجراتی گجرات میں، سندھی سندھ میں مگر اُردو ربع مسکون میں شاہانِ دہلی کی میر اور سودا اور انشا کی گود میں پروردہ معشوقۂ دلنواز مثل مہر نیمروز تابان و درخشان ہی اور ہمارے زمانہ میں صدر محافل افاضل و مہر سپہر علوم و فضائل سّباح تیار فیض الٰہی مرأت جمال خلافت و جہانداری مرکز کرۂ علم و فضل نقطۂ دائرۂ سخاوت و بذل فریدوں صولت و سکندر فکرت اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی حضور پرنور ہز اگز الٹڈ ہائنس میر عثمان علی خان بادشاہِ دکن ؎

صریرِ کلکِ تو در کشفِ مشکلاتِ علوم
چنانچہ نغمۂ داؤد در ادائے زبور

بیت

لِکُلِّ زَمَانٍ وَاحِدٌ یُقْتَدیٰ بِہٖ[1]
وَھٰذَا زَمَانٌ اَنْتَ لَاشَکَّ وَاحِدٌ

صاحب السیف و القلم نے اُردو یونیورسٹی قائم فرمائی معلوم نہیں اب یہ بیسوا خانہ برانداز السنۂ عالم جواہر زرنگار علوم وفنون سے آراستہ اس عالم کون وفساد میں کیا قیامت برپا کرے چوں کہ ان سطور میں یہ ہندی نازنین قلعۂ معلّٰی کے قدیم پیشواز سادہ لباس میں جلوہ گر ہے۔ لہٰذا یہ مناسب ہوگا کہ چند مثالیں قلعہ کی زبان اور شہزادیوں کی زبان اور باہر والوں کے زبان کی یہاں تحریر کردوں تاکہ ناظرین خود ان کی بول چال میں فرق دریافت کرلیں۔ مثلاً ایک شہزادی کہتی ہے ؎

کوئی اُن کی شوخی تو دیکھیا ئے زلفِ خم شدہ ہاتھ میں
میرے پاس آئے دبے دبے مجھے سانپ کہکے ڈرا دیا

انصاف شرط ہے کیسی شیریں زبان ہے اور کس نئے طرز میں شہزادی نے پرانے مضمون کو ادا کیا ہے "دیکھنا" مصدر ہے مگر قلعہ والوں کا خاص محاورہ ہے۔ مرزا صابر شہزادہ جس کا انتقال بنارس میں ہوا۔ اُن کا دیوان ایسے محاوروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ شہزادی اُن کی زوجہ تھیں۔ شہر والوں میں جہاں ذوق نے کئی محاورے اہل قلعہ کے باندھے ہیں مثلاً ع

ہیں کہاں ہیں تو کہاں ہیں کی چھری گردن پر

عورتوں کی زبان باندھنا جسے ریختی کہتے ہیں خاص سعادت یار خاں رنگین کی ایجاد ہے قلعہ کی زبان میں ایک شعر وہ بھی کہہ گئے ہیں ؎

---

[1] ہر زمانے میں ایک پیشوا ہوا کرتا ہے۔ بے شک اس عہد میں تو وہ ایک ہے (یعنی پیشوا) ۱۲

بچھڑ جاؤ یکراسی مرجاؤ سارے
الٰہی لگے تم کو گولی کہاروں

شہر کی زبان میں یہ شعر مومن خان کا اچھی مثال ہے ؎
نہ کچھ تیزی چلی بادِ صبا کی ٭ بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

میاں ذوق کہتے ہیں ؎

خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیّاد کا

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

موذّن مرحبا بر وقت بولا ٭ تری آواز مکّے اور مدینے

میاں داغ بھی اچھی زبان باندھ گئے۔ مجھ کج مج زبان کا ایک شعر ہے ؎

وہ دل جس پہ تھے تجھکو سو ناز ظالم
اُسے تو نے کیسا نکمّا کیا ہے

میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے ٭ ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

سودا فرماتے ہیں ؎

مرے یار تیرا جو دل چاہے کہہ جا ٭ مگر یہ تو ہے حاجی مونس کا لہجا

باہر والوں نے بھی خوب خوب مضمون باندھے ہیں اور اُردو کو ایک دل فریب معشوق بنا دیا ہے۔ مگر دلّی والوں سے ان حضرات کا لب ولہجہ الگ ہے۔ چنانچہ اُن کی تصنیفات شاہد وعادل ہیں۔ مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لکھنؤ کی زبان میں میاں سحر نے اچھا چوچلا باندھا ہے ؎

استخارہ سحر وصل جو واجب آیا
مسکرا کر وہی کنٹھا مرے منھ پر مارا

ہمارے زمانہ میں انگریزی داں مصنفین اسی برہمنی کنور کو فرنگن بنا رہے ہیں۔ ایک اخبار میں میں نے ایک نیا محاورہ یعنی "نکتۂ نظر" پڑھا تھا۔ خدا خیر کرے مؤلفین و مصنفین قصص نے (جن کو ناول کہتے ہیں) تو غضب کیا ہے۔ اس بیچاری لاوارث برہمنی کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا ہے ایک یہی زبان ہے جو لسان عامّہ ہو سکتی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت بھی یہ نازنیں جادوگرنی یکساں شان و شوکت و قوّت و صولت تمام اقطاع برّ اعظم ہند پر حکمرانی کررہی ہے۔ میں جب لکھنؤ سے چلا تو جبلپور سے باشتیاق سیّاحی بلدۂ فرخندہ بنیاد تک بیل کی گاڑی پہ منزل بمنزل باوجود ناواقفیت راستہ سفر طے کیا۔ اس سات آٹھ ماہ کے سفر میں اکثر جنگل و میدان میں اور جھونپڑیوں کے دیہات میں اتفاق قیام و شب باشی ہوا۔ ہر کوردہ میں بھی گو میں اُن کی بولی نہ سمجھتا تھا مگر وہ لوگ میری بات سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ جب میں جزیرۂ سیلان گیا تھا وہاں بھی یہی اتفاق ہوا۔ ہماری دُور اندیش گورنمنٹ نے بہ مصلحت خاص ہندی و اُردو دونوں بہنوں میں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ماں بیٹی میں خانہ جنگی کرا دی مگر یہ رشتہ ایسا نہ تھا کہ رقیبوں کی سازش سے خلل پزیر ہو جاتا یہ بیسوا اپنا لباس بدل کے اور قومی ساڑھی باندھ کر اپنی بہن کے گلے مل گئی یعنی ناگری حروف میں جلوہ گر ہو کر اپنی لغت و محاورات و ترکیب صرف و نحو برقرار رکھکر جان جاناں و دلربائے عالم و عالمیان بن گئی اور مکڈونل صاحب سے آنکھ لڑا کر کہہ رہی ہے ؎

مری زندگی تھی ابھی او ستمگر	مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرا یا تو نے تو تھا یہ سمجھکر	نکل جائے جاں جو کہ سدِّ رہ ہے

یہاں پر لفظ ہندی کی بابت عجیب خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہند و ہندی۔ ہندوستان یہ کس زبان کے لغت ہیں اور کیوں یہ برّاعظم جو ہمالیہ اور اوقیانوس سرحد مغربی اور کوہستان نامعلوم الحالات مشرقی و برہما سے گھرا ہوا ہے ہند کے نام سے موسوم ہوا اور کس وقت اور کس وجہ سے اس برّاعظم کے باشندوں نے اس نام کو قبول کیا۔ میرا گمان ہے کہ اگر اہل یورپ کے اثر سے محفوظ ہیں تو چینی و تبتی وغیرہ ماوراالہند کی زبانوں میں اس برّاعظم کا نام کچھ اور ہوگا گزشتہ زمانہ میں خان کیانی و ساسانی وغیرہ شاہان ایران کے وقت میں یہ خطاب ہند اس برّاعظم کو دیا گیا یعنی شمالی حصہ رفتہ رفتہ بوجہ آمد و رفت سیّاحان و سوداگران یہ خطاب سرحد مغرب پنجاب سے لے کر سرحد مشرق بنگالہ تک حاوی ہو گیا۔ موّرخین عرب تو اس شمالی حصۂ برّاعظم کو بخطاب ہند و سندھ سے یاد کرتے ہیں اور جنوبی حصہ برّاعظم کے واسطے کوئی خاص نام حاوی نہ تھا بلکہ جس جنوبی قطعہ میں آمد و رفت سیاحان و سوداگران ہوئی خاص نام مثل ملیبار وغیرہ دیا گیا اور یہ قطعہ ممالک ہند کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک ملک بنفسہٖ علیحدہ سمجھا جاتا تھا۔ حتّٰی کہ یہ تفریق موّرخین اسلام نے تا زمانہ برباد ی سلطنت قائم رکھی۔ چنانچہ الفاظ سندھ و ہند و دکن ان موّرخین کی تصانیف میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ اس برّاعظم کے مختلف اقوام و باشندگان کی زبانوں میں کوئی خاص نام اس برّاعظم پر حاوی نہیں پایا جاتا۔ میرے نزدیک یہ غلطی حضرات یورپ سے ہوئی جب وہ جنوبی قطعات میں اس برّاعظم کے آئے یہ سمجھے کہ ہم ہند میں آ گئے اور موّرخین و سیّاحان عرب سے وام لے کر کل برّاعظم کو انڈیا کا خطاب دیدیا اور ان مختلف اقوام کو جو برّاعظم کے شمال و جنوب میں بستے ہیں ایک قوم و ملّت سمجھ کر ایک عام نام انڈین دیدیا اور یہی نام تمام عالم میں اپنے اپنے لہجے کے مطابق مشہور ہو گیا اس مختلف الاقوام و الملل و الالسنہ برّاعظم میں

مہذب ترین قوم اہل وید و پران و شاستر ہیں اس قوم کے اہل سیف نے مختلف قطعات بر اعظم
میں راج و بادشاہتیں قائم کیں اور اہل قلم نے علوم و فنون میں وہ ترقی حاصل کی کہ نہ فقط
اس بر اعظم کے مختلف اقوام کو اپنی تہذیب و شائستگی سے مشرف و ممتاز کیا بلکہ ماوراء الہند
یعنی شمالاً چین و تبت کے ممالک و شہر کے باشندوں پر اور شرقاً برہما و سیام وغیرہ تا حد
بحر اعظم کے مختلف اقوام پر اور جنوباً جزائر او قیانوس کے باشندوں پر ایسا اثر ڈالا کہ چندیں
ہزار سال کے بعد بھی اس وقت تک اثر قائم ہے۔ اسی طرح اس قوم کے اہل حرفت و صنعت نے
ان تمام اقوام کو اپنا شاگرد بنایا بلکہ میرا گمان ہے کہ مغرب میں بھی اکثر اقوام نے اہل وید
کی تعجب خیز شائستگی و ترقی و علوم و فنون سے فیض حاصل کیا۔ خلاصہ ایں کہ اس بر اعظم کی
دیگر اقوام نے باوجود اختلاف قومیت و زبان و ملت وید کو اپنی معاشرت کے مطابق ترمیم و
تبدیل کر کے قبول کر لیا پس کل باشندگانِ بر اعظم بوجہ ہم ملت ہونے کے متحد اور بوجہ اختلاف
السنہ و قومیت نہایت مختلف ہیں جس طرح اہل یورپ بلحاظ قوم و السنہ جدا اور باعتبار مذہب
باہم متحد ہیں۔ پس اہل وید کو اہل ایران نے بخطاب ہندو اور اُن کے ملک کو یہ لقب
ہندوستان مشہور کیا۔ تمام بر اعظم بنام ہندوستان و تمام باشندگان بر اعظم بنام ہندو مشہور
ہو گئے۔ شاید اہل یورپ نے اپنی حماقت سے از زبان اسکندر یونانی۔ لیکن یہ صحیح معلوم
نہیں۔ اس خطاب و لقب کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا۔ چنانچہ فی الحال گو اس بر اعظم میں ہر قوم
کی زبان و مراسم معاشرتی جدا جدا ہیں لیکن کل اقوام مذہبی و مقامی و معاشرتی اختلافات
کے ساتھ مخاطب بخطاب ہندو ہیں حتیٰ کہ مسلمانانِ ہند کو عرب و عجم ہندی پکارتے ہیں۔ اس
واسطے کہ بیشتر حصہ اس گروہ کا ہندو سے مسلمان ہوا ہے یعنی ایک گروہ اس بر اعظم کا تعدد پرستی
سے وحدت پرست ہوا ہے گویا بحکم کتب سماوی اہل ہند یہ گروہ اصطلاحاً سینیاسی ہے اور ایسے

ایک اکیلے معبود کی پرستش کرتا ہی جس کا وجود وہم اور عقل سے خارج و بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہی کہ تعدد پرست عرب نے وحدت پرست عرب پر تعجب کیا تھا کہ درحالیکہ ہمارے تین سو ساٹھ معبود بھی باہم مل کر انتظام اس عالم کون و فساد کا باطمینان نہیں کر سکتے، وحدت پرست کا ایک اکیلا خدا جس کا نہ کہیں نشان نہ پتہ کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہی۔ کاش مثل عیسوی معبود کرسٹو جی مہاراج اگر کبھی بھی ہم سے دوچار ہو جاتا تو بھی ہمارے ادراک کی حد قائم ہو جاتی مگر مشکل تو یہ ہی کہ وحدت پرست پکار رہا ہی کہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یعنی

بنامِ آنکہ او نامے ندارد
بہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

الغرض محض اتنے فرق کے باعث مسلمان ہندوؤں کو قومیت سے باہر اور ہندو و مسلمان کو غیر قوم قرار دیں تو نہ فقط اصولاً و فطرتاً غلط بلکہ قوم و قومیت کا خون کر دینا ہی بلکہ اس وقت یعنی اس چودہویں صدی ہجری میں خود اُن گروہوں میں جو بخطاب ہندو مخاطب ہیں تفرقۂ عظیم برہمن و غیر برہمن کا شروع ہو گیا ہے

برایں عقل و دانش بباید گریست

اس نئی روشنی نے جو بدولت حضرت مغرب یعنی اہل بیت النصاریٰ فی الحال اس برّ اعظم میں درخشاں و تاباں ہو رہی ہی۔ ابوالفضل و فیضی و بابا نانک و بابا کبیر وغیرہم محبّان وطن کی امیدوں کا خون کر ڈالا یعنی بجائے اتحاد و اخوت باہمی تفرقہ اور رقابت قائم کر دی اور یورپین "ینشنا لزم" کی نیم صدی کی پیڑی جمائی ہوئی اب بلند و بالاتر ہو کر ایسے برگ و بار لائی ہی کہ اس جنبش یعنی الھضم نے ہر شہر و بلد بلکہ ہر قصبہ و قریہ حتیٰ کہ ہر کوچہ و برزن میں مرضِ دردِ شکم پیدا کر دیا اور نہ صرف ہر فرقہ جو بہ لفظ ہندو مخاطب ہی اس

وبا میں مبتلا ہو اور اس نے اپنے مکاتب و مدارس اور مجالس تمدنی یعنی کانفرنسیں قائم کی ہیں بلکہ اہل اسلام بھی پرانے جھگڑے علیؓ و عمرؓ کو اور تازہ کر رہے ہیں اور بڑے دائرہ عصبیت قومی کو توڑ کر چھوٹے چھوٹے دائرے تعصب قبائل قائم کر رہے ہیں اور "نیشنلزم" اب تعصبات مذہب و ملت میں دخیل ہو گئی اور برہمن و غیر برہمن اور سنی و شیعہ ایک دوسرے کے مقابل میں پینترے بدل رہے ہیں اور مہاتما جی و علیین پکار رہے ہیں ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بعض بہ تعصب مذہبی اور اکثر بطمع حکومت گدوں کی طرح دنیا کے مردے پر چونچیں مار رہے ہیں۔ رؤسا و والیان ملک لارڈ ڈلہوزی کی دھمکی یاد کر کے بخوف "ایرویلین" اپنی جیجان یعنی "سوزرین" دولت عظمیٰ یعنی امپریل گورنمنٹ کے تیوروں کو تک رہے ہیں۔ خوش باش خطابات و امتیاز خاص کے متمنی شیرینی فروش حکام وقت ۔کی دوکان کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ وکالت پیشہ گدھوں کی طرح عدالت کے مزبلے پر ڈھینچوں ڈھینچوں پکار رہے ہیں۔ ملازمت پیشہ یا مجبوراً منافق ہیں یا غریب و ناخواندہ رعیت کو امن و امان قائم رکھنے کے بہانہ سے دھڑلے سے لوٹ رہے ہیں دولت عظمیٰ مثل گروہ نابینان حیران و پریشان لکڑی سے ٹٹول ٹٹول کر قدم بقدم پکار رہی ہے کہ اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا۔ گوشہ نشین لوگ وہاں برجستہ کہہ رہے ہیں ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

استغفر اللہ ؎

کجا بودم اکنوں فتادم کجا
عنانِ سخن شد ز دستم کجا

آمدم برسرِ مطلب یعنی اگر اس برّاعظم کے باشندگان اپنی بود و نیست بمقابلہ اغیار قائم رکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس برّاعظم کو ایسا ایک نام دیں جو شمالاً و جنوباً و غرباً و شرقاً عام قطعات پر حاوی ہو اور اسی نام کی مناسبت کے ساتھ ایک ایسا نام اپنے واسطے اختیار کریں جو باوجود اختلاف مذہب وملت و ذات و صفات اخوت واتحاد قومی قائم کر دے اور اختلاف ذات وصفات جو از آدم تا ایندم اس برّاعظم میں قائم ہیں ان سے بحث نہ کر کے ایک عام لباس و دستار اور نیز ایک عام لسان و گفتار اختیار کریں جو ان تمام دوائر ذوات و صفات پر حاوی ہو کر ایک عام دائرۂ قومیت میں کل باشندگان برّاعظم پر حاوی ہو جائے۔ محبانِ قوم و وطن تعصباتِ ذاتی کو چھوڑ کر سب سے پہلے ان مسائل کو طے کریں یعنی پہلے اپنے تئیں ایک قوم اسماً وصفاتاً بنا لیویں اس کے بعد دیگر اقوام عالم کے دست برد سے بچنے اور غلامی سے آزاد ہونے کی کوشش کریں۔ اس وقت یعنی ۱۳۴۰ھ ہجری مقدسہ وسمت ۱۹ بکرماجیت و ۱۹۲۱ء کرستوی ہے اس برّاعظم میں اہل بیت النصاریٰ کی تقلید میں ایسا خوف ناک اور تباہ کنندۂ عالم و عالمیان خیال قائم ہوا ہے جس کو اصطلاحاً "نیشنالزم" کہتے ہیں اسی ہی تقلید نے مختلف قبائل بلکہ افراد میں بھی ایسا اختلاف اور اس قدر تعصب قائم کیا ہے کہ مطلقاً اخوت قومی کی امید باقی نہیں رہی اس مہلک مرض نیشنالزم کا علاج فوراً ہو جانا چاہیئے ورنہ ناممکن ہے کہ اہل بنگالہ اہل پنجاب یا راجپوت مرہٹوں سے مراسمِ اخوت و یگانگی برتیں پس ہادیانِ مختلف فرق و ذات کو امورِ ذیل پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی:

ا۔ اختلاف مذہب امور تمدن وسیاست میں کوئی جزو اعظم قرار نہیں دیا گیا۔

قدیم زمانہ میں ہر قوم و امت اپنے اپنے مذاہب و مراسم پر قائم رہ کر ہمسائگان کے معبودوں کو اپنے دیوتاؤں کی فہرست میں بے تکلف داخل کیا کرتی تھی اور باہمی جدال و قتال صرف زن زمین و زر کی بابت ہوا کرتا تھا چنانچہ بقول قدیم "عیسیٰ بدین خود و موسیٰ بدین خود" مذہب کو جزو سیاست قرار دینا صرف ممالک اسلام کی تاریخ اور بالخصوص عہد سلاطین مغلیہ گورگانی شاہد و عادل ہے البتہ بقول "برعکس نہند نام زنگی کافور" کرسٹوجی مہاراج پرنس آف پیس کے نام نامی و اسم گرامی پر اقوام بیت النصاریٰ میں ہمیشہ مذہبی خون خرابیاں ہوتی رہیں اور امور تمدن وسیاست میں بھی بُرا اثر زمانۂ حال تک پڑتا رہا گو فی الحال اس صدی کرسٹوی میں آزادانہ تعلیم عام کے باعث یہ اثر کم ہوتا گیا پس ترقی ملک و تہذیب قوم میں مذہبی مباحث کو دخل نہ دینے دیں۔

۲۔ کل انگریزی تصانیف اس بر اعظم و اہل بر اعظم کی بابت از ابتدا تا حال جو تصنیف کی گئی ہیں مطلقاً قابل اعتبار و اعتماد نہیں ہیں اور خاص اصول پر دانستہ تصنیف کی گئی ہیں۔

(الف) سرکاری مدارس اس بنا پر قائم کئے گئے تھے کہ یورپین کارکنان کہ گران قیمت تھے اُن کے بجائے دیسی کارکنان ارزان قیمت مختلف دفاتر انتظام ملکی میں بہمدست کئے جائیں۔

(ب) سوداگری فرقہ میں بھی سستے کارکنوں کی ضرورت داعی تھی وہ بھی ان مدارس کے حامی تھے۔

(ج) مذہبی فرقہ نے اپنے زعم میں اہل بر اعظم کو اُمّی قرار دے کر آزادانہ تعلیم اس

خیال سے شروع کی تھی کہ طلبا کے ذہن میں اُن کے رواسم و مذاہب کی نفرت اور آبا و اجداد اور اکابرانِ سلف کی حقارت ایسی جم جائے کہ غول کے غول عیسائی ہوجائیں چنانچہ کیسری اور مارشمن و الفنسٹن وغیرہم کی تصانیف اس ہی غرض سے بجد و کد مرتب کی گئی تھیں اور مابعد کے مصنفین نے بھی یہی طریقہ اس وقت تک اختیار کر رکھا ہے۔ ان اصول کو سرکاری اہلکاروں نے بھی اختیار کر رکھا ہے ہر اعلیٰ عہدہ دار از کلکٹر تا ویسرائے اہل برّ اعظم کو از راجہ تا پرجہ امّیِ محض سمجھکر لمبے خطبے یعنی اسپیچیں اصلاح اخلاق و رواسم قدیمہ پر اس طرح دیا کرتے ہیں جیسے ایک اسکول ماسٹر اپنے طلبا کو لکچر دیا کرتا ہے گویا یہ برّ اعظم ایک مدرسہ ہے اور اہل حل و عقد معلّم و استاد ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اچھے تم برُے اور ہم فاضل اور تم مبتدی اور ہم منجانب کرشٹو جی مہاراج دیوتا واحد کی طرف سے تمہاری تعلیم و تربیت کے لئے بھیجے گئے ہیں پس شوخیاں مت کرو بھلے مانسوں کی طرح سبق پڑھتے رہو۔ ورنہ جمال شاہی کوڑا موجود ہے مگر گردشِ فلک و تقاضائے وقت نے ان اصول کا نتیجہ برخلاف پیدا کیا اور شاگردوں نے دعویٰ اوستادی کا شروع کر دیا لہذا ہا دیانِ قوم اب اس دعوی کو اپنے قدیم مراسم و معاشرت کی بنا پر نہ فقط قائم رکھیں بلکہ روز افزوں ترقی دیں نہ ایں کہ پابند تقلید اغیار رہ کر سرمایۂ قدیم کھو بیٹھیں۔

۳۔ مسلمان بوجہ اتحاد قبلہ و کلمہ ہر جاکہ باشند عرب و عجم ایک قوم سمجھے جاتے ہیں لفظ مسلم ہندی و ایرانی و ترک و تاجیک سب پر حاوی ہے گو فروع میں اختلاف کے باعث دو بڑے فرقے ان میں بھی ہوگئے اور نا واقفوں کی کج بحثی کی وجہ سے باہم رقیب بھی بن گئے ہیں بازہم بحمدہٖ تعالیٰ اسلام نے از ابتدا "بیشا نالزم" کو مثل لفظ غلط صفحۂ عالم سے محو کر دیا ہے اور اب بھی اُن کی لغت میں مفقود ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہنود بھائی

انگریزی مدارس میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر پردیسی علوم و قواعد و قوانین و فلسفہ و حکمت و رسم و معاشرت کی تقلید میں مبتلا ہوگئے اور علاوہ گزشتہ و قدیم الایام متفرق قبائل و گروہ اور ذاتوں کے جدید تفرقہ انداز مذہبی اور غیر مذہبی گروہ قائم کر لیئے۔ اگر مذہبی جوش قابل معافی سمجھا جائے تو غیر مذہبی جوش کا کیوں اس برّاعظم کے مختلف الملت والقبائل باشندوں کو زہرِ قاتل افتراق کا دیا جائے۔ مختلف مذہبی سماج جدید آپس میں یا قدیم الایام مذہب میں باہم تعصب کریں تو یہ کوئی جدید امر نہیں ہے۔ مگر یہ نئی اصطلاحیں "اکسٹرمیسٹ" اور "ماڈریٹس" اور "برہمن" اور "نان برہمن" نے ملک اور اہل ملک کا کام تمام کر دیا اور پردیسی مرض "نیشنالزم" کا زہر تمام برّاعظم میں پھیل گیا۔ انگریزی اوستادوں کمشنر ڈپٹی کمشنر گورنر وائسرائے بلکہ گاہے فوجی افسر جن کو ان امور سے کوئی تعلق نہیں اور اُن کی عورتیں یہ سب اپنے آپ کو قابل تر ہم سے سمجھتے ہیں۔ ان کے لکچروں نے کچھ ایسا اثر اس برّاعظم کے باشندوں پر کیا ہے کہ ہر ملّت اور قبیلہ شاگرد رشیدانِ اوستادوں اور اوستانیوں کا بن گیا ہے اور اپنی عقلوں کو تابع عقول اساتذہ کر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ سُنّی کے قدیم جھگڑے مسلمانوں میں جاگ اُٹھے ہندوؤں کے ہر ذات و قبیلہ و گروہ نے فرداً فرداً اور مجموعاً جدا جدا کانفرنس و مجالس قائم کر کے ایک تفرقہ عظیم پیدا کر لیا اور ایک بکار آمد لفظ یعنی لفظ قوم کو غلط معنوں میں استعمال کر کے ہر گروہ اپنے میں ایک جُدا قوم قرار دے کر مرض نیشنالزم میں گرفتار ہوگئی اور علاوہ اہل زنّار برہمن و راجپوت اور ویش کے اب نازنّار گروہوں میں بھی جوش "نیشنالزم" شروع ہوگیا اور اہلِ زنّار سے برسرِ حساب آگئے۔

چار ذاتیں جو اس برّاعظم میں زمانۂ قدیم سے قائم ہیں دوسرے ممالک میں بھی

موجود ہیں مگر اُن میں چھوت اور چھات کے تعصبات نہیں ہیں مثلاً۔ ولایت کاشغر کے باشندے مثل اہل زنار این دیار تومان، قوچین و ایماق و ارباب مناصب چار قسموں پر منقسم اپنے اپنے کار متعلقہ سوداگری و پیشہ وری و اکتساب علوم وغیرہ میں مصروف و مشغول ہیں مگر معاشرت باہمی میں بدستور ایک ملت ہیں۔ تومان اور قوچین باہم مل کر رہتے ہیں اور نکاح بیاہ کرتے ہیں اور متحد المراسم واللسان واللباس ہیں۔ ہمارے بادیوں کو نہ فقط ان قدیم مشکلات کو حل کرنا چاہیئے اور چھوت و اچھوت اور تفرقۂ لسان و لباس و مراسم کو مٹانا چاہیئے بلکہ جدید تفرقہ انداز امور جو ہمارے حکام نے اس بر اعظم میں جاری کئے ہیں اُن کو ترک کرنا چاہیئے۔

۴ - کل بر اعظم میں تعلیم و تربیت اپنی قدیم معاشرت کو پیش نظر رکھکر اتحادی اصول پر قائم کی جائے اور الفاظ ہندو یونیورسٹی و مسلم یونیورسٹی و شیعہ یونیورسٹی و کائستھ کالج و سکھ کالج و راجپوت سبھا وغیرہ فوراً ترک کرائے جائیں اور مذہبی تعلیم کے اصول علیحدہ قائم کئے جائیں تاکہ اعتباری تفرقہ برادری سے محفوظ رہیں۔ یہ امر یاد رہے کہ اس بر اعظم کے کل باشندے چہ اہل اسلام و چہ اہلِ زنار و دیگر مذاہب متفرقہ پارسی و یہودی و عیسائی کلہم اجمعین بلفظ تحقیر ہندی و انڈین سے تمام عالم میں مخاطب و موسوم کئے جاتے ہیں اور مثل قدیم اقوام امریقہ و مختلف جزائر اوقیانوس امی محض اور ناقابل صحبت اہل تہذیب سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ادنیٰ سوداگر ممالک بیت النصاریٰ ہمارے رؤسائے عظام سے بدعوی برتری رفتار رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری سرکار دولت مدار انگلشیہ اب تک ہر دل عزیز نہیں بنی اگر فرقۂ حکام بوجہ استحکام وقار حکومت رعایا سے تحکما نہ رفتار رکھیں تو اہل این دیار اس کو برداشت کر سکتے ہیں مگر ادنیٰ ادنیٰ اہلِ حرفت و پیشہ جب شرفا اور

نجبا و روسا ملک سے مثل فرقہ حکام ھٰذا قومٌ جاھلون سمجھکر بدعویٰ برتری ہم سے اکڑکر ملیں اور دیگرا قوام بیت النصاری مثل اہل امریقہ وارض الجنوب یعنی اسطریلیا و جدید آبادی ہائے افریقہ جنوبی و جزائرا وقیانوس ہمارے ملک کے عوام مزدوری پیشہ کو بے بنیاد طمع اور لالچ دلاکر جہاز کے جہاز بھرکر اپنی خدمت گزاری کے واسطے لے جائیں یہ ہرگز گوارا نہیں ہوسکتا اگرچہ حکام فرق مراتب نہیں کرتے اور اہل غرض و بے غرض اور ذی وقعت اور کم وقعت لوگوں سے ملاقات میں فرق نہیں کرتے اور جس طرح ۱۸۵۷ء کرسٹوی سے پہلے حکام وقت فرق مراتب کا لحاظ رکھتے تھے بلکہ اہل وقعت کے ہاں آتے جاتے اور بے تکلف ملا کرتے تھے۔اس زمانے میں وہ ملاپ جلاپ باقی نہیں رہا۔مگر یہ وجوہ ایسے بددلی کے نہ تھے کہ خواص و عوام میں بیزاری اور مخالفت پھیلاتے اور نہ حکام کا یہ قیاس صحیح ہے کہ ہماری آزادانہ تعلیم سے ہماری رعیت ہم سے مخالف ہوئی۔علاوہ اس کے اس میں بھی شک نہیں کہ بعض بدمزاج اور متکبر عہدہ دار اپنے غرور اور نخوت سے اپنے سرکار کو نقصان عظیم پہنچاتے رہتے ہیں۔

۵ ـ والیانِ ریاست وراجگان و نوابانِ ملک کی تالیف بجد وکد کی جائے تاکہ وہ بھی قومی رفتار گفتار و ستار میں شریک ہوجائیں اور بالخصوص اُن کی اولاد کو قومی مدارس میں تعلیم پانے کی کوشش بلیغ کی جائے۔سرکار انگلشیہ عظمت مدار سے یہ بھی ایک بڑی غلطی ہوئی ہے کہ والیانِ ریاست کو فرق مراتب سے محروم رکھا یعنی چند لاکھ و چند کروڑ بلکہ شاید چند ہزار کی آمدنی کے رؤسا لفظ ہزہائنس سے مخاطب

کئے جاتے ہیں اور جن آداب کی شاہانِ دہلی نے کبھی ان رؤسا کو تکلیف نہیں دی۔ اب ادنیٰ فوجی و ملکی عہدہ دار بحیثیت ریزیڈنٹ و ایجنٹ اُن سے طلب کر رہا ہے اور صدر صوبہ دار ہند یعنی والیسرائے تو اپنے استقبال و مہمان داری کے قواعد و ضوابط پہلے ہی سے مشتہر کر دیتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بظاہر یہ رؤسا گردنِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں مگر عدم فرق مراتب سے کشیدہ خاطر ضرور ہیں۔ لہٰذا ہادیانِ قوم کو ضرور ہے کہ اپنے قول و فعل میں فرق مراتب کا لحاظ ضرور رکھیں۔ مثلاً کیا وجہ ہے کہ والیانِ بڑودہ و اندور و والیانِ تاج و تخت دولتِ آصفیہ و مہاراج دہراج بھی ہز مجسٹی کے الفاظ سے نہ مخاطب کئے جائیں۔

۶ - بقولِ قدیم۔ عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ جو فوائد ہم کو حکومتِ انگلشیہ عظمت مدار کے عہد میں ملے ہیں اور جس آرام سے اس برّاعظم کی رعایا از کشمیر تا راس کماری اپنی زندگی بسر کر رہی ہے اور جو ترقی علوم کی اس حکومت میں ہم کو میسر ہوئی ہے اعتراف اس کا فرض ہے اور اگر علوم کی ترقی کے ساتھ ہنروں کی بھی ترقی کی جائے تو آج یہ برّاعظم یورپ و امریقہ کا ہمسر و ہم رتبہ ہو جاتا۔ بازہم یہ امر مسلّمہ ہے کہ سلطنتِ مغلیہ گورگانی کے ضعف کے بعد اگر حکومت انگلشیہ قائم نہ ہوتی تو اس برّاعظم کی تباہی میں کوئی شک نہ تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی اور باہمی جدال و قتال کے باعث علم و ہنر کا قلع و قمع ہو چکا تھا۔ معاشرتی تہذیب مفقود ہو گئی تھی اور علمائے یورپ کے قول " سروائی ویل آف دی فٹسٹ "

servival of the fittest کی تباہ کُن تصدیق اس برّاعظم میں قائم ہو چکی تھی اور جو اتحاد و اخوّت قومی ابوالفضل و فیضی و تو ڈرمل و بیربل نے قائم کی تھی گم ہو گئی تھی۔ پس ہادیانِ قوم کو چاہیئے کہ اس شکریہ کو پیشِ نظر رکھکر قوم کو راہِ راست کی تعلیم کریں۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔ ؎

منت آنچہ حق بود گفتم تمام
تو دانی دگر بعد ازیں والسّلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کارنامۂ سروری

کون سنتا ہی کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ولادت | صبح کا وقت روز سہ شنبہ ماہ ذیحجہ سنہ ۱۲۶۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۴۸ء میری پیدائش کی تاریخ ہی۔ میرے والدین مرحومین میری پھوپی کے ساتھ فراش خانہ کے محلہ میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے میرا نام آغا مرزا رکھا۔ یہ مکان جس میں میں پیدا ہوا دو منزلہ تھا۔ نیچے دالان در دالان کے دائیں بائیں کوٹھریاں۔ صحن جانب مقابل باورچی خانہ وغیرہ۔ بائیں طرف ڈیوڑھی اور سامنے اُس کے مختصر صحنچیاں تھیں۔ اوپر کی منزل پر مختصر صحن، ایک دالان جانبین کوٹھریاں تھیں۔ اس مکان کی تفصیل اس واسطے لکھتا ہوں کہ میری ولادت سے متعلق ایک عجیب حکایت میں نے

والدہ مرحومہ سے سُنی ہے۔ والدہ مغفورہ[1] میری نہایت عابدہ زاہدہ اور ضروری مسائل دین سے واقف تھیں اور قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پڑھی ہوئی تھیں۔ اُستاد اُن کے سید حسن بہنوئی سر سیّد احمد خاں مرحوم کے تھے۔ ان صاحب نے اپنے رشتے کی کل مستورات کو قرآن مجید اور مسائل دین پڑھائے تھے۔ جناب شاہ صاحب کے اصل مسودہ ترجمہ قرآن مجید کی نقل والدہ مرحومہ کے پاس تھی اور اسی مسودہ میں والدہ ماجدہ نے مجھ کو بھی قرآن مجید پڑھایا تھا۔ یہ قرآن مجید شاداب ساجد بیگ مرحوم کے پاس تھا اور خدا کرے انہوں نے اُس کو حفاظت سے رکھا ہو۔

ایک جنّی بزرگ

الغرض والدہ ماجدہ نے جو حکایت بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ اس مکان کی اوپر کی منزل کی ایک کوٹھری میں کوئی جنّی بزرگ باخدا عبادت گزار رہتے تھے۔ میری پھوپی مرحومہ اُن کو بھائی پکارا کرتی تھیں۔ کوٹھے پر ہر شخص کو نہ جانے دیتی تھیں اور نہایت پاک و صاف رکھتی تھیں۔ وہ بزرگ بھی اکثر بوقت ضرورت ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ والدہ ماجدہ نے ایک نقل بیان فرمائی کہ ایک شب کو پھوپی نماز عشا کے واسطے کھڑی ہوئیں۔ اتنے میں گنڈیریوں والے[2] نے آواز دی۔ پھوپی صاحبہ نے کہا کہ افسوس ہے اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں ورنہ میں گنڈیریاں لیتی۔ اُسی وقت اُن کے پاؤں کے پاس کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ چراغ منگا کر

---

[1] نواب علویہ منور زمانی بیگم بنت نور قریشیہ سلطان بیگم (زوجۂ نواب خلیل اللہ خاں) بنت نواب شاہزادہ بیگم زوجۂ شاہزادہ مرزا بختاور نبیرہ شاہ عالم گیر ثانی ابن شاہ عالم ثانی ابن شاہ عالمگیر ثانی تا حضرت صاحب قرانی امیر تیمور گورگان ۱۲

[2] یہ عام عادت اہل دہلی کی تھی کہ امرا و خوش باش گرمیوں میں سموسہ اور قیمہ بھری ٹکیاں ناشتہ کرتے تھے۔ سموسہ والیاں صبح کے تڑکے ہر گھر میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔ دوپہر سہ پہر کو برف میں جمی ہوئی ملائی کی قلفیاں اور ہر قسم کے تر میوہ جات اور رات کو گنڈیری والے گلی کوچوں میں آواز دیتے پھرتے تھے اور سوتے وقت آبخورے گرم گرم دودھ کے پیا کرتے تھے۔ عوام لوگ صبح کو چنے پرل گرما گرم ضرور کھاتے تھے۔ جاڑوں میں نہاری کلّے پائے تنوری پراٹھے عوام کا اور شیرمال و باقرخانی امرا و خوش حال لوگوں کا ناشتہ تھا۔ چائے قہوہ کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا ۱۲

جو دیکھا تو ایک روپیہ کلبہ کا پڑا ہوا تھا وہ اُنھوں نے اُٹھا لیا اور کہا کہ بھائی یہ روپیہ کلبہ کا ہے تبرکاً رکھوں گی۔ والد ماجد میرے نہایت ذی علم تھے۔ فارسی، عربی کے علاوہ رڑکی سے علوم ریاضیات میں سند بھی حاصل کی تھی وہ ان بزرگ کے وجود سے منکر تھے لیکن آخر کار انھیں بھی قائل ہونا پڑا۔

القصہ جب میری ولادت قریب ہوئی پھوپی[1] صاحبہ نے مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بلا بھیجا اور کہا کہ آپ کوٹھے پر جائیے فلاں کوٹھری میں ایک بزرگ رہتے ہیں مجھکو بہن کہتے ہیں۔ میرا سلام ان کو کہئے اور کہئے کہ میرے ہاں زچگی خانہ ہونے والا ہے ممکن نہیں کہ کسی قسم کی طہارت کا انتظام ہو سکے۔ پس اگر آپ کو ناگوار خاطر ہو تو میں دوسرے مکان میں اُٹھ جاؤں ورنہ اس ہی مکان میں سامان زچگی کا کروں۔ چنانچہ شاہ صاحب کوٹھے پر گئے اور پیام پھوپی صاحبہ کا پہونچایا۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہرگز دوسرے مکان میں نہ جائیں، میں خود اس مولود کی حفاظت کروں گا۔ صرف اس قدر احتیاط کریں کہ کوئی عورت مرد یا بچہ کوٹھے پر نہ آنے پائے۔ الغرض والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ جب میں پیدا ہوا تو جب کبھی رات کو میں پاؤں مار کر کپڑا اُتار ڈالا کرتا تھا تو وہ بزرگ فوراً اوڑھا دیا کرتے تھے یا کبھی انّا خواب غفلت میں مبتلا رہتی اور میں دودھ کے واسطے روتا تو وہ انّا کو جگا دیتے۔ جب چلّے کا دن قریب آیا تو پھر پھوپی صاحبہ نے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کو طلب کر کے پیام بھیجا کہ اب میرے ہاں مہمانداری ہے اور کُل مستورات اُن کے بال بچے اور ماما، انّا وغیرہ ملازمین جمع ہونگے۔ اس وقت کوئی انتظام احتیاط کا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا میں دوسرے مکان میں مہمانداری کے واسطے اُٹھی جاتی ہوں۔ وہ بزرگ راضی نہ ہوئے اور کہا کہ ہم بھی اس خوشی میں شریک ہونگے۔

---

[1] امانی خانم۔ انھوں نے بڑی عمر پائی تھی اور ترکی بولتی تھیں ۱۲

چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ دن تقریب کا آیا اور مہمان جمع ہوئے۔ پھوپی صاحبہ خود کوٹھے پر گئیں اور پکار کر کہا کہ بھائی صاحب یہ مہمان میرے آپ کے وجود سے ناواقف ہیں مبادا آپ کی کسی حرکت سے ڈر جائیں تو میری مہمانداری ستیاناس ہو جائے گی۔ اُس حجرے میں سے جواب آیا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ تمھارے مہمان ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی خاطرداری میرے ذمہ ہے۔ دوسرے روز جب سب مہمان جمع ہوئے تو ان بزرگ نے نئی طرح سے اس خوشی میں شرکت کی یعنی بیبیوں کے زیور ولباس وغیرہ چرانے شروع کر دیئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کوئی بی بی کہتی تھی کہ میرا ہار کوئی چرا لے گیا۔ کسی کا صندوقچہ غائب ہو گیا۔ کوئی اپنا دوشالہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایک بی بی دوسری بی بی کے ملازمین پر چوری لگاتی تھی۔ پھوپی صاحبہ نہایت غضب اور غصے میں اوپر گئیں اور اُن بزرگ کو خوب بُرا بھلا کہا اور کہا وہ سب چیزیں فوراً واپس کیجئے ورنہ میری خوشی مبدّل برنج اور میری مہمانداری برباد ہوئی جاتی ہے۔ آواز آئی کہ آپ نیچے جایئے وہ سب چیزیں پہنچ جاتی ہیں۔ پھوپی صاحبہ نیچے اتر آئیں اُس وقت دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کل مہمان کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک چھت کی طرف سے چرچر کی آواز آئی۔ سبھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ کسی کا دوشالہ لٹکتا ہوا چلا آتا ہے کسی کی پازیب لٹکتی آرہی ہے۔ یہ تماشا دیکھکر سب بیبیاں چیخیں مار کر ادھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی کسی کو بخار آگیا، کوئی بیہوش ہو کر گر پڑی پھر اُفتاں و خیزاں کل مہمان بھاگ نکلے جلسہ اور دعوت سب درہم و برہم ہو گئی۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ ہم لوگ اس مکان سے اُٹھکر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ پھر صرف ایک دفعہ ان بزرگ سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ قلعہ میں کوئی شہزادی بیمار ہو گئی اور حالت جنون کی پہونچی۔ والدہ ماجدہ بھی مزاج پرسی کو وہاں گئیں تو اس شہزادی نے والدہ ماجدہ کو

دیکھکر کہا کہ " السّلام علیکم تم مجکو پہچانتی ہو " والدہ ماجدہ ڈر گئیں۔ اُس شہزادی نے کہا ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں کہ تمھارے بچّے کی نگرانی کرتا تھا اور میرے مکان میں وہ بچّہ پیدا ہوا تھا میں اس کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔ والدہ ماجدہ خوف زدہ اُسی وقت وہاں سے واپس چلی آئیں

بچپن کی شوخیاں میری طفلی میں پھوپھی صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ مجھکو ان کی صورت بھی یاد نہیں ہے۔ میں نے اپنے بڑے ابّا کے گھر میں ہوش سنبھالا۔ پھوپی مرحومہ کے انتقال کے بعد مرزا عاشور بیگ[1] میرے بڑے ابّا میری والدہ کو اپنے مکان میں لے آئے۔ اس مکان کا نقشہ بھی مجھکو یاد ہے۔ والدہ مرحومہ کبھی یہاں رہتی تھیں اور کبھی محلہ دہلی دروازہ میں رہتی تھیں بڑے ابّا مجھکو بہت چاہتے تھے ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ میری شوخیاں اُن کو بہت پسند تھیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ میری شوخی پر ہوں بھی کر سکے۔ ایک دن میں نے اُن کے سنجھلے بیٹے مرزا خدا داد بیگ کا سر پھوڑ ڈالا۔ اس پر میری بڑی امّا اور والدہ وغیرہ میری گوشمالی کے واسطے دوڑیں۔ مگر بڑے ابّا نے ان سب کو دھکا دیا اور خود آکر مجھکو گود میں لے گئے دسترخوان پر بارہا اتفاق ہوا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں اور میں کھیلتا ہوا آ پہونچا اور کہا بڑے ابّا ہاتھی۔ وہ فوراً جھک جاتے اور میں ان کی پشت پر بیٹھ جاتا۔ مجھکو اُنھوں نے بالکل جبار البتہ بنا دیا تھا۔ ایک دن والد مرحوم نے کوئی نقشہ دالان میں پھیلا دیا تھا اور اس میں رنگ بھر رہے تھے

---

[1] دہلی والے سب ہی بڑے چچا کو بڑے ابّا کہا کرتے ہیں۔ مرزا عاشور بیگ عین زمانہ غدر میں جب یہ مع اپنی عورتوں اور بچّوں کے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ گھر کے باہر نکلے ہی تھے کہ انگریزی فوج نے تمام مردوں کو جن میں نوجوان لڑکے بھی تھے عورتوں سے الگ کر کے گولی سے مار ڈالا معلوم نہیں کہ کہاں کس طرح یہ شہید دفن ہوئے ۱۲

کہ اتنے میں مَیں کودتا اُچھلتا پہونچا اور ایک ہاتھ ایسا مارا کہ سب رنگ نقشے پر گر گئے چند دن کی محنت برباد ہوگئی۔ والد ماجد نے ایک تھپّڑ مجکو مارا بس غضب ہوگیا۔ بڑے ابّا لکڑی لے کر اُٹھے سبھوں نے بیچ بچاؤ کر لیا۔ مگر ہفتہ دو ہفتہ والد ان کے سامنے نہیں گئے۔ بالآخر معافی مانگی اور صفائی ہوگئی۔ میں آج تک اُن مرحوم کے واسطے بعد نماز دعائے مغفرت مانگتا ہوں اور ایصال ثواب فاتحہ بعد نماز عشا ہر روز ادا کرتا ہوں۔

غدر ۱۸۵۷ء | ۱۸۵۷ء تک میں اس ہی مکان میں رہا۔ غدر کے زمانہ میں مجھکو ہوش اچھّی طرح ہوگئے تھے۔ بہت سی باتیں اب تک یاد ہیں۔ اُس زمانہ میں اگر کسی یورپین سپاہی کی صورت نظر آتی تھی تو بچّے تالیاں[۱] بجاتے اور لُو لُو کہہ کے کنکر مارتے تھے۔ جب باغی لوگ شہر میں آئے تو ہمارے مکانوں میں خوب پہرا چوکی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ جس روز کالے[۲] شہر میں گھُسے میں اس دن رحیم بخش خدمتگار کے ساتھ بلاقی بیگم کے کوچہ میں اپنی خالہ صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔ جب دریبہ[۳] میں پہونچا تو دیکھا کہ خلقت پریشان حال ہر طرف بھاگتی پھرتی ہے۔ رحیم بخش کہ قوی آدمی تھا مجکو جلدی سے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے بھاگا جس وقت ہم خالہ مرحومہ کے مکان پر پہونچے دروازہ پھاٹک کا بند ہو رہا تھا۔ رحیم بخش دھکّا اس زور سے دے کر گھُسا کہ ہم دونوں دروازہ کے اندر گر پڑے اور خوب چوٹ آئی۔ ایک دو روز کے بعد

۱؎ یورپ میں تالی بجانی اور ہُرّے کہنا بڑی عزّت اور تعظیم کی علامت ہے مگر اہل دہلی اور شاید دوسرے مقامات ہند میں تالیاں بجانی اور لُو لُو کہنا نہایت حقارت کی نشانی تھی لیکن ہمارے زمانہ میں اہل ہند بھی خوب تالیاں بجایا کرتے ہیں اور یہ ایک بڑی تعظیم کی علامت قرار پاگئی ہے۔ اسی طرح ننگے سر ہونا اہل ہند میں بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ اب ننگے سر رہنا اور آپس میں اسی طرح ملنا اور موٹر میں ننگے سر ہوا خوری کرنا علامت شائستگی سمجھی جاتی ہے ۱۲

۲؎ یہ عام لقب باغیوں کا تھا انگریزی فوج کو گورے خاکی اور تلنگی وغیرہ کہا کرتے تھے ۱۲

۳؎ نام [illegible] ۱۲

بے خوف دلوں سے جاتا رہا اور پھر اپنے مکان پر باطمینان واپس آئے۔

شہر میں باغی اور پہاڑی پر انگریز تخمیناً چھ ماہ تک لڑتے رہے[1]۔ گرمیوں کے دن تھے ہم ہر شب توپ کے گولوں کو چمکتے ہوئے دیکھتے تھے اور آتش بازی سمجھتے تھے۔ ایک دن ایک گولا کوٹھے پر چھت پھاڑ کر دالان میں اُس وقت گرا جب ہم سب کھانا کھا رہے تھے بڑے ابّا نے دوڑ کر بہت سا پانی اس پر اونڈیل دیا۔ میں ایک ولایتی مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ ولایتی ان لوگوں کو کہتے تھے جو سرحد افغانستان سے بشکل طالب علم یا میوہ فروش آیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب قوی ہیکل ریش دراز سر کے بال تا بہ شانہ بڑے وظیفی اور عبادت گزار تھے۔ ایک روز وہ والد مرحوم کے پاس آئے اور کہا کہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہم کو خداوند تعالیٰ نے اس زمانہ میں عطا فرمائی ہے۔ حیف ہے کہ ہم اس رحمت سے محروم رہیں۔ والد نے پوچھا کہ وہ کیا نعمت ہے۔ جواب دیا کہ جہاد اور شہادت۔ والد مرحوم نے بہت کچھ ان کو سمجھایا مگر ان کے سر پر شوقِ شہادت سوار ہو چکا تھا۔ پگڑی سر پر اور تلوار کمر میں باندھ کر بندوق ہاتھ میں لے کر طیار ہو گئے اور والد مرحوم سے کہا جو کچھ رقم میری تنخواہ کی آپ کی طرف ہو وہ امانتاً اپنے پاس رہنے دیجئے۔ اگر میں واپس آیا تو لے لوں گا ورنہ میری فاتحہ میں خرچ کر دیجئے۔ یہ کہکر وہ روانہ ہو گئے۔ عرصہ دراز تک غائب رہے۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ مولوی کو نعمت شہادت نصیب ہو گئی ان کی رقم سے پلاؤ وغیرہ پکوایا۔ جب سہ پہر کو والد فاتحہ دینے کے واسطے کھڑے ہوئے مولوی صاحب بھی آ پہونچے اور اپنی فاتحہ کا پلاؤ خوب کھایا اور پھر اُسی وقت جانے کو مستعد ہو گئے۔ والد نے اُن سے کہا کہ یہ فاتحہ حسبۃً للہ ہے

---

[1] یہ عجیب امر قابل تحریر ہے کہ چھ ماہ کی گولہ باری میں اہل دہلی کو کچھ بھی نقصان نہیں پہونچا۔ صرف ایک سقہ جو چاندنی چوک میں پانی سے بھری پکھال بیل پر لئے جا رہا تھا وہ اور اُس کا بیل اُڑ گیا ۱۲

آپ اپنی تنخواہ لیتے جائیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اول تو میں اس رقم کا مستحق نہیں ہوں اور اگر آپ دیتے ہیں تو اپنے پاس رہنے دیجئے۔ شاید میری فاتحہ کے کام آئے۔ والد نے فرمایا کہ آپ زندہ ہو کر اپنی فاتحہ آپ کھایا کرتے ہیں۔ یہ دل لگی اچھی نہیں ہے۔ آپ یہ رقم لیتے جائیے مگر مولوی صاحب نے نہ لی اور چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے والد نے چند روز کے بعد اُن کی فاتحہ کر دی۔

اس جنگ ششماہہ میں کالے خاں گولنداز نے بڑا نام پیدا کیا اور خوب تاک تاک کر پہاڑی پر گولے برسائے۔ پوربیوں[1] کا یہ حال تھا کہ ہر نفر اپنے تئیں خود مختار بلکہ بادشاہ سمجھتا تھا حتّٰی کہ ابوظفر محمد بہادر شاہ سے بھی گستاخیاں کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ ”بادسا بادسا کھوں کا جس کے مونڈ پر ہم منڈا رکھدیں تون ہو بادسا ہوئے“

مرزا عاشور بیگ کی معرکہ آرائی

مجھکو خوب یاد ہے کہ بڑے ابّا مرحوم ایک روز دستار و کمر بستہ بادشاہ کے پاس گئے اور ان سے کچھ فوج طلب کی تاکہ انگریزوں سے لڑیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ”ابّا میرے پاس فوج کہاں ہے جو میں کسی کو دوں۔ اسّی برس کی میری عمر ہو گئی اعضا سب بے کار ہو گئے یہ جنگ میری لڑائی نہیں ہے۔ فوج خود سر لڑ رہی ہے۔ اگر تم کو شوق جنگ ہے تو اس فوج کے افسروں سے معاملہ کر لو“ چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دو پلٹنیں لے کر وہ شہر کے باہر نکلے بانک پت پر گوروں سے مقابلہ ہوا اور کئی چھکڑے غنیمت کے لوٹ کر حضرت مرحوم گھر واپس آئے اور باہر کے جلوخانہ کے حجروں میں وہ سب غنیمت مقفل کر دی۔ دوسرے روز افسران فوج ان کے پاس آئے اور کہا کہ میرزا صاحب یہ غنیمت تقسیم کیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اس کے مستحق نہیں ہو۔ چے لام زبر چل دال وا و پیش دو، چل دو۔ ہر چند ان سب نے

---

[1] یہ بھی لقب باغیوں کا تھا ۱۲

اور والد مرحوم نے ان کو سمجھایا کہ یہ تکرار مناسب نہیں تمام فوج بگڑ جائے گی مگر بڑے ابّا نے کسی کی نہ سُنی اور وہ لوگ یہ کہکر چلے گئے کہ کل سمجھ لیں گے۔ دوسرے دن یہ خبر ملی کہ وہ لوگ مع ایک جمعیت مسلّح مستعد بقصد فساد آرہے ہیں۔ یہاں بھی لڑائی کی طیاری کرلی گئی۔ نواب ضیاء الدولہ[1] مع اپنے ملازمین کے اپنے بہنوئی کی مدد کو آگئے پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ملازمین جستہ جستہ مقامات مناسبہ پر بندوق تلوار دے کے کھڑے کر دیئے گئے۔ بڑے ابّا اور ان کے فرزند اکبر میرزا احمد بیگ اِدھر اُدھر انتظام میں مصروف تھے۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ نے فرصت پاکر یہ مشورہ کیا کہ جس طرح ہو سکے صلح کرلی جائے۔ باہم مشورہ کرکے دونوں نے بڑے ابّا سے کہا کہ آپ مع چند ملازمین دیوان خانہ کی چھت پر جائیے تاکہ آپ کو اچھی طرح موقع بندوق چلانے کا ملے اور ہم یہاں پھاٹک پر ان کو روکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تو کوٹھے پر گئے اور نواب ضیاء الدولہ نے زینہ کا دروازہ بند کرکے قفل لگا دیا اور خود پھاٹک پر مع والد مرحوم جاکر دروازہ کھول دیا اس عرصہ میں افسران فوج مع جمعیت کے قریب آگئے۔ نواب ضیاء الدولہ بہادر اور والد مرحوم ان کے پاس گئے اور گفتگو صلح کی شروع کردی۔ افسروں نے کہا کہ میرزا صاحب ناحق ضد کرتے ہیں اگر ہم خاموش رہ جائیں تو یہ جمعیت کس طرح خاموش رہ سکتی ہے۔ خلاصہ این کہ یہ قرار پایا کہ جمعیت دُور ہی کھڑی رہے۔ افسرانِ فوج ہمراہ آکر مال غنیمت کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد تقسیم کرلی جائے چنانچہ حجروں کے قفل کھولے گئے افسروں نے دیکھا کہ حجروں میں پرانی کرتیاں، جوتے اور ٹوپیاں بھری ہوئی ہیں۔ افسروں نے تعجب کیا کہ اس ہی مال پر مرزا صاحب ہم سے لڑتے تھے۔ الغرض افسروں نے سپاہیوں کو بلاکر وہ مال دکھادیا۔ سبھوں نے یہ کہا کہ یہ مال مرزا صاحب کو مبارک رہے اور باجا بجاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اُدھر بڑے ابّا اور

---

[1] شاہی طبیب تھے اور ان کی بہن مرزا عاشور بیگ شہید سے منسوب تھیں ۱۲

ان کے فرزند اکبر مع ملازمین گولے بارود سے طیار منتظر تھے کہ جمعیت زد پر آئے تو حملہ کر دیا جائے۔ نواب ضیاء الدولہ نے حجرہ اسی طرح مقفل کر دیا اور زینہ کا دروازہ کھول کر اپنے بہنوئی کو طلب کیا اور اطلاع کر دی کہ مخالفین کی فہمائش کر دی گئی۔ اب کوئی خدشہ باقی نہیں رہا۔

جس دن انگریز شہر پر حملہ آور ہوئے اور کشمیری دروازہ پر قابض ہوئے۔ اہل شہر متوحش اور سراسیمہ شہر سے نکل کر بھاگنے لگے۔ اس وقت نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین اور جوان فرزندوں کے خانچن کے کوچہ میں چلے آئے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور تقدیر الٰہی کے منتظر رہیں۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ بہادر نے ہر چند چاہا کہ سب مستورات بیگمات ملازمین ذکور و اناث اس وقت فرصت ہیں کہ ہنوز انگریز داخل شہر نہیں ہوئے ہیں، مثل دیگر خلائق کے کسی طرف نکل جائیں۔ مگر بڑے ابّا راضی نہ ہوئے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت کو علم نجوم و رمل میں بڑا دخل تھا اور یہ حکم لگا رکھا تھا کہ انگریزوں کو شکست ہو گی۔ میرزا احمد بیگ نے بھی کہ ان فنون میں شاگرد اپنے والد کے تھے۔ باجازت اپنے والد کے قرعہ ڈالا تھا اور یہ حکم لگایا تھا کہ فلاں روز انگریز شہر میں داخل ہوں گے۔ اس حکم پر بڑے ابّا نہایت برافروختہ ہوئے اور بیٹے سے کہا کہ افسوس ہے تو ان فنون میں اب تک نالائق رہا۔ القصہ والد مرحوم افسوس کناں دہلی دروازہ واپس آئے تاکہ سب گھر والوں کو اور کچھ ضروری سامان لے کے خانچن کے کوچہ سے واپس جائیں اور شرکت کریں مگر اس میں ناکام رہے۔ یعنی شہر میں یکایک قیامت برپا ہو گئی۔

شہر پر انگریزوں کا قبضہ و کشت و خون

ہر گلی کوچہ میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی راستے سب بند ہو گئے گورے اور خاکی اور افغان ہر قسم کے ہتیار باندھے فتح کے نشہ میں سرشار لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ زن و بچہ ضعیف و جوان میں فرق نہ کرتے تھے۔ خون کی ندیاں بہ گئیں زنانوں میں گھس گھس کر غارت گری شروع کر دی۔ وہ بیبیاں کہ بقول فردوسی ؎

برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

کی مصداق تھیں گھر چھوڑ کر اپنے مردوں کے حالات سے بے خبر جدھر منھ اٹھا بھاگ رہی تھیں۔ ہمارے مکان سے شہر کا دروازہ قریب تھا۔ والد مرحوم اور ماموں محمد ابراہیم خاں مع ہم سب اہل و عیال و ملازمین افغان و خیر اں شہر کے باہر نکل گئے اور حضرت سید حسن رسول نما رحمہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں پہونچ کر وہاں کے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں رحیم بخش اور غلام رسول دو قدیم ملازمین بھی ہتیار بستہ پہونچ گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عین داروگیر کے دن بڑے ابّا اور نواب ضیاء الدولہ مع اعزّا و ملازمین مسلّح گھر سے نکلے۔ ان کا چوک میں

بزرگان خاندان کی شہادت

کانے منکاف[1] سے مقابلہ ہوگیا وہیں سب مرد شہید ہوئے۔ عورتوں بچّوں کا حال معلوم نہیں کہ کدھر گئے۔ جو صدمہ سامعین کے دلوں پر گزرا وہ قابل بیان نہیں۔ مگر خود اپنی مصیبت بھی کم نہ تھی دونوں فریقوں سے خوف جان و مال تھا۔ باغی ایک طرف اور خاکی وغیرہ انگریزی فوج دوسری طرف۔ گویا شرط باندھے ہوئے تھے کہ کون خون خرابا لوٹ مار زیادہ کرے۔ ایک دن کا واقعہ مجھکو یاد ہے کہ میں اور دوسرے ہم سن بچّے درگاہ شریف کے باہر املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے اور ایک لڑکا املی پر چڑھ کر کتارے پھینک رہا تھا کہ دُور سے خاکی دکھائی دیئے بلکہ ایک خاکی تیغ بکف ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ہم سب بچّے کھنڈروں کی طرف "خاکی آگئے خاکی آگئے" کہتے ہوئے بھاگے۔ عورت مرد سب یہ آواز سن کر کھنڈروں سے نکل کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ بارے وہ خاکی چند قدم چل کر پھر اپنی ٹکڑی میں جا ملا تب سب کی جان میں جان آئی۔ خود ہمارے دونوں خدمتگار روزانہ اِدھر اُدھر دور تک نکل جاتے اور لٹیروں کے ساتھ مل کر جنس وغیرہ کھانے کی چیزیں لوٹ کر لاتے اور ایک گھڑا پانی سے بھرا پتھروں کے

---

[1] جنرل مٹکاف چوں کہ صرف ایک آنکھ میں شیشہ لگایا کرتا تھا۔ دہلی والے اُس کو کانا کہا کرتے تھے ۱۲

چولہے پر دھرا ہوا تھا اس میں ڈالتے جاتے۔ دال، چاول، گوشت، گڑ، گیہوں، آٹا سب اس میں مل کر پکتا تھا جس کو بھوک لگتی دبے دبے پاؤں گھڑے کے پاس جاتا اور اپنا پیٹ بھر کر پھر کسی دیوار، مونڈیر کی آڑ میں چھپ رہتا۔ ان ہی نوکروں نے خبر دی کہ خالہ صاحبہ[1] اور ان کے ساتھ دوسرے رشتہ دار مرد اور عورت برف خانہ میں مقیم ہیں ہم سب گرتے پڑتے برف خانے پہونچے، وہاں دیکھا ہر طرف پہرا چوکی ہے اور سب لوگ اطمینان سے بے خوف اور بافراغت گزر کر رہے ہیں معلوم ہوا کہ خالو ابّا نے الور سے جمعیت اور سواریاں اونٹ چھکڑے رتھیں، بہلیاں، پالکیاں اور انگریزی پروانے راہ داری اور نقد رقم کثیر بھیجی ہے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی اموجان ریاست الور کے وزیر اعظم تھے اور میری حقیقی خالہ کے شوہر تھے۔ یہاں دوسرے رشتہ دار بھی رفتہ رفتہ جمع ہوتے گئے مثلاً بڑے خوجم صاحب اور چھوٹے خوجم صاحب[2] (مترجم بوستان خیال) کہ میرے رشتہ کے چچا تھے اور بڑے ابّا کا منجھلا فرزند مرزا محمود بیگ اور عورت مرد دیگر اعزّہ بھی آملے۔ اب ہم امیرانہ ٹھاٹ سے الور روانہ ہوئے۔ راستہ میں چند منزل بعد نواب محمد غلام فخرالدین خاں[3] مع اہل و عیال ایک چھکڑے میں لدے ہوئے ملے۔ غلام فخرالدین خاں میری پھوپی مرحومہ موصوفہ امانی خانم کے اکلوتے بیٹے اور نواب دبیرالملک اسد اللہ خاں غالب کے نہایت پیارے بھتیج داماد تھے جن کی تعلیم کے واسطے غالب نے "ماہ نیم ماہ" و "پنج آہنگ" وغیرہ کتابیں تصنیف

---

۱ عجیبۃ النسا بیگم ۱۲ ۲ خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں ۱۲ ۳ میرے پھوپا نواب علی بخش خاں ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف ریاست لوہارو فیروز پور جھرکا کے شرعاً حق دار تھے مگر بخت نے یاری نہ دی۔ اس خاندان کا کچھ حال میں دوسری جگہ لکھ آیا ہوں۔ مرزا غالب دو بھائی تھے بڑے بھائی کا اسم شریف مرزا یوسف تھا۔ چوں کہ مرزا غالب لاولد تھے بڑے بھائی کی اکلوتی بیٹی کی اولاد ہی مرزا کی اولاد ہے یعنی میری اور غلام فخرالدین خان کی اولاد۔ عزیزالنسا بیگم غلام فخرالدین خاں کی زوجہ اور میری ساس تھیں۔ غلام فخرالدین خاں نواب صاحب لوہارو کے برادر زادہ تھے ۱۲

کی تھیں۔ یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ اسی راستہ میں ان کے ہاں ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ جو اب میری بی بی ملکہ بیگم المخاطب بہ نواب سکندر زمانی بیگم میرے ذی علم اور اقبال مند دس بچّوں کی والدہ ہیں۔

اور ہیں عارضی اطمینان

اور ہیں ہم عالی شان مکانوں میں فروکش ہوئے اور والد مرحوم کو ٹھوکرے کی حکم داری کی خدمت بھی مل گئی۔ ٹھوکرے کے قیام کی زندگی اس وقت تک مجھکو یاد ہے۔ گاؤں کے باہر تالاب کے کنارے درختوں کے سایہ میں گائیں بھینسیں، بکریاں جگالا کرتیں۔ چرواہے گڈریئے کمل اوڑھے ہوئے فرش زمین پر خرّاٹے لگاتے۔ ہم گاؤں کے بچّوں کے ساتھ تمام دوپہر تالاب کے کنارے پر اودہم مچاتے۔ شام کو گائیں بھینسیں بکریاں پکارتی چلاّتی پاؤں سے خاک دھول اُڑاتے ہم پیچھے پیچھے گاؤں میں واپس آتے۔ زمیندارنیاں والدہ کے واسطے جنگلی بیر اور کچریاں بطور میوہ اور دودھ دہی تحفہ لایا کرتیں۔ ایسی بے فکر زندگی پھر میسر نہ ہوئی۔

چند روز یہاں آرام سے گزرے تھے کہ پھر فلکِ شعبدہ باز نیا رنگ لایا۔ مہاراجہ اور شیودان سنگھ ہنوز طفل تھے کہ یتیم ہو گئے۔ مرتے وقت بڑے مہاراج نے اپنے فرزند کا ہاتھ خالو ابّا کے ہاتھ میں دے کر وصیت کی تھی کہ اس بچّے کو تم تعلیم و تربیت کرو۔ اور اس کے سن بلوغ تک ریاست کی نگرانی کرو۔ مہاراجہ شیودان سنگھ اکثر ہمارے ہاں آتے اور خالہ صاحبہ سے نہایت تعظیم سے ملتے تھے اور ان کو امّا کہتے تھے اور ان کی والدہ رانی صاحبہ تحفے تحائف خالہ صاحبہ کو بھیجا کرتی تھیں۔ خالو میرے تین بھائی تھے۔ بڑے خود تھے، منجھلے بھائی نواب فضل اللہ خاں دیوان ریاست اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں بخشی فوج تھے۔ یہ راہ رسم دیکھ کر اہل ریاست ٹھاکروں اور منیوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا یہ دلّی والے

---

۱۱ ستمبر ۱۸۵۷ء

لوگ مہاراج کو مسلمان نہ کرلیں۔ ٹھاکر لکھدیر سنگھ حقیقی چچا مہاراج کا با اثر رئیس تھا یکایک
اُس نے بغاوت کردی اور راتوں رات ہمارے گھروں پر جمعیت کثیر ٹھاکروں اور مینوں کی
لے کر حملہ آور ہوا کچھ کشت وخون کے بعد مینے مکانوں میں گھس آئے۔

اور سے اخراج | نواب امّو جان اصطبل کی طرف دیوار سے کود گئے دیوار سے لگی ہوئی اُپلن
کی گھانس کی گری بلند اور بالاتھی اس پر گرے اور وہیں اس گری میں چھپ گئے۔ دیوان جی
اور بخشی جی گرفتار ہوئے۔ اس کی خبر رانی اور مہاراج کو پہونچی۔ اسی وقت رانی اور مہاراج نے
لکھدیر سنگھ کو پیام بھیجا کہ ہم زہر کھا کر مرجائیں گے اگر ذرا بھی ان نوابوں کو صدمہ پہونچا۔
یہ سُن کر لکھدیر سنگھ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور صرف باہر مکان کے اردگرد پہرے بٹھا دیئے بلکہ
تمام شہر میں جہاں دلّی والے بسے ہوئے تھے سب کے مکانوں پر مینوں کے پہرے بیٹھ گئے
اور ان مینوں نے پیٹ بھر کر ہم سب کو خوب لوٹا۔ دوسرے روز لکھدیر سنگھ نے ہاتھی، اونٹ
پالکی وغیرہ سواریاں بھیجیں اور بار برداری کے واسطے بھی چھکڑے وغیرہ بھیجے اور نوابوں کو
کہلا بھیجا کہ تم سب مع اپنے مال اسباب کے اس شہر اور اس ریاست سے روانہ ہو جاؤ۔
اسی طرح ہر دلّی والے کو علیٰ قدر مراتب و حیثیت سواریاں بھجدیں اور حکم نکل جانے کا دیا۔
الغرض ہم مینوں کے دست برد کے مظلوم ایک تباہی کی حالت میں وہاں سے نکالے گئے۔ راستہ
میں عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارے دونوں چچا بڑے خوجم صاحب اور چھوٹے خوجم صاحب اور
والد ماجد پالکیوں میں تھے اور ہم بچے بالے زن ومرد گاڑیوں یعنی بہلیوں میں تھے۔ راستے
میں ایک ندی پڑتی ہے جس کا نام سائبی ہے۔ ہمیشہ خشک رہتی ہے۔ شاید برشکال میں بھری
رہتی ہو گی لیکن کبھی کبھی غیر موسم میں بھی کسی وجہ سے اس میں یکایک پانی آجاتا ہے
اور اس زور سے آتا ہے کہ ہاتھی بھی اگر سامنے ہو تو بہالے جائے اور جب پانی سب بہ جاتا ہے تو

پھر خشک ہوجاتی ہے۔ الغرض پالکی والے ہم سے پہلے ندی پر پہنچ گئے تھے اور پار ہوگئے تھے۔ ایک درخت بہت بڑا تھا اس کے نیچے ہمارا انتظار کر رہے تھے اتنے میں ہم پہنچے۔ ندی کے کنارے اونچے تھے مگر گاڑی وغیرہ کا راستہ اُترنے کا بنا ہوا تھا۔ گاڑیاں یکے بعد دیگرے ندی میں اُتاری گئیں اور آدھے راستہ سے زائد طے ہوا تھا یعنی منجھدار کے پار ہوگئے تھے اور کنارا چڑھنے کا پاس آگیا تھا کہ یکایک عجیب قسم کی ہول ناک وحشت انگیز آوازیں مسموع ہونے لگیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا صدہا توپوں کی باڑھ چھوٹ رہی ہے۔ درخت مذکور کے نیچے چونگی کی چوکی تھی اور محصول گیرندہ متعین تھے وہ لوگ اس ندی کے حالات سے واقف تھے سب کے سب کنارے پر جمع ہوگئے اور غل مچایا کہ ارے گاڑیاں جلدی ہانکو ندی آرہی ہے۔ مگر ریت میں بیل کہاں تک جلدی کرتے۔

ندی کی خوف ناک طغیانی سے نجات

ان چوکیداروں نے موٹے موٹے رسّے پھینکے کہ گاڑیاں ان رسّوں سے باندھ لو اور وہ رسّے اس درخت سے باندھ دیئے گئے اور کل چوکیدار اور پالکیوں کے کہار ان رسّوں کو پکڑ کر کھڑے ہوگئے ہم سب گاڑیوں میں بیٹھے رہے۔ بھائی محمود بیگ مرحوم کی جو شامت آئی وہ گاڑی پر سے کودنے لگے مگر ان کا پاؤں ران تک گاڑی کے پہیئے میں اُتر گیا اور وہ اس ہی میں لٹک رہے۔ ادھر یہ تماشا ہوا کہ دور فاصلہ حد نظر پر ایک سیاہ دیوار سر بفلک دکھائی دی اور ہول ناک آوازوں سے ہم سب کا دل دہلنے لگا۔ محمود بیگ کو تو کسی خدمت گار نے پھرتی کرکے اس الجھاوے سے رہا کیا مگر وہ دیوار چشم زدن میں آپہونچی اور گاڑی بیلوں کو ناقابل برداشت دھکا دے کر اس قدر بلند کیا کہ گویا ہم درخت کی چوٹی کے برابر ہوگئے چوکیداروں نے رسّوں کو ڈھیل دینی شروع کردی ریلا تو پانی کا جس طرح چشم زدن میں آیا تھا اسی طرح نکل گیا اور گاڑیاں بھی نیچی ہوتی گئیں مگر

ریلے کے ساتھ گاڑیاں گھاٹ سے بہت دُور بہ گئیں۔ بارے رسّوں نے زیادہ دُور نہ جانے دیا۔
ہنوز بیل اور گاڑیاں گویا پانی پر تیر رہی تھیں کہ کنارے والوں نے رسّے اپنی طرف گھسیٹنے
شروع کردیئے اور قبل اس کے کہ پانی کا گہراؤ ختم ہو گاڑیوں کو گھاٹ کے پاس گھسیٹ لائے۔
ہمارا جو حال ہوا قابل بیان نہیں۔ پانی کے دھکّے کا صدمہ ڈوب جانے کا خوف سر سے پاؤں تک
پانی میں ڈوبے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہ بھی میدان اور جنگل کی۔ غرض کہ جانیں بچ گئیں
اسی کو غنیمت سمجھے، کھانا وغیرہ اور کچّی جنس جو ساتھ تھی وہ سب ستیاناس ہو گئی۔ رائے یہ
قرار پائی کہ اسی حالت میں جس طرح ہو سکے منزل ختم کرنی چاہیئے مگر چوکی کے چوکیدار
جھگڑا لائے کہ مال اسباب دکھاؤ یہاں تک کہ مارکٹائی پر فریقین طیار ہو گئے۔ والد نے کچھ
زرِ نقد اُن کے حوالے کیا۔ تب ہم سب عجب حالتِ بیچارگی میں آگے روانہ ہوئے اور منزل
بمنزل **شیدی پور** ایک قصبہ شہر دہلی کے باہر پہاڑی پر تھا وہاں پہونچے۔

شیدی پوری میں قیام

یہاں ہمارے ہم جد چچا **مرزا جیون بیگ خاں** کے پوتے **مرزا عبداللہ بیگ** عرف **مرزا دولہا** مع اہل وعیال واطفال مقیم تھے اور ایسے خوش حال تھے
کہ اس زمانہ میں انھوں نے شکرم وغیرہ رکھ کے ڈاک کا ٹھیکہ آگرہ یا شاید کان پور تک لیا تھا۔
ہر طرف گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہم سب ان کے پاس اُترے۔ یہاں بڑی اتّا مع اپنے
دونوں لڑکوں **خداداد بیگ** و **رفیع الدین بیگ** اور دختر آبادی بیگم بھی آگئیں اور
مفصل حال شہیدوں کا سنایا یعنی یہ کہ بڑے ابّا **مرزا عاشور بیگ** مع اپنے فرزند اکبر
مرزا احمد بیگ و دیگر عیال و ملازمین اور نواب ضیاء الدولہ مع اہل وعیال و ملازمین سب
ہتیار بند و کمر بستہ چاندنی چوک میں آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے گوروں کی جمعیت نظر آئی
آگے آگے ان کے سرتھیا فلس متکاف چلا آتا تھا۔ اس کو اہل شہر کانڑا متکاف

اس واسطے کہتے تھے کہ وہ ایک آنکھ پر شیشہ لگاتا تھا اور بادشاہ کے دربار میں رزیڈنٹ یا ایجنٹ تھا۔ اس ظالم نے فوراً سب کو گھیر لیا مرزا احمد بیگ نے تلوار میان سے نکالی مگر ان کے والد نے اُن کو روک دیا اور کہا کہ بس اب شہادت کے لئے طیار ہو جاؤ اور کلمۂ توحید ورد کرو۔ سر تھیافلس نے عورتوں کو اور چھوٹے بچّوں کو الگ کھڑا کر دیا اور مردوں کی رسن بستہ قطار کھڑی کردی اور حکم فایر کا دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی وقت ایک انگریز نے ضیاء الدولہ کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ یہ جیم شحیم آدمی زمین پر گر پڑے اُدھر رسن بستہ قطار مثلِ مرغانِ مذبوح لوٹنے لگی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نواب ضیاء الدولہ عورتوں اور بچّوں کو لے کر سپنت گئے اور وہاں سے شدی پوری آگئے۔

الغرض شدی پوری میں ہم لوگ چند روز مقیم رہے۔ شہر کے دروازہ پر گوروں کا پہرہ تھا بلاٹکٹ آمد و رفت مسدود تھی۔ بھائی علی مرزا بیگ جن کا حال میں انتقال ہوا ہے ان کو ضرورت شہر میں جانے کی تھی میں بھی ساتھ ہوا وہ کپتان کے بنگلہ پر ٹکٹ کے واسطے گئے۔ کپتان اتفاقاً باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار انگریز کی صورت دیکھی۔ میں نہایت گورا چٹّا اور فربہ تھا میرے سر پر اس نے ہاتھ پھیرا اور ٹکٹ دیدیا۔ شدی پوری میں چچا مرزا عباس بیگ کا خط والد کے نام آیا کہ تم عاشور بیگ شہید کے اہل وعیال سمیت فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

مرزا عباس بیگ سیتا پور ملک اودہ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے ان کو جاگیر علاقہ بڑا گاؤں عطا کی تھی اور علاوہ اس کے چھ سو روپیہ ماہوار بھی کر دیئے تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کو بہت کم ملتے تھے۔ علاوہ خط کے چچا صاحب نے خرچ راہ اور پروانہ راہداری بھی بھجوا دیا تھا۔ چچا مرزا دولھا نے اپنے منجھلے فرزند علی مرزا بیگ کا نکاح بڑے ابّا شہید کی منجھلی لڑکی آبادی بیگم سے بمشورہ والد ماجد کر دیا اور ہم سب لوگ سیتا پور ر

روانہ ہوئے شیندی پوری کے قیام میں کوئی بات قابل تحریر نہیں بجز این کہ ہر جمعہ کی سہ پہر کو شیندی گوہر کے باغ میں عبداللہ خاں داستاں گو امیر حمزہ کی داستان کہا کرتے تھے باوجودیکہ اہل دہلی کی ایسی سقیم حالت تھی کہ گھربار سب لٹ گیا خانہ بدوش ہوگئے مگر چندہ کرکے داستان ضرور سنا کرتے تھے۔

سیتاپور میں امن اور قیام

منزل بمنزل شاید پندرہ بیس روز میں ہم سیتاپور پہونچے اور خدا کے فضل سے سایۂ عاطفت عم بزرگوار مرزا عباس بیگ میں تمام آفات سے محفوظ بآرام زندگی بسر کرنے لگے۔ مسٹر طامسن کمشنر نے والد مرحوم کو اس ضلع کی رعایا سے ہتھیار مثل بندوق طمنچہ، تلوار وغیرہ چھین کر جمع کرنے پر مقرر کردیا۔ چچا صاحب مرحوم نے کہ اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے ایک روز والد مرحوم سے کہا کہ اب جو بچہ تمھارے ہاں پیدا ہو مجھکو اس طرح دے دو کہ پھر اس سے کچھ تعلق نہ رکھو۔ والد نے جواب دیا کہ آپ خود سر امر میں مختار ہیں اور میں نافرمان بردار خرد نہیں ہوں جو کچھ عذر کروں۔ الغرض فیاض بیگ مرحوم پیدا ہوا اور چچا صاحب نے اس کو اپنی فرزندی میں لے لیا چنانچہ اس کی پیدائش کا قطعہ تاریخ غلام حسنین[1] قدر بلگرامی نے کہا اور نرالا مادۂ تاریخ نکالا یعنی ع

بہ دمید این گل عباس ز نخلے عجبے

---

[1] غلام حسنین قدر ہمارے خاندان کے دست گرفتہ تھے اور میں نے ان کو ماہوار چار صد روپیہ شاعر دربار شاہی کے لقب سے حیدرآباد میں مقرر کرادیا تھا اور یہیں انھوں نے انتقال کیا دادا مرزا نوشہ کے شاگرد تھے قصیدہ گوئی میں کسی طرح سودا اور ذوق سے کم نہ تھے حضرت غالب سے قبل بحر ایک لکھنؤ کے نامی شاعر کے شاگرد تھے۔ میں جب اُن کو بحر کا یہ شعر پڑھکر سنایا کرتا تھا تو وہ بہت خفا ہوتے تھے وہ شعر یہ ہے؎

وہ کون دن ہے کہ سودائے زلف وخال نہیں

مرے نوالے میں لگی نہیں کہ بال نہیں

والد مرحوم کو مرض مراق تھا اور شدت مرض میں ایسی نوبت جنون کی پہونچتی تھی کہ از خود رفتہ ہو جاتے تھے اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی۔ دادا صاحب مرحوم

دادا صاحب مرحوم | (مرزا اکبر بیگ) سیّاح آدمی تھے۔ عربی فارسی میں فرد فرید تھے اور علوم ریاضیات ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ممالک میں سیر و سفر کیا حتیٰ کہ اس زمانہ میں حج بیت اللہ کی نعمت حاصل کرتے ہوئے براہ مصر ملک اطالیہ پہونچے اور وہاں عملی ریاضیات حاصل کی وہاں سے مغرب اقصیٰ کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن واپس آئے اور مہاراج چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ اس ہی زمانہ میں مرزا یوسف برادر حقیقی کلاں مرزا اسد اللہ خاں غالب افواج قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت مقتدر عہدہ پہ سرفراز تھے کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلا دی کہ وہ مجنون محض ہو گئے اور تا وقت انتقال[1] مجنون رہے۔ الغرض دادا صاحب (مرزا اکبر بیگ) مہاراج سے رخصت ہو کر دہلی واپس آئے اور اپنے مکان شیش محل میں گھنٹہ گھر یعنی کلاک ٹاور کھڑا کیا جو تمام ہندوستان میں اس وقت تک کہیں نہیں بنا تھا۔ مگر چند روز بعد پھر سفر کو نکلے اور لکھنؤ آئے۔ اس بار والد مرحوم کو بھی ہمراہ لائے۔ لکھنؤ میں افیون کھانے کا رواج ادنیٰ و اعلیٰ میں بہت تھا۔ والد مرحوم کو بھی افیون کی بکثرت عادت پڑ گئی جب دہلی واپس آئے تو بعض احباب نے چھیڑنا شروع کیا اور پھوپھی صاحبہ نے جب ان کی نسبت تلاش کی تو کوئی اپنی لڑکی دینے پر راضی نہ ہوا اور مرحوم کو اس قدر غیرت دامن گیر ہوئی کہ ایک مرتبہ قسم کھا بیٹھے کہ آج سے افیون نہ کھاؤں گا اس ایک دم ترک کے باعث سخت بیمار پڑ گئے۔ اس زمانہ میں حکیم محمود خاں کی شہرت

---

[1] میری خوشدامن مرحومہ عزیز النسا بیگم ان کی بیٹی اور غالب کی حقیقی بھتیجی تھیں ۱۲

شروع ہوئی تھی اور والد مرحوم میں اور حکیم صاحب مغفور میں کمال محبت تھی اُنھوں نے خاص توجہ سے ایسا نادر علاج کیا کہ گویا مردہ کو زندہ کردیا۔ بااین ہمہ دماغ پر اس عادتِ بد کا کچھ اثر باقی رہ گیا تھا جس سے کبھی کبھی مراق کا دورہ پڑجاتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد پھر چچا صاحب نے ہم کو بلوالیا۔

ہردوئی میں قیام

اس بار ہم ہردوئی میں چند ماہ مقیم رہے اور پھر دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اسی طرح دو تین سفر اس قسم کے ہوتے رہے۔ اس زمانہ کا سفر خطرناک تھا اضلاع اودھ بالخصوص سیتاپور اور ہردوئی میں پاسی قوم مسافروں پر ڈاکا ڈالتی تھی۔ والد مرحوم پالکی میں اور ہم بہلیوں میں سفر کرتے تھے۔ پروانۂ راہداری کے باعث تحصیلدار، تھانہ دار ہماری نگرانی کرتے اور پاسیوں کو راہ بتانے کے واسطے متعین کردیتے تھے۔ ایک دفعہ ہردوئی کے جنگل میں ایک پاسی ہم کو دانستہ راہ غلط کرکے گھنے جنگل میں لے گیا تاکہ وہاں چھپے ہوئے پاسی حملہ آور ہوں۔ مگر ہمارے ملازمین یکایک چونک پڑے اور پاسی کو گرفتار کرکے منھ میں کپڑا ٹھونس کے دست و پا بستہ گاڑی پر ڈال دیا اور پھر اُلٹے پھر کر راستہ پر واپس آئے[1]۔

---

[1] اس زمانہ کے سفر بھی خاص لطف رکھتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے رسل رسایل کے واسطے میل کاٹ اور مسافرین کے واسطے شکرم، اسپ گاڑی دہلی سے کلکتہ تک جاری کر رکھی تھی میل کاٹ پر شاید ایک یا دو مسافر کی جگہ تھی اور کرایہ مہنگا تھا شکرم میں چار آدمی اندر اور دو باہر چھت پر سستے کرایہ سے بیٹھا کرتے تھے پوری شکرم بھی بلا شرکت غیرے کرایہ پر بمدست ہوسکتی تھی۔ مگر میل کاٹ یا شکرم پر صرف اہل ضرورت سفر کرتے تھے۔ عام طور پر بیلوں کی گاڑیاں جنھیں 'بہلی' کہتے تھے کرایہ پر بمدست ہوتی تھیں اور منزل بمنزل سفر ہوتا تھا۔ مقامات منزل مقرر تھے۔ ہر مقام پر سرائیں بنی ہوئی تھیں جس میں بھٹیارے بسے ہوئے تھے۔ ہر روز یہ بھٹیارے اپنی سرائے سے دُور تر جاکر مسافروں کو استقبال کرکے لاتے تھے۔ آپس میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ہر بھٹیارا اپنی صفات بیان کرکے مسافروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ مسافر بیچارہ ان کی باہم کش مکش میں حیران و پریشان ہوجاتا تھا۔ سرائے کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی عجیب سا منظر آتا تھا۔ جدھر دیکھئے گاڑیاں، بیل، گھوڑے، اونٹ وغیرہ سواریوں کا جھمگٹ ہے

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

میری تعلیم | میں نے غدر سے پہلے چند سورتیں پارۂ عم کی پڑھی تھیں۔ غدر کے زمانہ میں اور الور میں قیام کے زمانہ میں کھیل کود میں عمر گزری۔ جب سیتا پور آئے تو پھر الف بے شروع کی گئی۔ دہلی میں جب قیام رہا تو بڑے خوجم صاحب سے کریما، مانقیما اور آمد نامہ پڑھتے رہے یا سید حامد[1] اور سید محمود[2] پسران ماموں سرسید احمد خاں کے ساتھ کھیلتے رہے اور متواتر سفروں میں سب بھول بھال گئے۔ سیتا پور میں جب مستقل قیام ہوا تو مدرسہ میں بھیجے گئے۔ تینوں عم زاد بھائی مرزا محمود بیگ، خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ غدر کے بعد سیتا پور میں مقیم رہے تو وہ اعلیٰ کلاسوں میں پہونچ گئے اور میں سب سے پھسڈی رہا۔ اور چوں کہ کھیل کود کا زائد اتفاق رہا پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت بھی نہ تھی۔ الغرض جب میں مدرسہ میں داخل ہوا تو الف کے نام بھالا بھی نہ جانتا تھا۔ اس مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر بابو رام چندر ایک ذی علم آدمی تھے اس مدرسہ میں علاوہ اردو انگریزی کے حسب خواہش والد مرحوم ہندی ناگری کے کلاس میں بھی مجھے شریک کیا گیا۔ پنڈت امرناتھ سے پریم ساگر تک ناگری پڑھی۔ ذہن اور حافظہ میرا بہت اچھا تھا۔ مگر کھیل کی طرف رغبت زائد تھی۔ سب سے زائد گیڑیوں اور گولیوں میں جی

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) درختوں پر جانوروں کا غل شور، بسیرے کا وقت، بھٹیاروں کی مسافرین کے ساتھ چھین جھپٹ، مسافرین کے غول کے غول پکلنے رنیدھنے کی فکر میں ادھر ادھر دوڑ دھوپ اور غل غپاڑا، گھوڑوں کا ہنہنانا، بیلوں کا ڈکارنا، اونٹوں کا بلبلانا، شام کا رفتہ رفتہ رات ہو جانا ایک خاص سماں بندھ جاتا تھا۔ بی بھٹیاری کی پکائی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں اور کھڑی چھلکوں کی ماش کی دال اس میں بڑا لوندا گھی کا رکھا ہوا۔ روٹیاں بھی گھی سے چپڑی ہوئی تھکے ماندے بھوکے مسافروں کو وہ مزہ دیتی تھیں کہ بادشاہوں کی اغذیۂ لطیفہ بھی ان پر صدقہ کر دی جائیں دس بجے رات تک ہر طرف چہل پہل، کہیں بھنگ والوں کے نعرے کسی طرف طبلہ سارنگی و ستار کے نغمے کہیں گاؤں کی رنڈیاں رقص کناں اور کسی طرف مسافروں کی لڑائی بھڑائی کا ہنگامہ عجب ایک تماشا لائق دید ہوتا تھا جس کو ریل کے سفر نے ہمیشہ کے واسطے معدوم کر دیا اور اب تو خود رو گاڑی یعنی موٹر کار زمین کی چھاتی پر دال دلتی ہے اور اوڑن کھٹولا آسمان کی چادر کو پاش پاش کرتا ہے ۱۲

[1] مہتمم پولیس ہو گئے تھے ۱۲ [2] الہ آباد ہائی کورٹ کے نامی جج ہوئے ۱۲

لگتا تھا۔

اس زمانہ کے کھیل | دوسرے کھیل جو دہلی میں قبل از غدر جاری تھے مثل کبڈی، سرنگ لال گھوڑی کوڑی ذقن، گیند بلا وغیرہ میدان کی بازیاں۔ لڑکوں کے کھیل مثل چڈی چڈوں[1]، چیل جھپٹا گلی ڈنڈا اور کاٹ کٹول، آنکھ مچولی، بڑھیا ہم نے تیری سوئی پائی۔ اس میں ہم سن لڑکیاں بھی شریک ہوتی تھیں۔ اندر والان کے کھیل مثل چید رچھوپل، کوڑا ہی جمال شاہی چپکے گا تو ماروں گا۔ اس میں بھی لڑکیاں شریک رہتی تھیں۔ خاص لڑکیوں کے کھیل تتی تتی پوہ۔ یا کوئی ایسا سخی کوئی دیسا سخی کوئی چڑیا کا پھندا چھوڑا دو جی۔ اور قدیم سنت ماما حوا یعنی گڑیاں کھیلی جاتی تھیں[2]۔ میں بھاگ دوڑ کے کھیلوں میں دوسرے لڑکوں سے بوجہ فربہی جسم برابری نہ کرسکتا تھا۔ البتہ ڈنڈ مگدر، کشتی، پیراکی میں کسی سے کم نہ تھا۔

میری تعلیم کی نئی تدبیر | تعلیم کی طرف میری عدم توجہی دیکھ کر والد مرحوم نے ایک نئی تدبیر سوچی یعنی اردو کی چھوٹی چھوٹی قصے کہانی کی کتابیں نظم و نثر لاکر ایک حجرے میں رکھدی تھیں اور مدرسہ کی تعطیلات میں مجکو اس حجرے میں دو تین گھنٹوں کے واسطے بند کر دیتے تھے۔ اس طرح مجکو خواہ مخواہ کتاب بینی کی عادت پڑ گئی جو ما بعد عمر میں میرے بہت کام آئی لیکن

---

[1] اس کھیل پر ایک ضرب المثل شیطان کی چڈی مبنی اور زبان زد خاص و عام تھی۔ مشہور یہ تھا کہ اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شیطان بھی شریک رہتا ہے اور جب اس کی باری چڈی دینے کی آتی ہے تو غائب ہو جاتا ہے۔ یہ تو شیطان کی چڈی ہوئی۔ یعنی اپنا کام نکال کر ہماری باری آئی تو پہلو تہی کر گئے اس ہی پہلو تہی کے معنی میں گول ہو جانا بھی ہے۔ یعنی جس طرح بعض جانور اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں منھ خول میں چھپا کر گول ہو جاتے ہیں اسی طرح پہلو بچا گئے ۱۲ [2] امرا و شرفا شطرنج چوسر گنجفہ میں دل بہلایا کرتے تھے یا اکثر سہ پہر کو جاڑے کے موسم میں تکل اڑاتے اور لڑاتے تھے ۱۲

مدرسہ کی تعلیم میں وہی بے توجہی رہی بالخصوص حساب میں مطلق دل نہ لگتا تھا اور گھر پہ کبھی درسی کتاب ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ مگر ذہن کی تیزی کے باعث کلاس میں کام خراب نہ رہتا تھا۔ گھر پہ بیت بازی میں والد کے سامنے سب کو ہرا دیتا تھا۔ اس واسطے کہ اُردو اشعار مجکو بہت ازبر ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی والد مجکو خود لے کر بیٹھا کرتے اور شعرا[1] اشعار کے معنے سمجھایا کرتے۔ والدہ نے یہ طریقہ ناپسند کیا مگر مجکو رغبت شاعری کی طرف ہو گئی۔ اس عرصہ میں والد مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ برادران عم زاد مذکورۂ بالا ہم سے پہلے لکھنؤ پہونچ گئے تھے اور کیننگ کالج کے اعلیٰ درجوں میں شامل ہو گئے تھے میں جب لکھنؤ آیا ہوں تو کچھ اُردو لکھ پڑھ لیتا تھا اور والدہ نے قرآن مجید پڑھا دیا تھا بس یہ میرا مبلغ علم تھا میرے عم زاد بھائی انگریزی، فارسی، اردو میں بدرجہا مجھسے بڑھے ہوئے تھے الغرض والد کو حالتِ مرض میں وہ لے گئے اور میں چچا صاحب مرحوم کے پاس رہا۔

قیام کیننگ کالج | اسی زمانہ میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہوا جنرل بیرو چیف کمشنر اودھ نے مرزا عباس بیگ اور بابو کھنا ریخن مکرجی کو اپنے ہمراہ لے کر کے قیصر باغ میں تعلقہ داران و امرائے اودھ کی تعلیم کے واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا جس کا نام وارڈز انسٹی ٹیوشن رکھا گیا اور یہ تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا۔ جس وقت میرا نام اس تعلیم خانے میں لکھا گیا۔ فقط تعلقہ داران اودھ کے یتیم لڑکے جن کی جائداد زیر نگرانی حکام تھی۔ شریک تھے۔ من جملہ

---

[1] ایک بار مجھ سے ایک شعر فی الوقت فرما کر پوچھا تھا کہ اس میں کونسا لفظ قابل اصلاح ہے وہ شعر یہ ہے ؎

غیر کے نقش قدم سے ترا کوچہ پایا
خضر رہ ہو گیا بس غول بیاباں اپنا

پھر خود ہی فرمایا لفظ "بس" یہاں بے ربط ہے ایک شعر اور آنحضرت کا مجھے یاد ہے ؎

صلح کا لفظ میسر نہ ہوا
اُس سے آخر کو رہ گیا نہ اٹھا

اُن کے راؤ ملاپور، راجہ بہنگا، راجہ مہیوا، راجہ ہڑہا، راجہ امیر حسن خاں محمود آباد، مہنت ہرچندداس، اندر بکرم سا، راجہ کھری گڈھ، چودھری امتیاز الزمان، چودھری مصطفےٰ حسین، شیخ یوسف الزماں، چودھری محمد واجد حسین، چودھری احسان رسول، دیو وندرہ سنگھ وغیرہم مع راقم و محمود بیگ و خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ ہم کوئی ۱۷، ۱۸ طلبا رہتے تھے[1]۔ بابو اننداال رائے ہمارے گورنر اور دکھنا رنجن اور عم مرحوم مرزا عباس بیگ وزیٹر یعنی نگراں کار نامزد ہوئے۔ تعلیم فارسی کے لئے مولوی رفعت علی و مولوی عزت علی مقرر تھے علاوہ ان کے مسٹر برجس برائے بندوق بازی اور دو بھائی جانسن کلاں و جانسن خرد کرکٹ اور دوسرے انگریزی کھیلوں کے لئے اور ایک پہلوان برائے ڈنڈ و مگدر وغیرہ دیسی ورزش کے واسطے ملازم تھے۔ ہر طالب علم کو کمرے وسیع اور بیوتات برائے باورچی خانہ و خدمت گاران دیئے گئے تھے۔ ہم سب شب و روز اس ڈنگل میں رہتے تھے۔ تعطیلات میں سب طلبا اپنے اپنے علاقوں پر چلے جاتے تھے۔ ہم چار جوں کہ مقیم لکھنؤ تھے ہفتہ میں ایک بار گھر آتے اور ہر روز شام کو چچا صاحب مرحوم کے ساتھ کھانا کھا کر فوراً واپس جاتے تھے۔ دن کا کھانا گھر سے آجاتا تھا۔ قواعد اس تعلیم خانہ کے عجیب تھے کہ علی الصباح سب طلبا لباس پہنکر صدر کمرہ میں جمع کئے جاتے اور زیر نگرانی چپراسیان پیدل ہوا خوری کو بھیجدیئے جاتے اور قبل طلوع آفتاب واپس آکر دیسی کسرت سیکھتے۔ پھر اس کے بعد سب صدر کمرے میں جمع ہوجاتے دونوں مولوی حاضر رہتے اور اول درس فارسی ہوتا بعدہٗ گورنر بابو درس انگریزی متعلق کالج سنتے، ۹ بجے کھانے کے بعد فٹن بگھی وغیرہ سواریاں

---

[1] (ایک لطیفہ) ایک ہندو تعلقہ دار کا لڑکا سکندر نامہ میں میرا ہم درس تھا۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ دماغ معطر ہوگیا کی فارسی کہو۔ اس نے کہا کہ دماغ معطر شدہ رفت۔

حاضر ہو جاتیں ہم سب سوار ہو کر کیننگ کالج واقع امین آباد زیر نگرانی چپراسیاں بھیجدئے جاتے یہ کالج گونگے نواب کی کوٹھی میں تھا صدر اساتذہ یعنی پرنسپل اس وقت مسٹر بائی کاٹ اور مسٹر وہائیٹ[له] ادب انگریزی کے واسطے ملازم تھے مسٹر وہائیٹ کے علاوہ دیگر علوم کے واسطے مثل تاریخ و ریاضی وغیرہ دو تین اور انگریز اُستاد بھی نوکر تھے۔ پس پشت اس وسیع سہ چہار منزل کوٹھی کے ایک وسیع مکان موسوم بہ امام باڑہ تھا یہاں شاخ عربی فارسی کی تھی اور مولوی فضل اللہ و منشی ظہیر الدین یہ دونوں صاحب اپنے علوم میں فاضل متبحر تھے چنانچہ میں نے بھی ان حضرات رحمہم اللہ سے عربی فارسی پڑھی تھی۔

ایک لطیفہ مجکو یہاں یاد آیا ایک مرد معقول کلکتہ سے لکھنؤ میں آئے اور فن شعر گوئی میں بڑا دعوی رکھتے تھے یہ سن کر کہ نجم الدولہ دبیر الملک **مرزا اسد اللہ خاں غالب** معروف بہ مرزا نوشہ میرے دادا ہوتے تھے مجھ سے بکمال شوق ملنے کو آئے اپنے تئیں شاگرد دادا مرزا نوشہ کا بتایا اور ایک غزل اپنی مجکو سنائی جس پر ان کو بڑا ناز تھا مطلع اس کا یہ تھا ؎

جو چشم نم کو اُٹھا کے دیکھا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
بہا یا آنکھوں سے ایک دریا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے

اُنھوں نے الفاظ "اُٹھا کے دیکھا" کے واسطے فلک کے اوپر سفر اختیار کیا۔
الغرض میں ان کو منشی ظہیر الدین صاحب کے پاس لے گیا وہاں بھی اُنھوں نے شاگردی مرزا نوشہ کی ظاہر کی اور یہ مطلع سنایا منشی صاحب کو بیکایک غصہ آگیا اور کہا او نالائق مرزا کا نام بدنام کرتا ہے۔ یہ بیچارہ شاعر نہایت شرمندہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگا۔

[له] مسٹر بائیکاٹ کے بعد مسٹر وہائیٹ (WHITE) پرنسپل ہوئے اور تاحیات پرنسپل رہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بیروں از شمار ہے ۱۲

راجہ امیر حسن خاں کا علاقہ نگرانی سرکار سے واگزاشت ہو گیا تھا اُن کو بھی شعر شاعری کا شوق تھا ان کے ایک مصاحب کا شعر مجھکو یاد ہے ؎

محفل یار سے اُٹھنے کو اُٹھے تو لیکن
درد کی طرح اُٹھے گر پڑے آنسو کی طرح[1]

میں اور غلام حسنین قدر ایک روز گومتی کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک ان کی شاعری کی رگ متحرک ہوئی اور یہ قطعہ اسی وقت کہہ ڈالا، اچھا قطعہ ہے ؎

مصور بھی لو میرے دشمن ہوئے ہیں — کہ میری شبیہیں جہاں کھینچتے ہیں
گلے پر بناتے ہیں تصویرِ خنجر — کلیجہ پہ نوکِ سناں کھینچتے ہیں

ایک روز مسٹر وہائٹ (WHITE) نے بر سر کلاس یہ بیان کیا کہ زبان اردو میبٹرڈ (حرام زادی یا دوغلی) ہے عربی فارسی بھاشا سنسکرت سے پیدا ہوئی ہیں کہ طفولیت سے بزرگوں کے سامنے بھی زبان دراز تھا بول اٹھا کہ انگریزی کب حلال زادی ہے مسٹر وہائٹ ہنس پڑے اور کہا مگر انگریزی بڑی وسیع زبان ہے ہر قسم کے مطالب نظم و نثر اس میں ادا ہو سکتے ہیں مثلاً اردو میں بلینک ورس (نظم بے قافیہ) یا ڈراما (ناٹک) ناممکن ہے میں نے پھر گستاخانہ جواب دیا کہ ڈراما کے بدلے ہمارے ہاں کشمیری نقال اور بھانڈ نقلیں کرتے ہیں۔ ہمارے شعرا نے توجہ نہیں کی مگر بلند پروازی مضامین میں انگریزی شعرا سے اگر زیادہ نہ تسلیم کئے جائیں تو کم بھی نہیں ہیں اگر اجازت ہو تو میں ایک دو مثالیں

---

[1] ایک بار کانپور میں مشاعرہ دھوم دھام کا ہوا۔ نامی شاعر شریک تھے مگر ایک کم سن لڑکے نے سب کو شرمندہ کر دیا۔ کہتا ہے ؎

انھیں لاکھ پردے لگے واے قسمت
ہوئے سامنے جب وہ آنے کے قابل

پیش کروں۔ مسٹر وہائیٹ نے کہا کہ ہم بھی سنیں۔ میں نے کہا کہ شکسپیر نے رومیوں کی زبان سے یہ مضمون بطرز دلکش باندھا ہے کہ " اگر میں تیرا (جولیٹ کا) دستانہ ہوتا تو تیرے گال کو مس کرتا " ذوق نے یہ مضمون اس طرح باندھا ہے

اُردو شاعری پر بحث

گریۂ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تل ہوتا

اس کے بعد میں نے کہا کہ اور سنیئے۔ ینگ ایک شاعر چند مصرعوں میں بہت اعلیٰ مضمون نہایت پُراثر الفاظ میں باندھ گیا ہے وہی مضمون مرزا غالب نے دو مصرعوں میں باندھا ہے

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مسٹر وہائٹ اس کا ترجمہ سن کر بہت خوش ہوئے مگر ڈراما کی بابت ضد کرتے رہے

اس ہی زمانہ میں سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) کالج میں اور بابو کیشب چندرو بابو کمار مکرجی ذیلی درجوں کے لئے مقرر ہوئے۔ چوں کہ اس وقت تک مسلمانوں میں بی۔ اے پاس بہت کم تھے سید حسین صاحب کی قدر میرے چچا مرزا عباس بیگ بہت کرتے تھے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ ان کے والد اور ان کے چچا زمانہ غدر سے قبل نواب ضیاء الدین خاں و نواب امین الدین خاں و شمس الدین خاں پسران نواب احمد بخش خاں (والیِ ریاست لوہارو و فیروز پور جھرکا) کی تعلیم کے لئے ایک ہی جگہ ملازم تھے۔ بعدہ عہدہ ہائے جلیلہ سرکار انگریزی پر ممتاز رہے۔ الغرض میں نے ڈراما کا تذکرہ سید حسن صاحب سے کیا وہ بھی ہمرائے و ہم زبان مسٹر وہائیٹ کے ہو گئے۔ میں اس وقت انٹرنس کلاس میں تھا چوں کہ

والد مرحوم کی خاص طرز تعلیم کی وجہ سے مجکو مذاق نظم و نثر کا حاصل ہو چکا تھا۔ میں نے ڈراما لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مرزا محمود بیگ انٹرنس کا امتحان دے کر تحصیلداری قصبہ موہان میں مقیم تھے تعطیلات میں میں وہاں گیا وہ دورہ پر تھے میں نے فرصت پا کر ڈراما لکھنے کی تیاری کر دی۔ غدر سے پہلے دہلی میں یہ گیت بہت گایا جاتا تھا

اردو میں ڈراما بطرز انگریزی

ساتھ سہیلی کا جھمکا سندر پانی کو جائے۔ آگے ملا مغل کا چھوکرا سندر لے ہی چھپائے

سندر کا یہ قصہ بہت مشہور تھا میں نے اکبر کے زمانہ میں اس کے سین ڈالے اور اس کو بلینک ورس یعنی بے قافیہ و ردیف نظم کرنا شروع کر دی۔ جب مرزا محمود بیگ دورہ سے واپس آئے تو میں نے مسٹر وہائیٹ اور سید صاحب کی ضد اور ہٹ کا ذکر ان سے کیا وہ بھی ہمرائے و ہم زبان ان دونوں صاحبوں کے ہو گئے اس وقت میں نے وہ نظم ان کو سنائی وہ حیران رہ گئے اور کہا کہ بھائی اب تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہ ڈراما سید حسین صاحب اور مسٹر وہائیٹ کو سنایا۔ دونوں صاحبوں نے اپنی ضد سے رجوع کیا۔ جب میں حیدرآباد گیا وہاں ایک رسالہ ماہانہ چھپتا تھا اس میں میں نے ایک قصہ بطرز ناول[1] انگریزی اس رسالہ کے واسطے لکھنا شروع کیا نواب مختار الملک مرحوم وزیر اعظم و نائب الرئیس یعنی ریجنٹ اس ریاست کے تھے انھوں نے اس ڈراما کو چھپوانا چاہا مگر اتفاق یہ ہوا کہ ایک شخص کنھیا لال نامی انگریزی داں میرے پاس آیا کرتا تھا وہ اس کو چرا لے گیا۔ صرف کچھ مصرعے اس کے یاد رہ گئے جس سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں

۱؎ اس ناول میں میں نے ایک سین شب ماہتاب بطرز ڈکنس ناولسٹ ایسی باندھی تھی کہ وزارت پناہ نے نہایت پسند فرمایا اور میری وقعت ان کی نگاہ میں اور زیادہ ہو گئی ۱۲

جانکی - کل ہم پانی بھرنے گئے تھے ؎ باغ میں ہم کو ترک ملا
وہ آگے بڑھا ہم پیچھے ہٹے ؎ کچھ اس نے کہا ہم چپکے رہے
جب سنار نے مکھ گھونگھٹ کاڑھا ترک نے دل کو اپنے سنبھالا
روتا رہا وہ گھر کو پھرے ہم

شوق کتب بینی

القصہ میں نہیں جانتا کہ میں نے انٹرنس کیوں کر فرسٹ گریڈ میں پاس کیا اس واسطے کہ مدرسہ و کالج کی درسی کتابوں پر میرا دل نہیں لگتا تھا اور کلاس میں میں نے کبھی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ بالخصوص ریاضیات میں بہت کمزور تھا۔ خدا داد بیگ انٹرنس سے فارغ ہو کر انگلینڈ بخرچ سرکار ماموں سید احمد خاں و سید محمود کے ساتھ چلے گئے تھے۔ رفیع الدین بیگ نے فرسٹ آرٹ پاس کر کے بی اے کا درس شروع کر دیا تھا۔ چچا مرحوم یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد خدا داد بیگ خاندان کا نام رکھے گا۔ بلکہ میری نسبت یہ خیال تھا کہ میرا وقت درس میں خراب جا رہا ہے میں کسی چھوٹی موٹی خدمت پر ملازم کرا دیا جاؤں۔ میری وہی حالت تھی کہ کلاس کی کتابوں کو چھوڑ کر اردو، فارسی، انگریزی نظم و نثر قصہ کہانی تاریخ وغیرہ کو بطور خود بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ چچا صاحب مرحوم کا مختصر کتاب خانہ سب پڑھ ڈالا تھا۔ تعلیم خانہ کی بھی سب قصہ کہانی کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ کالج کے کتب خانہ سے کتابیں مستعار لایا کرتا تھا۔ سیل کا ترجمہ قرآن مجید۔ مانڈرس کی تاریخ اقوام عرب و تاریخ اندلس نیز امام واقدی کی تصنیفات سب میں پڑھ چکا تھا۔ علاوہ اس کے فلسفہ کا شوق ہوا تو لاکس ہیوم کی تصنیفات کالج کے کتب خانہ سے لا کر پڑھا کرتا تھا۔ ناولوں کے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سر ولیم اسکاٹ کی نظم و نثر تصنیفات سب پڑھ لی تھیں۔ رینالڈ کی مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن پڑھ کر سید حسین

صاحب بلگرامی و بدہ و میاں وغیرہ کو بطور داستان کو سنایا کرتا تھا۔ چچا خواجہ امان کے ترجمۂ بوستان خیال سے میں نے اُردو بلکہ فارسی میں بھی بڑا فائدہ اُٹھایا مگر کالج کی کتب درسیہ میں دل نہ لگتا تھا یہی وجہ ہے کہ فرسٹ آرٹ کے امتحان میں ناکام رہا۔ بایں ہمہ لیاقت عام اور شوق کتب بینی کا مجھکو حاصل ہوگیا اور شاید میری عام لیاقت کو مسٹر وہائیٹ اور سید حسین صاحب دونوں مان گئے تھے کہ میری بہت قدر کرتے تھے۔ سوائے ان دو صاحبوں کے اور کسی کی نگاہ میں میری کچھ قدر نہ تھی۔ مزاج میں میرے بہت ضد اور غصہ کمال درجہ تھا اور ایسا نڈر تھا کہ کسی کا رعب مجھ پر نہ پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ یہاں پر قابل بیان ہے:

مہنت ہرچرنداس کے ہاں سالانہ میلا رام لیلا کا ہوا کرتا تھا اور ایسا مجمع عظیم ہوتا تھا کہ پولیس خاص طور پر وہاں کے انتظام کے واسطے متعین ہوتی۔ اس وقت لکھنؤ میں نوشیرواں جی ایک جسیم قد آور پارسی کوتوال تھا اور کپتان نوبل مجسٹریٹ اور جنرل ایل بیرو چیف کمشنر و حکمران ملک اودھ تھے۔ اس میلہ میں ہم اہل تعلیم گاہ مع گورنر بابو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ حسب دستور ہم سب اس بار بھی میلے میں گئے۔ سب ساتھی جلدی جلدی گاڑیوں سے اتر کر بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے دائرہ کے اندر داخل ہوگئے

رام لیلہ میں کوتوال سے میرا مقابلہ

میں پیچھے رہ گیا تھا۔ بمشکل تمام بھیڑ سے نکل کر جب دائرہ کے

---

[1] مہنت ہرچرنداس باوا ہزاری نانک شاہی مت کے فقیر تھے سیکڑوں فقرا اس مت کے ان کے وسیع باغ میں شب و روز پڑے رہتے تھے ان کی مہمانداری کے واسطے ایک بڑا علاقہ حکومت اسلامیہ اودھ سے عطا کیا گیا تھا۔ یہ فقرا لنگوٹی بند رہتے ہیں اپنے چیلوں میں سے کسی ایک کو اپنا جانشین نہ مقرر کر دیتے ہیں۔ مہنت ہرچرنداس باوا ہزاری کے چیلے تھے علاقہ ان کا کورٹ آف وارڈز میں لیا گیا تھا میرے کلاس فیلو تھے ۱۲

پاس پہونچا تو نوشیرواں جی بھیڑ کے روکنے میں مصروف و سدّراہ تھا چنانچہ اس نے مجھکو بھی نہ پہچان کر دھکّا دیا اور دونوں ہاتوں سے راستہ بند کردیا۔ میں جست کرکے اندر داخل ہوگیا نوشیرواں نے میرا بازو پکڑ کر پھر دھکّا دینا چاہا اس گستاخی پر میں نے ایک طمانچہ اس زور سے اس کے مُنھ پر مارا کہ شاید ایک دو بوندیں لہو کی اس کی ناک سے نکل پڑیں۔ ایک غل تمام میلہ میں مچگیا اور قبل اس کے کہ وہ مجھکو گرفتار کرے میں بے تکلف بکمال اطمینان آگے بڑھگیا مگر گورنر بابو اور مہنت نے کو توال کو بطور خاص ہموار کرلیا۔ بعد ختم میلا جب ہم قیصر باغ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ زیر دفعہ فلاں تعزیرات ہند کو توال نے استغاثہ مجسٹریٹ کے پاس کردیا اور مجسٹریٹ نے میری گرفتاری کا حکم جاری کردیا۔ گورنر بابو نے گھبرا کر چچا صاحب مرحوم کو اطلاع دی وہ مرحوم فوراً جنرل بیرو کے پاس گئے اور کل حال بیان کردیا۔ خلاصہ ایں کہ جنرل بیرو اور کپتان نوبل نے بظاہر کمال ناراضی اور مستعدی سزا دینے پر جتائی مگر معاملہ کو رفع دفع کردیا۔ دوسرے تیسرے روز جنرل بیرو تعلیم گاہ میں آئے اور یہ سزا دی کہ دو ہفتہ تک میں بازی گاہ میں شریک نہ ہوں اور گھر نہ جانے پاؤں۔ اسی طرح سے ایک پادری سے میرا جھگڑا ہوا اس کا گرجا بازی گاہ سے ملحق تھا اتوار کے روز وہ عبادت گاہ میں مشغول تھا اور ہم کھیل رہے تھے اس جھگڑے کا یہ انجام ہوا کہ اس مکان سے یہ گرجا اُٹھا دیا گیا اور وہ مکان بھی شامل تعلیم گاہ کردیا گیا۔

میری داستان زندگی کا دوسرا ورق

مگر قبل ازایں کہ میں اس زندگی کا ورق شروع کروں کچھ بھولے بسرے حالات زمانہ غدر ماقبل ومابعد بھی تحریر کردینا بعید از مطلب نہ ہوگا۔

غدر سے پہلے کے حالات ماقبلِ غدر میرے بڑے ابّا مرزا عاشور بیگ شہید بہت حسین و جمیل آدمی تھے۔ نہایت گورے بلکہ بھبوکا رنگ، آنکھیں سبزی مائل کرنجی۔ ریش و بروت و موئے سر گہرے بھورے اور سنہرے تھے۔ قد نہایت بلند و بالا۔ دوہرا جسم کسرتی، سانچے میں ڈھلا ہوا۔ عربی، فارسی، ہئیت و نجوم و ہندسہ میں مثل اپنے والد کے مشہور آفاق تھے۔ غصہ ان کے مزاج میں کمال درجہ تھا۔ کل اہلِ خاندان سوائے دادا مرزا نوشہ سب ان سے مرعوب تھے۔ بوجہ وفورِ علوم کچھ ذراسی جنون کی لٹک بھی تھی جس چیز کا شوق کرتے تھے اُس میں محو ہوجاتے تھے اور انتہا تک اُس کو پہنچاتے تھے۔ ادویہ کا شوق ہوا تو معاجین، جوارشات، حبوب وغیرہ شیشوں میں بھری طاقوں پر دھری رہتی تھیں اور یہ سب بدست خود طیار کرتے تھے۔ کیمیا کا شوق ہوا تو ہجوم کیمیا سازوں کا باہر دیوان خانہ میں شب و روز جمع رہتا تھا اور یہ سب قورما، پلاؤ، کباب، حلوے، مربّے وغیرہ مزے مزے کے کھانے چکھا کرتے تھے۔ ہر قسم کے ست اور کشتے طیار ہوا کرتے تھے۔ ایک صبح کو بڑے ابّا بہت خوش و بشاش محلسرا میں آئے اور بڑی امّاں اور والدہ کو ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاندی کا دکھایا کہ یہ ہم نے بنایا ہے اس چاندی سے ایک تختی نقش کندہ بنا کر میرے گلے میں ڈالی۔ یہ تختی میرے گلے میں سن بلوغ تک رہی۔ لکھنؤ میں وہ گم ہوگئی۔ اسی طرح شیشہ گری کا شوق ہوا تو ہر قسم کے ظروف بنا ڈالے۔ شاہ رفیع الدین[1] کے مرید ہوئے تو تمام رات ہُو حق کے نعرے لگاتے رہتے۔ مرتبۂ شہادت ان کو ملا ہے ان کی مغفرت میں شک نہیں۔

---

[1] شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پاس چند دیگر اہلِ خاندان کے ساتھ دہلی میں شہر کے جانب غرب چھوٹی اہلا کے قریب چبوترہ پر دفن ہیں۔ اس محلہ کا نام گشن گنج ہے۔ رفیع الدین بیگ اپنے چھوٹے بیٹے کا نام اسی مناسبت سے رکھا تھا۔ شاہ صاحب کے مزار کے سرہانے ایک پتھر پر شاہ صاحب کے کچھ حالات کندہ کئے ہوئے ہیں جو اب مشکل سے پڑھے جاتے ہیں۔

نواب ضیاء الدولہ | نواب ضیاء الدولہ فرزند حکیم نواب رکن الدولہ وزیر وقت تھے۔ جسیم و شحیم میانہ قد، گندم رنگ، ریش و بروت و موئے سر سیاہ و سفید، کثیر الاولاد نہایت خوش مزاج وسیع الاخلاق، کثیر الاملاک تھے بلکہ یہ بات ان کے والد مرحوم کی دہلی میں مشہور تھی کہ "میں نے دولت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں" لیکن غدر میں تمام گھر ان کا دھڑلے سے لٹا۔ خاکیوں اور تلنگوں اور گوروں نے تنکا تک نہ چھوڑا۔ اور املاک اور جائداد کی یہ حالت ہوئی کہ ان پر شبہ بغاوت کا قائم ہو کر کل جائداد سرکار میں ضبط ہو گئی اور فاقہ کشی کی نوبت پہونچ گئی بالآخر لکھنؤ میں بامید استمداد چچا مرزا عباس بیگ مرحوم اپنی ہمشیرہ یعنی میری بڑی چچی مرحومہ کے پاس چلے آئے اور چند سال یہاں مقیم رہے۔ ان کی حکایت بھی عبرت خیز و قابل بیان ہے یعنی جب یہاں کار برآری نہ ہوئی تو پھر دہلی واپس گئے۔

اس زمانہ میں **شاہ عبدالعزیز** معروف بہ چھوٹے حافظ جی اور اخوند جی بقید حیات تھے۔ تمام شہر کو ان کی ذات بابرکات سے فائدہ عظیم پہونچ رہا تھا۔ ہر مریض جسمی و مبتلائے رنج روحی شاہ صاحب سے استمداد کرتا اور فائدہ اٹھاتا تھا[1]۔ نواب ضیاء الدولہ ایک روز تنگ دستی سے عاجز ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اب تو یہ نوبت پہونچی ہے کہ

---

[1] والدہ صاحبہ مرحومہ نے بھی شاہ صاحب کی کرامت کی ایک نقل مجھ سے فرمائی یعنی بچپن میں میں ایسا شدید بیمار پڑا کہ امید زندگی کی نہ رہی تھی۔ والدہ ماجدہ نے شاہ صاحب سے امداد و دعا طلب کی شاہ صاحب نے ایک فتیلہ عنایت کیا اور کوئی اسم جمالی ورد کے واسطے بتایا کہ اس فتیلہ کو روشن کر کے اس کی روشنی میں سو جاؤ اور جو خواب دیکھو مجھ سے کہدو۔ والدہ ماجدہ نے خواب میں دیکھا کہ بر سر بازار ایک ہجوم آدمیوں کا ہے اور ایک شخص ایک عورت کو کفن در دست لئے جاتا ہے۔ والدہ ماجدہ نے کسی سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے اس نے جواب دیا کہ ہم اس کو پھانسی دینے کے واسطے لئے جاتے ہیں۔ یہ خواب حضرت کے پاس کہلا بھیجا۔ آپ نے فرمایا کہ بچے کی بلا ٹل گئی وہ اچھا ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آپ کی مسجد میں آپڑوں اور جاں بحق تسلیم کردوں۔ شاہ صاحب یہ سُن کر بہت گھبرائے
اور کہا کہ نواب صاحب آپ کل تشریف لائیے۔ الغرض دوسرے روز نواب صاحب پھر
پہونچے اور زہر کھانے اور جان دے دینے کے الفاظ زبان پر لائے۔ شاہ صاحب نے
فرمایا کہ نواب صاحب آپ لاہور جائیے۔ یہ سُن کر بکمال حالت مایوسی میں نواب صاحب نے
کہا کہ افسوس آپ بھی مجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ اے صاحب میں نانِ شبینہ تک کو محتاج ہوں
یہ دور دراز سفر کس طرح کروں وہاں قیام کس طرح کروں کوئی وہاں آشنا ملاقاتی واقف کار
نہیں کہاں اُتروں، کس سے استمداد کروں۔ غربت اور اس پر تنگ دستی۔ اب میں آپ کی
مسجد میں آپڑتا ہوں۔ شاہ صاحب چُپ رہے اور بعد مراقبہ یہ کہا کہ آپ سفر کا قصد کریں
اللہ تبارک وتعالیٰ سب آسان کردے گا۔ نواب صاحب مایوس و محزول وہاں سے گھر واپس آئے
اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا تماشا دیکھو کہ ایک ساہوکار قدیم نواب صاحب کے
پاس کبھی کبھی آیا کرتا تھا اتفاقاً اُس دن بھی آیا اور نواب صاحب کو مغموم دیکھ کر اس نے
کہا کہ افسوس آپ کی املاک ناحق ضبط ہوئیں۔ آپ کیوں نہیں کوشش اور جستجو کرتے۔ نواب
صاحب نے بے مزہ ہو کر جواب دیا کہ یہاں کھانے کو نہیں ہے جستجو کس طرح ہو سکتی ہے۔
اس ساہوکار نے کہا کہ نواب صاحب میں آپ کے گھر کا نمک پروردہ ہوں اور آپ کے
گھر سے ساہوکار بنا ہوں۔ آپ مستعد ہو جائیے جو خرچ ہوگا میں دوں گا۔ خلاصہ این کہ روپیہ
پیسے سے جب اطمینان ہو گیا تو نواب صاحب مع اپنے فرزند نواب بشیر الدین احمد خاں[1]
لاہور پہونچے۔ دوپہر دن کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور یہ رائے قرار پائی کہ پہلے سیدھے

---

[1] یہ حیدرآباد میں نواب سرور الملک بہادر کی مدد سے نوکر ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی جو سوم تعلقدار ہو گئے
تھے ان کی شادی میری خالہ زاد بہن سے ہوئی تھی ۱۲ ذوالقدر جنگ

کچہریوں کی طرف چل کر کچھ حالات وکلا وغیرہ کے دریافت کرلو۔ پھر قیام کا فکر کریں گے۔
الغرض دریافت کرتے کراتے یہ سیدھے چیف کورٹ یعنی صدر محکمہ میں اس وقت پہونچے کہ
کچہری برخاست ہوئی تھی اور چیف صاحب یعنی صدر حاکم اپنی بگھی پر سوار ہو رہا تھا۔
نواب صاحب بھی اپنی گاڑی سے اتر کر اس خیال سے کھڑے ہوئے تھے کہ کسی سے کچھ
حالات دریافت کریں صدر حاکم کی گاڑی کے پاس جا کر بہت ادب سے جھک کر اُس کو سلام
کیا۔ اول تو الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ علاوہ اس کے آخر نواب تھے، چہرہ سے شان و
شوکت، شرافت نجابت برس رہی تھی صدر حاکم یکایک ان کی طرف مخاطب ہو گیا اور
کہا کہ "ول تم کچھ کہتا ہے" نواب صاحب کے مونھ سے نکلا کہ جی ہاں دو ایک امور
ضروری عرض کرنا چاہتا ہوں۔ صدر حاکم اُلٹا اپنے کمرے میں چلا گیا اور ان کو بلا لیا جب
اُنھوں نے اپنی رام کہانی شروع کی۔ وہ بولا "ول یہ مقدمہ کسی وکیل کے پاس لے جاؤ"
نواب صاحب نے بچشم پرنم کہا کہ "میں غریب الوطن ہوں یہاں کسی کو نہیں جانتا" صدر حاکم نے
چپراسی کو بلا کر کہا کہ "دیکھو ریٹی گن صاحب ہے تو ہمارا سلام بولو" ریٹی گن صاحب
فوراً چلے آئے معلوم نہیں صدر حاکم نے انگریزی میں کیا کہا وہ تو چلا گیا۔ بیرسٹر صاحب ان کا
ہاتھ پکڑ کر باہر آئے اور کہا کہ چیف جج صاحب نے آپ کی سفارش کی ہے اور اپنی نشست گاہ
میں لے جا کر ان کا حال سنا اور کہا کہ "ہم تمھارا مقدمہ لڑے گا۔ تم جب جیت جائے، تب
ہمارا فیس دے دینا" الغرض مقدمہ چلا اور یہ اس میں جیتے۔ جائداد املاک سب ان کے
ہاتھ لگیں۔ دہلی میں پھر امیر دولت مند بن گئے۔ یہ بھی مر گئے، اخوند جی کا بھی وصال ہو گیا
حکایت باقی رہ گئی۔

دہلی اس وقت یعنی قبل غدر خوب آباد تھی گو بادشاہت برائے نام رہ گئی

تھی اور ڈھنڈوری میں یہ الفاظ پکارے جاتے تھے[1] "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔ تاہم، بادشاہ کا دم غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ درباری قواعد اکبر کے وقت سے اب تک جاری تھے۔ بہادر شاہ کو صرف لاکھ روپیہ ماہوار من جانب کمپنی ملتے تھے شاہزادگان وسلاطین زادوں کے وظیفے علی استحقاق ملتے تھے اور شاہی کارخانجات کے اخراجات ادا ہوتے چوبدار، خواص، باری دار وغیرہ ملازمین کی تنخواہ تقسیم ہوتی تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں وزیر تھے۔ مفتی خلیل اللہ خاں[2] کے بعد مفتی صدرالدین خاں ان کے شاگرد

---

[1] اس وقت امرائے عظام میں نوابانِ لوہارو نواب امین الدین خاں وضیاءالدین خاں وشمس الدین خاں تھے آخر الذکر اور ان کی ہمشیر کے حالات میں دوسری جگہ لکھ آیا ہوں کہ یہ ایک محبوبہ کے بطن سے تھے قاعدہ کلیہ ہے کہ جب عشق چرّاتا ہے تو عقل خبط ہو جاتی ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے اس محبوبہ زادہ کو ریاست لوہارو اور فیروزپور جھرکا دونوں دے دیں اور خاص زادوں کو محروم کردیا۔ بالآخر بعد شہادت شمس الدین خاں نواب امین الدین خاں برادر کلاں رئیس صرف ایک ریاست لوہارو کے ہوئے اور فیروزپور جھرکا ضبط سرکار کمپنی بہادر ہو گیا۔ یہاں پر ایک نقل عجیب مجھکو یاد آئی یعنی کسی محفل عقدِ نکاح میں نواب امین الدین خاں مدعو تھے۔ اس محفل میں ایک شخص مفلوک میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے اُن کے پہلو میں آن بیٹھا۔ اس لالچ سے کہ حصہ عمدہ ملے گا۔ اتفاقاً اسی سے ایک گوز سرزد ہوا۔ نواب نے مڑ کر اس کو گھورا۔ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور میرا نام لے دیں۔

علاوہ ان نوابوں کے راقم کے خاندان میں نواب امین الدین خاں عرف آموجان و فضل اللہ خاں و انعام اللہ خاں نہیالی اور نواب دبیرالدولہ مرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ اور نواب علی بخش خاں و مرزا عبداللہ بیگ فرزند نواب جوّادالدولہ میرزا افضل بیگ خاں وکیل السلطنت اور نواب ضیاءالدولہ فرزند نواب رکن الدولہ وزیر بادشاہ وقت تھے۔ دوسرے امرا مجھکو یاد نہیں رہے۔ الغرض ان امرا کے باعث دہلی آباد اور باشندگان شاد عجب عالم بہوشی میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ میرا امارت زحل نے بجائے اپنی اداے خدمت کے سایۂ نکبت ڈالا۔ اور ترکِ فلک نے اپنی سپاہ باغیان اس رشک عالم پر مسلط کردی۔ اور کوئی چھجو خاں اور کوئی ماتادین اپلے گھلے شہر پہ قابض اور متصرف ہوگئے ۱۲

[2] راقم کے نانا ۱۲

مفتی شہر تھے۔ اس لاکھ روپیہ میں سے اہل شہر کو بھی وظیفے اور تنخواہیں ملتی تھیں۔ کچھ ایسی برکت اس لاکھ روپیہ میں تھی کہ دلّی والوں کو تلاش معاش کے واسطے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی چنانچہ میاں ذوقؔ کہتے ہیں ؎

ہے دکن میں ان دنوں گرچہ بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اہل حرفت وصنعت سے لے کر شعرا اور علماء و مشائخ ایسے جمع ہو گئے تھے کہ دور دور ممالک تک اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مثلاً مشائخ میں شاہ رفیع الدین و شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما۔ فقرا میں میاں فدا حسین رسول شاہی۔ شاہ عبد العزیز اور چھوٹے حافظ جی معروف بہ اخوند جی رحمۃ اللہ علیہما۔ علما میں مفتی صدر الدین خاں، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مولانا صہبائی۔ شعرا میں شیخ ابراہیم ذوقؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ۔ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ معروف بہ مرزا نوشہ[1]۔ مصوروں میں ہٹّوں کے کوچہ کے مصوّرین، مہرکن بدر الدین خان، روغن وعطر فروش میں دریبہ والا گلاب گندھی۔ رکابداروں میں چھوٹے مرزا۔ درزیوں میں شجاعت بیگ۔ زردوزوں میں مرزا علی بیگ۔ سپاہ پیشہ میں طالع یار خاں و رسالدار سمند خاں۔ الغرض اس وقت دہلی میں ہر فن اور ہر ہنر ہر پیشہ کے لوگ

---

[1] یہاں پر ایک لطیفہ بھی قابل بیان ہے مرزا غالب کی مولانا فضل حق سے کمال دوستی تھی ہر شب کو معمولاً مرزا مولانا کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار رزیڈنٹ تھے باہر صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے ایک رنڈی بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں۔ کھڑی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں مرزا بھی لالٹین لئے آگے آگے پہونچے مولانا نے سر اٹھا کر کہا کہ ؎

بیا برادر آ رے بھائی

مرزا نے کہا دوسرا مصرعہ بھی پڑھ دیجئے کہ دیر سے منتظر کھڑی ہے۔ دوسرا مصرعہ یہ ہے ؎

بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

چابک دست نادر الوجود جمع ہو گئے تھے۔ بازاروں میں ایسی رونق تھی کہ شہر دُلھن بنا ہوا تھا۔ تیسرے پہر کو چاندنی چوک میں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر طرف کٹورے کی جھنکار سُنائی دیتی تھی۔ شام کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گُدڑی بازار لگتا تھا۔ جہاں امرا بھی آ آ کر گرم کباب کھایا کرتے تھے۔ اخلاق اہل شہر کے اس زمانہ میں بُرے نہ سمجھے جاتے ہونگے۔ رنڈیوں کی بڑی قدر تھی۔ سوائے ملّا، مشائخ[۱] کے باقی اُمرا شرفا خوش باش کم ایسے تھے جو رنڈیوں سے میل جول نہ رکھتے ہوں۔ ہندو بھائی بھی سنت راجہ بیربل اور راجہ ٹوڈرمل پر قائم مسلمان بھائیوں سے بقول شیخ راجہ چولی دامن کا ساتھ رکھتے تھے اس زمانہ میں ٹوپی کا رواج کم اور پگڑی کا رواج زیادہ تھا، باہم پگڑی بدلا کرتے تھے اور اس کو پگڑی بدل بھائی کہا کرتے تھے۔ اور یہ رسم اکبر کے زمانہ سے جاری تھی چنانچہ راجہ بیربل اور فیضی اور راجہ ٹوڈرمل اور ابوالفضل اور مہاراجہ جے پور مخاطب بہ مرزا راجہ اور نواب خانخاناں پگڑی بدل بھائی تھے۔ رفتار، دستار، گفتار میں کوئی فرق نہ تھا۔ اکبر کے زمانہ کا جامہ و نیمہ ترک ہو گیا تھا۔ اور چولی دار انگرکھے بھی ترک ہوتے جاتے تھے ان کی جگہ پر نیچے گریبان کے انگرکھے بغیر چولی کے پہنے جاتے تھے۔ مسلمان سیدھی طرف اور ہندو اُلٹی طرف پردہ رکھتے تھے۔ بس یہی ذریعہ تمیز دونوں میں رکھا گیا تھا۔ اُردو

---

[۱] ایک امر بالخصوص قابل بیان یہ ہے کہ کل باشندگان شہر سر کے بال کان کی لَو تک رکھتے تھے۔ الّا۔ فقرا ملّا و مشائخ جو بعض تا کمر رکھتے تھے اور اکثر ہر جمعہ کو منڈوایا کرتے تھے، ہمارے زمانہ میں بہ پیروی اہل یورپ سر کے بال خشخاشی کترے ہوئے رکھے جاتے ہیں اسی طرح ڈاڑھی منڈوانا نہایت بے حیائی اور شرم کی بات سمجھی جاتی تھی۔ عام وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی چڑھائی جاتی تھی اور مونچھیں اس طرح رکھتے تھے جیسے دو بچھو ڈنک والے بیٹھے ہوئے ہیں اس زمانہ میں ڈاڑھی منڈوائی جاتی ہے اور مونچھیں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ گویا دو چوہے دم اُٹھائے لیٹے ہوئے ہیں ۱۲

بولتے۔ مگر خط و کتابت و تصنیف تالیف فارسی زبان میں جاری تھی اور ان میں ہنود مسلمانوں
سے دعوائے ہمسری رکھتے تھے۔ چنانچہ انشاء مادھو رام اور مینا بازار وغیرہ مسلمانوں کے
مکتبوں میں بھی جاری تھیں۔ ہولی، دسہرہ، دیوالی، عید، بکرعید، میں باہم محافل و مجالس میں
شریک رہتے تھے۔ غدر سے پہلے دسہرہ یا ہولی کے ایام میں فتح پوری کے محلہ میں ایک
جلسہ ہوتا تھا جس کا نام کفر کچہری تھا۔ ایک شخص میلی کچیلی پھٹی پرانی کرتی پتلون پہن کر ٹوٹی
پھوٹی ہیٹ سر پر رکھ کر گویا رزیڈنٹ بنتا تھا۔ میز پر قلم دوات کاغذ اور خود کرسی پر بیٹھتا تھا۔
باقی حضرات کوئی سررشتہ دار کوئی محرر اور چپراسی وغیرہ پورا عملہ کچہری کا بنتا تھا۔
مقدمات دل لگی کے دائر ہوتے تھے۔ ٹیسو دھوم دھام سے نکلتے تھے۔ لڑکیاں گھگریاں
نکالتی تھیں۔ ان ایام میں غلام رسول خاں ایک سنگ دل جابر آدمی کوتوال شہر تھا۔ ٹیسو
نکالنے والوں نے اس کے نام پر تک جوڑی تھی ایک بول اس کا مجھکو یاد ہے ؎

"ہمارے ٹیسو نے کھائی تھی پیول۔ اس میں سے نکلا غلام رسول"

اس تک بندی کو بانی کہتے ہیں۔ اس وقت کے انگریزی حکام بھی بے تکلف ملتے جلتے
تھے۔ رزیڈنٹ شب کو کابلی بلند نوک دار ٹوپی بر سر چوڑا آستینوں کا کرتا غرارہ دار
پائجامہ پہن کر مسند پر بیٹھتا تھا پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ امرائے شہر جمع ہوتے تھے
باہم حرف و حکایات شعر شاعری اور سب سے زیادہ شطرنج بازی ہوتی تھی۔ سلاطینوں[۱]
میں مرزا کرامت شاہ اپنے زمانے میں فرد فرید شاطر تھے۔ اہل شہر انگریزی حکام سے ہمسری
کے ساتھ ملتے تھے۔ مسٹر فطز پیطرک جو رفتہ رفتہ سر ڈلس فطز[۲] پیطرک ہوئے غدر سے پہلے
کسی عدالتی عہدہ پر مقرر تھے۔ اکثر اوقات نواب امین الدین خاں و نواب ضیاء الدین خاں

---

[۱] آل شاہی کو سلاطین کہا کرتے تھے ۱۲ [۲] حیدرآباد بزمانہ وزارت نواب آسمان جاہ ۱۸۹۰ء میں رزیڈنٹ تھے ۱۲

والیانِ ریاست لوہارو کے ہاں آکر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ یہ صاحب چند روز کے واسطے حیدرآباد دکن میں رزیڈنٹ رہے تھے مجھ پر بہت مہربان تھے پھر ملک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے اور وہاں نواب لوہارو حال کے ساتھ بڑے بڑے سلوک کئے۔ الغرض ہر فرقہ میں باہم معاشرت بے تکلفانہ قائم تھی۔ ایک انگریزی حاکم نے ایک میواتنی (سَرون) کے ساتھ نکاح کیا تھا اس کا بھی گیت بہت گایا جاتا تھا جس کا ذکر دوسری جگہ مسطور ہے۔ سَرون کا بھائی دہلی کے بازاروں میں خوب اکڑ کر چلا کرتا تھا۔

پھول والوں کی سیر مقام مہرولی مزار حضرت قطب عالم سیدالسادات قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ پر دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ پنکھا شان شوکت سے چڑھتا تھا۔ بادشاہ بھی مع جلوس رونق افروز ہوتے تھے۔ عرائس بزرگان دین و اولیاء اللہ تعالےٰ قابل دید ہوتے تھے۔ مہندی حضرت سلطان الہند غریب نواز عطاے رسول حبیب اللہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ثم اجمیری جلوس کے ساتھ اجمیر شریف روانہ ہوتی تھی۔ شہر میں روزانہ بعد عصر ایسا مجمع کثیر عوام و خواص کا ہوتا تھا کہ شانہ سے شانہ لڑنے کی نوبت آتی تھی۔ گھوڑے گاڑی یعنی بگھی فٹن وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ امرا و خوش حال گھوڑوں ہاتھیوں، تانگوں پر یا ہوادار تام جھام پینس و پالکی پر سوار ہوتے۔ میں نے کسی یورپین سیاح کی تصنیف میں پڑھا ہے کہ چاندنی چوک کا مثل اور دلّی کے انگرکھے کی نظیر بڑے بڑے پایہ تخت ہائے یورپ میں بھی نہ تھی۔ بوقت مغرب کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گدڑی بازار لگا کرتا تھا۔ ٹِکے کباب چٹپٹے مزیدار اور سونٹھ کے پانی کے مزے مثل۔ بچے آٹا لوگ انگوچھے سر پر باندھے ہوئے دلّی کا انگرکھا زیب بدن، بلکہ ذی مرتبت بھلے مانس بھی چکھا کرتے تھے۔ یہ جوبن والا شہر تھا مگر بقول شخصے ع

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی ؟

قلعہ والوں کے اخلاق نہایت بد تھے۔ سوائے بادشاہ باقی کل شاہزادے و شاہزادیاں سلاطین[1] حرام و حلال کے احکام سے ناواقف تھے۔ اور بیشتر ان میں سے جاہل مطلق تھے البتہ زبان اُردو قلعہ کی مستند تھی۔ عیدین شہر میں دھوم دھام سے ہوا کرتی تھیں۔ بادشاہ مولا بخش نام ہاتھی پر عیدگاہ برائے نماز جایا کرتے تھے۔ یہ ہاتھی ہمیشہ مست رہا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ناصر الدولہ والی ملک دکن نے نذر گزرانا تھا۔ بچے اس سے نکّی لاٹا کھیلا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ کو انگریز دلّی سے لے گئے مولا بخش نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور بالآخر بھوکا پیاسا مر گیا۔ الغرض دہلی ایسی آباد تھی کہ امرا و خوش حال، علماء و فقرا، ملازمت پیشہ و اہل حرفت اپنی اپنی حالت میں نہایت بے فکر و آسودہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک گروہ اس زمانہ میں عجیب پایا جاتا تھا جس کو "آغا" یا مغل بچے کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ مغل بچے قدیم امرا کی اولاد نہ پڑھے نہ لکھے کاہلی کی وجہ سے کسی پیشہ یا نوکری کے قابل نہ تھے مگر بوجہ شرافت خاندان ہر صحبت ہر محفل و مجلس میں باریاب تھے اور اہل مقدرت کی فیاضی پر زندگی گزران تھی۔ خوش رو، خوش جسم، خوش وضع، خوش رفتار، خوش گفتار، لطیفہ گو، بامروت، باوفا، گرم مزاج، زود رنج۔ یہ ان کے صفات تھے۔ افسوس یہ گروہ مفقود ہو گیا۔ صرف ایک فرد کبیر السن بہمہ صفات مذکورہ باقی رہ گیا تھا۔ برادرم محمد اکرام اللہ خاں

---

[1] سلاطین وہ شہزادے تھے جن کو حق تخت نشینی نہ تھا۔ ان کا ختنہ ہوا کرتا تھا مگر مشہور ہے کہ حق دار شہزادوں کا ختنہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ گو لفظ مرزا سب سلاطین و شہزادے اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور سوائے اُن کے کسی کو اس لفظ کے استعمال کی اجازت قلعہ معلیٰ میں نہ تھی البتہ لفظ نواب کی اجازت تھی اس ہی طرح حیدرآباد دکن میں کسی کو لفظ نواب کی اجازت نہ تھی صرف حضور بندگان عالی کے واسطے یہ لفظ مخصوص تھا ۱۲

مرحوم اس کے خبرگیراں تھے۔ یہاں پر ایک حکایت مجکو یاد آئی بادشاہ کی انّا کے بیٹے کو شوق
حج و زیارات دامن گیر ہوا اس کی والدہ نے رقم کثیر نذر کی۔ آکا چوک میں کھڑے ہو گئے اور
ہر آیند و روند سے گلے ملنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آکا یہ کیا بات ہے۔ فرمایا کہ ہم حج بیت اللہ کو
جا رہے ہیں۔ بعد چند روز کے آکا پھر شہر میں دکھائی دیئے۔ دریافت حال پر ارشاد فرمایا کہ بھئے
ہم تو جاتے تھے مگر واقف کاروں نے ہم سے کہا کہ کعبہ شریف میں مغل بچوں کا کوئی مصلیٰ ہی
نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی والدہ ان سے ناراض ہو گئیں اور روپیہ روز جو ان کو دیا کرتی تھیں
وہ بند کر دیا۔ آکا نے ایک عرضی بادشاہ کو لکھی کہ ’’اصیل مرغی جو روز انڈا دیا کرتی تھی اب
کڑک ہو گئی‘‘۔ بادشاہ نے خود روپیہ روز جاری کر دیا۔

ایک آکا بڑے چچا خواجہ جان مرحوم کے ہاں رہتے تھے ایک روز سہ پہر کے وقت
اپنے حجرے کے باہر بیٹھے ہوئے سلفے کا دم لگا رہے تھے۔ بیٹا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں
بھنگ کے نشہ میں چور تھے اور ہم سب چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک آکا نے بیٹے
سے کہا کہ جان پدر آج جی چاہتا ہے کہ عربی بولیں۔ بیٹے نے کہا کہ جو حکم۔ آکا نے
کہا کہ (’’انا کم وکاہی‘‘) بیٹے نے جواب دیا کہ (’’بیوی بچو کا ہی‘‘) آکا بہت خفا ہوئے
اور کہا کہ او نالائق ’آنا‘ اور ’کم‘ تو دو لفظ عربی کے ہیں پر ’بیوی بچو‘ میں کونسا لفظ
عربی ہے۔ ان کا مطلب ’’انا کم چیزاں چہ‘‘ تھا اور کچھ قدرے قلیل فارسی بھی پڑھے ہوئے تھے
فارسی بولنے کا بڑا شوق تھا۔ ماہ رمضان میں ایک روز ان پر روزہ رکھنے کی فرمائش کی گئی
دوسرے دن صبح کو دیکھا کہ آکا اپنے حجرے کے آگے بھنگ[1] گھونٹ رہے ہیں اور سلفے کا دم
لگا رہے ہیں اور حجرہ میں سے قاؤں قاؤں کی آواز آ رہی ہے لوگوں نے کہا کہ آکا آج تو تم

---

[1] شہر میں بھنگ کا بہت رواج تھا افیون و شراب سے عوام تک نفرت رکھتے تھے سوائے نفرا رسول شاہی مریدان میاں
(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

روزہ سے ہو یہ بھنگ کیوں گھٹ رہی ہے۔ فرمایا کہ بھائی چپاں چہ میں نے رات کو نیت روزہ کی
باندھی مگر میری سحری چپاں چہ یہ کتا کھا گیا۔ چپاں چہ میں نے اس کو چھت پہ ہاتھ پاؤں باندھ کر
لٹکا دیا کہ تو نے چنانچہ سحری کھائی تو ہی چپاں چہ روزہ بھی رکھ۔

خلاصہ ایں کہ قلعہ میں فاقہ مستی و عیش و عشرت کی دھوم دھام، شہر میں علما و مشائخ ورد و وظائف و قال اللہ و قال الرسول میں مست۔ اہل حرفہ و اہل صنعت اپنے فنون میں منہمک۔ ایک عالم بے خبری و بے پروائی کا شہر میں چھایا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا علم بھی نہ تھا کہ شہر کے باہر دنیا کا کیا رنگ ہے۔ کبھی کبھی دربار ہوتا تھا تو رزیڈنٹ جامہ و نیمہ پہن کر ٹوپی پر سفید کپڑا[۱] موسوم بہ پگڑی باندھ کر کفش پہن کر جریب ہاتھ میں لے کر حاضر ہوتا تھا۔ آداب گاہ پر سات تسلیمات اور چودہ کورنشات بجا لاتا تھا۔ شاہزادے اور امرا حاضر ہو جاتے تھے۔ بادشاہ تخت پر برآمد ہوتے تھے حاضرین سب دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ اگر رزیڈنٹ کو کچھ عرض کرنا ہوا تو عرض کر لیتا تھا ورنہ معمولی آب وہوا و سیر شکار کی باتیں ہو کر دربار برخاست ہو جاتا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ ہند کی سلطنت مغلیہ ابھی قائم ہے۔ باوجودیکہ قلعہ کے دروازہ پر ایک انگریز قلعدار مسلط تھا قلعہ گویا جیل خانہ و قلعدار داروغہ جیل تھا۔ ایک روز دربار میں

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

فدا حسین جنھوں نے یہ نیا فرقہ فقرا قائم کیا تھا۔ سر، ڈاڑھی، مونچھ، بھویں سب صفاچٹ نشہ میں چور یا ہو کا دم لگاتے تھے طریق عبادت اس فرقہ کا معلوم نہیں مگر لوگ ان کی مثل فرقہ سدا سہاگن و دیگر فرق ملامتیہ کی بہت عظمت کرتے تھے میاں فدا حسین غدر سے بہت زمانہ قبل الور چلے گئے تھے کہتے ہیں کہ ان ہی کی دعا کی برکت سے نواب امین اللہ خاں عرف اموجان اور اُن کی بھائیوں کو رشد الور میں ہوا۔ فرق ملامتیہ سورۂ مبارک "عبس وتولیٰ" پر اپنی بنا بتاتے ہیں ۱۲

(۱) یہ کپڑا اب تک یورپین لوگ اپنا فخر سمجھ کر اپنی ٹوپی پر باندھتے ہیں اور اس کو پگڑی کہتے ہیں ۱۲

نواب ابراہیم علی خاں رکن خاندان لوہارو بھی حاضر تھے کہ رزیڈنٹ نے آگے بڑھ کر عرض کی کہ تعجب ہی کہ نواب کا صرف دوہرا جسم ہے مگر ان کی طاقت کی شہرت بہت ہو رہی ہی اگر حکم قضا شیم شرف صدور پائے تو ؎

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

بادشاہ نے نواب کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ اتا بڑے صاحب کیا کہتے ہیں۔ نواب نے دست بستہ عرض کیا کہ غلام حاضر ہے۔ خلاصہ ایں کہ ایک چوکی کلاں سنگ سیاہ کی سامنے پڑی ہوئی تھی نواب نے رزیڈنٹ سے کہا کہ آپ اس پر بیٹھ جایئے اور مع رزیڈنٹ چوکی کا پایہ پکڑ کر قد آدم اُٹھایا مگر ساتھ ہی خون کی قے ہوئی اور گھر تک نہ پہونچے تھے کہ جان بحق تسلیم ہوئے۔ اس ہی طرح حسب فرمائش رزیڈنٹ ایک بار سمند خاں رسالدار نے جنگلی شیر کو پا پیادہ اور تلوار اور بغدہ چھرے سے مارا۔

الغرض دہلی والے بے فکری سے زندگی بسر کرتے تھے اور حق یہ ہے کہ بعد عالمگیر کے شہر دہلی میں کسی بادشاہ کے وقت میں ایسا مجمع اہل علم و اہل کمال کا کبھی نہ ہوا ہوگا جیسے اب اجڑتے وقت تھا جس طرح چراغ بجھتے وقت بھڑک اُٹھتا ہے دہلی بھی اپنی آخری روشنی دے کر خاموش ہو گئی۔ بے شمار شہر آشوب دہلی کی بربادی پر لکھے گئے مگر مفتی صدرالدین خاں کا شہر آشوب نہایت پُر درد[1] تھا اور مرزا غالب تو یہ کہہ گئے کہ ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

---

[1] ان کا صرف ایک شعر مجھ کو یاد رہ گیا۔ شاہزادیوں کی تباہی بیان کرتے کرتے لکھتے ہیں کہ ؎

ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا ٭ سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

بادشاہ نے بھی ایک غزل کہی تھی جو اس وقت خوب گائی جاتی تھی۔ مجکو صرف اس کا یہ مصرعہ یاد رہ گیا ہے ؎

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

ایک اور شعر ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ؎

عیسیٰ میاں گدھوں کو ذرا اپنے باندھ لو
کھیتی تمام حضرتِ آدم کی چر گئے

زمانۂ غدر کے حالات | زمانۂ غدر کے حالات ناقابل بیان ہیں جب میرٹھ کی فوج شہر میں گھسی اور قلعدار وغیرہ انگریزوں کو مار کر شہر پر مسلط ہوئے تو فرعون سے زیادہ خودسر اور بے باک تھے حتیٰ کہ بادشاہ کو بھی "بڑھئو سلام" کہا کرتے۔ امرا اور شرفا نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ افسرانِ فوج البتہ زیادہ بد اخلاق نہ تھے مگر وہ بھی یہ کہتے تھے کہ یہ پوربیے ہمارے قابو کے نہیں ہیں۔ اس فوج نے مرزا ابو بکر و مرزا مغل وغیرہما جوان جوان خوب صورت خوش وضع شاہزادوں کو اپنا افسر بنایا تھا۔ شاید اس خیال پر کہ عام ہمدردی ان کے ساتھ ہو جائے۔ ان غریبوں نے بھی ان وحشیوں کی گستاخیوں سے بچنے کے خیال سے افسری قبول کر لی گو ایک روز بھی پہاڑی پر لڑنے کو نہیں گئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والد مرحوم جو نہایت سرخ و سفید بھورے بال کرنجی آنکھ دراز قد ورزشی جسم کے آدمی تھے کسی ضروری کام کے واسطے باہر نکلے پوربیوں نے فوراً گرفتار کر لیا اور قلعہ میں لے گئے۔ اہل قرابت بھی کمریں باندھ کر پگڑیاں سر پر رکھ کر ہتیار بند بادشاہ کے پاس پہونچے۔ بادشاہ نے وہی جواب دیا کہ میری کون سنتا ہے۔ افسرانِ فوج کے پاس جاؤ۔ افسرانِ فوج نے جواب دیا کہ فوج کو یقین ہو گیا ہے کہ اس فرنگی کو آپ صاحبوں نے اپنے

گھر میں چھپا رکھا تھا بہت کچھ بگو بشنو ہوئی اور مرزا ابوبکر وغیرہ شاہزادگان تک نوبت پہونچی اور بالآخر پانسو روپیہ نقد لے لئے تو ان کو چھوڑا۔

انگریز پہاڑی پر اور یہ فوج خود سر شہر میں چھ مہینے تک لڑتی رہی۔ اس زمانہ میں مرزا دل افزا معروف بہ مرزا الٰہی بخش سلاطین میں سب سے زیادہ دُور بین ہوشیار اور چالاک تھے۔ اس بے سر جنگ کا انجام سمجھ کر انھوں نے انگریزوں سے پیام و سلام شروع کر دیا تھا اور حکیم احسن اللہ خاں کو اپنی رائے پر لے آئے تھے۔ ادھر چند خیر خواہوں نے یہ مشورہ بادشاہ کو دیا تھا کہ اَن داتا شہر سے نکل کھڑے ہوں۔ کل رجواڑے اور صوبہ دار جواب والیانِ ملک بن گئے ہیں جہاں پناہ کے ساتھ ہو جائیں گے بلکہ شاید اس قسم کے عرائض بھی وصول ہوئے تھے اور بادشاہ نے مع شاہزادگان نکل کھڑے ہونے کا قصد کر لیا تھا۔ مرزا الٰہی بخش نے انگریزوں کے اشارہ پر حکیم صاحب کو ساتھ لیا اور بادشاہ کے پاؤں پر سر رکھ کر بآوازِ گریہ عرض کیا کہ برائے خدا یہ قصد ترک کیجے ورنہ انگریز بندگانِ خدا کا قتل عام کر دیں گے اور ان کا خون روز قیامت جہاں پناہ کا دامن گیر ہوگا۔ حکیم جی نے بھی بہت زور سے اس کی تائید کی۔ بادشاہ نے قصد کو ترک کر دیا اور ہمایوں کے مقبرہ[۱] میں مقیم رہے۔ بالآخر جنرل نکلسن شہر کے دروازہ پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا مگر گورے دروازہ میں گھس آئے اور اب گلی بہ گلی اور کوچہ بہ کوچہ گوروں اور کالوں میں دست بدست کشت و خون شروع ہوا

۱؎ مورخین یورپ مثل کار اسٹیفن وغیرہ نے یہ غلط لکھا ہے کہ اس مقبرہ کو حمیدہ بانو بیگم نے تعمیر کرایا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم اکبر کی ماں تھیں۔ مقبرہ کو ہمایوں کی بیوی حاجی بیگم نے بصرف پندرہ[۱۵] لاکھ روپیہ تعمیر کرایا تھا۔ ۹۷۲ھ ۱۵۶۴ء دیکھو بداونی مترجمہ لو جلد دوم۔ صفحہ ۱۳۵۔ بعد فتح دہلی بادشاہ اسی مقبرہ میں گرفتار ہوئے۔ ۱۸۵۷ء

اور بے گناہ اہلِ شہر پر قیامت نازل ہوگئی۔ جب فی الجملہ شہر پر تسلط ہوگیا تو سر تھیا فس مٹکاف نے مرزا الٰہی بخش سے کہا کہ اگر بادشاہ مع شاہزادگان نکل کھڑے ہوئے تو غضب ہو جائے گا جلد جاؤ اور ان کو ہمارے قبضے میں لانے کی فکر کرو۔ چناں چہ مرزا نے حکیم کو ہمراہ ساتھ لیا اور خدا اور رسول کو درمیان میں لا کر بہت کچھ وعدے کر کے بادشاہ کو نکل جانے سے باز رکھا اور جوان جوان خوب صورت یوسف جمال پری پیکر شاہزادگان کو جو بد بختی سے جبراً افسرانِ فوج بنائے گئے تھے اپنے ساتھ رتھوں میں سوار کرا کر شہر میں لانے لگے قریب دروازۂ شہر تک نہ پہونچے تھے کہ گوروں کی ٹکڑی نے رتھوں کو گھیر لیا اور ہوا سو ہوا۔ بقول ذوق

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں اس کے شورِ بایِّ ذنبٍ قُتلت ہے

حکیم جی کو تو ڈھاک کے تین پات ہاتھ لگے اور ادھر اُدھر نوکری ڈھونڈھتے پھرے مگر مرزا الٰہی بخش کل خاندانِ گورگانی کے چاؤش مقرر ہوئے۔ اور ان ہی کی سفارش پر وظائف مقرر ہوئے۔ چناں چہ میری والدہ کے بھی پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ مگر والد مرحوم نے انکار کیا۔ دہلی کی بربادی کے واقعات غرناطہ کی تباہی کے حالات سے بہت مطابق ہیں۔ جس طرح غرناطہ تباہی کے وقت دُلھن بنا ہوا تھا اُسی طرح دہلی بھی بربادی کے وقت اپنی بہار پر تھی۔ اور جس طرح ابو عبد اللہ بیچارگی کی حالت میں غرناطہ سے نکالا گیا ابو ظفر محمد بہادر شاہ رنگون روانہ کئے گئے البتہ سلطنت مغلیہ کے ختم ہوتے وقت فیروز شاہ[1] اپنا نام کر گیا۔

---

[1] فیروز شاہ۔ شاید بھتیجا بادشاہ کا تھا حج بیت اللہ کو گیا ہوا تھا۔ ایام غدر میں جب وہ سورت بندر میں پہونچا تو اس کو غدر کا حال معلوم ہوا۔ وہاں سے لڑتا ہوا شمالی ہند میں پہونچا مگر یہاں بادشاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا یہاں سے لڑتا ہوا صاف ہندوستان سے نکل گیا ۱۲

مرزا عباس بیگ مرحوم انگریزی فوج کے ساتھ فرخ آباد میں متعین بکار تھے اور انگریزی فوج گنگا کے کنارے پر فیروز شاہ کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی اور مخبر برابر خبر دے رہے تھے کہ اب آیا اور جب آیا۔ یکایک علی الصباح اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ وہ آن ہی پہونچا۔ کل جمعیت نے گھوڑوں پر سوار ہو کر اطمینان کے ساتھ گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور پار ہو کر یہ جا وہ جا۔ نظروں سے غائب ہو گئے۔ اسی طرح لڑتا بھڑتا وہ اقلیم ہند سے صاف نکل گیا اور سُنا ہے کہ تاحیات روس کا وظیفہ خوار رہا اور آخر مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ اُس کی بی بی ملکہ زمانی یا حاتم زمانی حیدرآباد میں آئی تھیں اور مجھ سے بھی ملی تھیں۔ چوں کہ اس وقت حیدرآباد میں ایک بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی کوئی ان بی بی کا پرسان حال نہ ہوا۔ بہر حال فیروز شاہ نے عزت اپنے خاندان کی رکھ لی۔

بعد غدر حالات مرزا عباس بیگ

میں لکھ چکا ہوں کہ بعد غدر ہم لوگ سیتاپور ملک اودھ میں آ کر عم بزرگوار مرزا عباس بیگ مرحوم کے پاس مقیم ہوئے۔ مرزا عباس بیگ کے حالات زندگی قابل بیان ہیں۔ وہ میرے والد مرحوم سے بڑے اور مرزا عاشور بیگ سے چھوٹے تھے نہایت حسین اور خوب صورت کمال سرخ و سفید جسم سانچے میں ڈھلا ہوا دراز قد اور طاقت خدا داد رکھتے تھے۔ جوانی میں عیاش طبع رنگین مزاج اور احباب پرست تھے اگرچہ پڑھنے لکھنے کا شوق کم تھا مگر عجیب تر ایں کہ اس زمانہ میں ان کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا اور اس قدر پڑھ لی کہ تحریر تقریر کر لیتے تھے۔ فارسی میں معمولی لیاقت تھی اور عربی سے ناواقف تھے۔ ماسٹر رام چندر[1] اس زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے۔

---

[1] ماسٹر رام چندر ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ چوں کہ انھوں نے ابتدائی علوم کی کتابیں مختصر اور مفید تحریر کی تھیں بہت ہر دل عزیز تھے اور بہت ہندوؤں کو عیسائی بنا دیا۔ شاعر بھی تھے ایک شعر اُن کا

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آیندہ)

مرزا بھی اُن کے شاگرد ہوگئے۔ مرزا اگرچہ بہت طبّاع اور رنگین مزاج تھے مگر شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ غدر سے پہلے انگریزی کی تعلیم صرف بنگالہ میں رائج ہوئی تھی۔ پنجاب، دوآبہ، راجپوتانہ وسط ہند وغیرہ صوبوں میں ہندو کم اور مسلمان کمتر انگریزی داں دکھائی دیتے تھے مارشمین وکیری وغیرہما پادریوں نے انگریزی تعلیم کے واسطے مدارس اس غرض کے واسطے جاری کئے تھے کہ ہندو پیگانز "یعنی کفار" اپنے بے معنی مذہب کو چھوڑ کر بامعنی مذہب عیسوی اختیار کرلیں گے اور گورنمنٹ نے مدارس اس نیت سے کھولے تھے کہ چوں کہ اہل انگلستان گراں قیمت تھے اہل ملک سستے ہاتھ آجائیں گے۔ ہر دو فریق نے نصاب تعلیم اپنے اغراض کے مطابق قائم کئے تھے اور درسی کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم تاریخی حالات ایسے لکھے تھے کہ طالب علموں کو اپنے سلف سے نفرت ہوجائے اور دعویٰ یہ تھا کہ ہم اہل ہند کو ادنیٰ حالت جہل سے نکال کر اعلیٰ مرتبۂ تہذیب پر لانا چاہتے ہیں۔ غدر سے پہلے کل دفاتر سرکاری از وائسرائے تا ادنیٰ کلکٹر زبان فارسی میں جاری تھے

الغرض مرزا عباس بیگ نے انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت فی الجملہ حاصل کرلی تھی اور اپنی بلند ہمتی کے واسطے میدان وسیع کی تلاش میں تھے وہ موقع ان کو خوش قسمتی سے مل گیا یعنی ان کے حقیقی چچا مرزا افضل بیگ المخاطب بہ جواد الدولہ وکیل سلطنت بغرض تصفیہ چند اہم امور وائسرائے کے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) مجھ کو یاد ہے ؎

جب سے دل لے گئی وہ شوخ فرنگن اپنا   دھیان رہتا ہے سدا جانب لندن اپنا

اس ہی زمانہ میں ایک مقتدر انگریز مسلمان ہوگیا تھا اور نام اپنا جان محمد رکھا تھا۔ ذکی اور خوش کلام شاعر تھا اس کا تخلص آزاد تھا چنانچہ کہتا ہے ؎

خدا کی قدرت ہو ورنہ آزاد میرا لیلان متوں کا جھگڑا   نہ ہوگا فیصل تمام دن میں، مگر بروز حساب آدھا

مطلع بھی اچھا کہا ہے ؎

تو یاد لے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اس کا حجاب آدھا   ہزار مشکل سے یار نے رخ پر سے اس نے اٹھا نقاب آدھا

پاس کلکتہ بھیجے گئے چوں کہ کلکتہ میں ان امور کی بابت دشواریاں پیدا ہوئیں، انھوں نے اپنی طرف سے راجہ رام موہن رائے کو بخطاب راجگی انگلینڈ روانہ کیا اور خود وہاں سے اپنے ساتھ ایک بنگالن ماہ لقا کو لے کر واپس آئے، مگر زندگی نے وفا نہ کی اور جلد انتقال کیا یہ بیوہ مرزا کے حسن و جمال پر عاشق ہوگئی، اُدھر ان کے والد ماجد ان کی رفتار سے ناراض ہوگئے - یہ اسباب ہوئے کہ یہ اس عورت کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور پنجاب میں ایک راجہ کے ہاں ملازم ہوئے - چوں کہ قوی ہیکل وجیہ اور جمیل تھے راجہ نے ان کو اپنی مصاحبت خاص میں رکھا - یہ امر دیگر مصاحبین کو شاق گزرا اور راجہ سے موقع پاکر عرض کیا کہ آپ کی محبوبہ رنڈی مرزا کی طرف بہت راغب ہے - راجہ نے ایک شب ان کو خوب شراب پلائی اور رنڈی کو حکم دیا کہ ان کے حجرے میں جائے مرزا نشے میں چور تھے - مگر چھرا لے کر اس کی ناک کاٹنے کے واسطے کھڑے ہوگئے - وہ رنڈی بھاگ نکلی راجہ یہ سب تماشہ خود دیکھ رہا تھا اپنے مصاحبین پر بہت خفا ہوا اور مرزا کی شرافت کا معترف ہوگیا - مگر مرزا صبح کو راجہ کے پاس گئے اور کہا کہ خانہ آباد و دولت زیادہ، آپ نے میرے ساتھ وہ کام کیا جو کوئی رئیس اپنے ملازم کے ساتھ نہ کرتا ہر چند راجہ نے عذر معذرت کی مگر یہ نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے وہاں سر ہنری لارنس حاکم کل پنجاب نے اُن کی شرافت و نجابت و حسن و جمال و قد و قامت کی وجہ سے ان کو کوتوال شہر مقرر کر دیا - چچا مرحوم بیان کرتے تھے کہ سر ہنری ایک وحشی مزاج مگر ادائے فرائض منصبی میں ازحد پابند، قواعد اور اپنے ماتحت عمال کی رفتار کردار کا نگراں تھا ایک روز مرزا بازار میں ایک دوکان دار سے کسی امر پر برسر حساب تھے اور خدمت گار ان پر چھتری لگائے ہوئے تھا کہ سر ہنری اُدھر سے بگھی پر نکلا اُن کو دیکھ کر بگھی پر سے کود پڑا اور

سلہ راجہ رام موہن رائے انگریزی عربی فارسی اور اپنے مذہبی علوم میں فاضل متبحر تھے اور اپنے ہندو بھائیوں کے واسطے ایک نیا طریق ایجاد کیا جس کو برہم سماج کہتے ہیں:؛

کہا وَل نواب صاحب ہم تم پر چھتری لگائے گا مرزا اکڑ کر آگے ہو لئے۔ سر ہنری نے چھتری پھینک کر ان کو کوٹھی پر حاضر ہونے کا حکم دیا خلاصہ این کہ کوٹھی پر بھی اُنھوں نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی پر سر ہنری نے بجائے سزا تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ ایک روز اور یہ اتفاق ہوا کہ کسی کارِ ضروری کی وجہ سے سر ہنری ان کو اپنے ساتھ لے گئے راستہ میں ایک جھیل پایاب واقع تھی سر ہنری اس وقت کسی کارِ ضروری کی بابت افہام وتفہیم کر رہا تھا مرزا نے اپنی فطری صاف گوئی کی وجہ سے اس سے اختلاف رائے کیا۔ بگھی بیچ جھیل میں پہونچ گئی تھی کہ سر ہنری نے غصّہ میں آکر ان کو گاڑی سے اتر جانے کا حکم دیا یہ بھی پانی میں کود پڑے ان کی یہ حرکت بھی مفید ہوئی اور فیروز پور کے تحصیلدار مقرر ہوگئے یہاں انھوں نے سکھوں کے مقابلے میں بڑی خیر خواہیاں کیں[۵۱] اور جنرل ایبٹ زخمی کو میدان جنگ سے اٹھا لائے۔ الغرض سر ہنری ان کی اس قدر خاطر کرتا تھا کہ ان کے بالا دست انگریز حکّام بھی ان سے رشک کرنے لگے۔ چچا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں اس قدر رشوت خوار تھا کہ آٹھ آنے بھی نہ چھوڑتا تھا اور بہت زر وسیم ونقد جنس جمع کر لیا تھا اگر با وجود اس دولت کے اہلِ خاندان میں پنچایت سے باہر تھا۔ سوائے والد مرحوم اور پھوپی صاحبہ مرحومہ اور کوئی دوسرا اُن سے نہ ملتا تھا۔ علاوہ اس وجہ کے جو اوپر بیان کی گئی ایک وجہ بہت بڑی یہ بھی تھی کہ کل خاندانی جاگیرات ان کی بد ولت خاندان سے نکل گئی تھیں اور بوجہ عدم ثبوت و اتلاف اسناد سرکار میں ضبط ہوگئی تھیں۔ پنجاب میں انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور وجہ تبدیل یہ بیان کرتے تھے کہ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت علیہم السلام سے محبّت رکھو

---

[۵۱] اس جنگ پنجاب میں ان کے کارنامے ایک مختصر رسالہ میں چھپے ہوئے ہیں جس کا ایک نسخہ میں نے اپنے فرزند دلبند میرزا ذوالقدر بیگ خاں ذوالقدر جنگ کو بھی دیا ہے تاکہ رزیڈنٹ (سفیر) ریاست حیدرآباد بھی ان کو وقعت سے دیکھے ۱۲

پنجاب میں ایک فقیر نے ان کو ایک نقش دست غیب کا بخشا اور ان کا قول تھا کہ کل دنیاوی کامیابی ان کو اس نقش کی بدولت حاصل ہوئی۔ تا زمانۂ وفات یہ نقش وہ بعد نماز ظہر ین لکھا کرتے تھے[1]۔

مرزا پر آفت ناگہانی | ایام ملازمت پنجاب میں ایک بڑا صدمہ ان کو پہونچا اور وہ تمام رشوتی دولت جو جمع کی تھی سب غایب غلّا ہوگئی۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ میرے والد مرحوم اور پھوپی مرحومہ ان سے ملنے کے واسطے فیروز پور گئے ہوئے تھے کہ ایک روز مرزا تو اپنی کچہری میں تھے اور والد مرحوم باہر دیوان خانہ میں مسائل ریاضیات حل کر رہے تھے کہ ایک ہمسایہ ایک چھوکری کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھوکری کو رکھ لیجئے میں باہر جاتا ہوں دو تین روز میں واپس آؤں گا اپنی چھوکری سے لے جاؤں گا۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ شاید بھائی کا دوست ہے جو اس طرح بے تکلف آیا چھوکری کو اندر زنانہ میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چل دیا مگر پولس کی دوڑ آن پہونچی اور چھوکری کو پکڑ لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر کہ موقع کا منتظر تھا اس نے مقدمہ بردہ فروشی یا یوں کہو کہ لونڈی خریدنے کا مرزا پر قائم کرکے معطّل کر دیا۔ چچا مرحوم کہتے تھے کہ اس مقدمہ کو اس قدر طول ہوا کہ کُل جمع پونجی خرچ ہوگئی اور نوبت فاقہ کشی کی پہونچی۔ ڈپٹی کمشنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا۔

جنرل ایبٹ کی امداد | یہ بھیس بدل کر اونٹ کرایہ کرکے ملتان میں افتاں خیزاں رات کو سفر کرتے ہوئے اور دن کو چھپتے ہوئے جنرل ایبٹ کے پاس اس وقت شب کو پہونچے کہ وہ رات کا کھانا کھا کر مع اپنی زوجہ کے قہوہ وغیرہ پی رہا تھا۔ مرزا نے اونٹ سے کود کر جس کمرہ میں روشنی دیکھی بیبا کانہ دروازہ کو دھکا دیا اور اندر گھس گئے میم بیچاری تو ہائے کرکے بیہوش ہوگئی جنرل

---

[1] یہ نقش بسم اللہ کا ہے اور والد نے مجھے بتایا ہے میں پابندی کے ساتھ لکھا کرتا ہوں (ذوالقدر جنگ)

طپنچہ فوراً اسے کران کی طرف بڑھا خلاصہ ایں کہ بعد جان پہچان شناخت نام ونشان جنرل نے کل حال سُنا اور دونوں ایک ایک طپنچہ لے کر ڈاک گاڑی میں جانب لاہور روانہ ہوئے۔ راستہ خیر وعافیت سے گزرا لاہور پہونچ کر جنرل سیدھا ان کو سرہنری کے پاس لے گیا سرہنری اپنی کچہری میں تھا مرزا نے کہا یہاں مجھ کو پولس پکڑ لے گی جنرل نے کہا تم فوراً طپنچہ مار دینا یہ کہہ کر وہ تو خود سرہنری کے پاس گیا مرزا گاڑی میں دروازہ بند بیٹھے رہے تھوڑی دیر کے بعد جنرل واپس آیا اور مرزا سے کہا پولس سے مت ڈرو اور میرے ساتھ چلو سرہنری نے بلایا ہے۔ الغرض سرہنری نے شکایت کی کہ "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آیا جو ملتان گیا" اور تمام حال سن کر وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری کر دیا اور ٹمپل[۱] صاحب کے محکمۂ بندوبست میں خدمت عطا کر دی بعدہٗ وہ ملک اودھ میں سرہنری کے ساتھ چلے آئے۔ ایامِ غدر میں ملاپور کے تحصیلدار تھے۔ باغیوں نے تحصیل پر حملہ کیا تو انھوں نے بکمال جواں مردی خزانہ کو بچا کر جنرل اوٹرام کے پاس روانہ کر دیا اور خود پا پیادہ بھیس بدل کر جنگل جنگل چھپتے ہوئے بلگرام پہونچے اہلِ بلگرام نے ان کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھا۔ یہاں بیٹھ کر انھوں نے حکّامِ انگریزی سے خط وکتابت شروع کر دی اور باغیوں کی حرکات وسکنات سے اطلاع دیتے رہے پھر یہ فرخ آباد بھیجے گئے یہاں

---

[۱] سر رچرڈ ٹمپل جنھوں نے مجھ سے انگلستان میں ۱۸۹۵ء میں بہادر شاہ کی گرفتاری کا واقعہ بیان کیا تھا نہایت بدشکل اور بدوضع شخص تھے لیکن قابلیت میں اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ پنجم افضل الدولہ غفران منزل کے زمانہ میں حیدرآباد میں رزیڈنٹ تھے بعد میں بنگال کے لفٹنٹ گورنر اور پھر بمبئی کے گورنر ہوئے۔ چوں کہ دادا مرزا عباس بیگ مرحوم سے کمال محبت تھی مجھے انگلستان میں اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے پارلیمنٹ کے رکن اور درباری حلقہ میں خاص اثر رکھتے تھے ان کا انتقال سنہ ۱۹۰۲ء میں ہوا (ذوالقدر جنگ)

بھی ایک عجیب واقعہ ہوا یعنی نواب فرخ آباد کے اسباب ضبط شدہ میں ایک تلوار گم ہو گئی جس
کا قبضہ اور میان کئی لاکھ کا گراں قیمت تھا چند انگریز جو سامان کی پڑتال کرنے کو مقرر تھے
اس میں سے ایک انگریز نے جس کا نام میں بھول گیا مرزا سے کہا کہ "تم اس کا ذمہ دار ہو"
مرزا نے فوراً طپنچہ اس پر چھونک دیا لنڈزی صاحب نے بکمال تعجیل مرزا کے ہاتھ پر ہاتھ مارا گولی
زمین پر گری یہ نال پکڑ کر کندی سے اس کا سر پھوڑنے کو چلے انگریزوں نے ان کو پکڑ لیا اور
اس انگریز کو دوسرے کمرہ میں کر دیا۔

قائمی مجلس تعلقہ داران اودھ | فرخ آباد سے یہ سیتا پور میں ڈپٹی کلکٹر درجۂ اول بحال ہوا ششش صد روپیہ
مقرر ہوئے اور جاگیر بڑا[۱] گاؤں انعام میں اُن کو عطا ہوئی لکھنؤ میں جب ان کا قیام ہوا تو جنرل
ایل بیرو چیف کمشنر یعنی امیر ملک اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور
تعلقہ داران اودھ تھے ان تینوں کی رائے سے کیننگ کالج اور ذنکل تعلیم گاہ یتیمان تعلقہ داران
موسوم بہ وارڈانسٹی ٹیوشن قائم ہوا مگر بڑا کام ان سے یہ ہوا کہ مجلس تعلقہ داران اودھ قائم کی گئی
جس کے صدر و کرسی نشین مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ قرار پائے اور بابو دکھنا رنجن معتمد یعنی سکرٹری
نامزد ہوئے۔ جب مرزا نے وظیفہ (یعنی پنشن) لیا تو بعد بابو دکھنا رنجن یہ خود سکرٹری بنائے گئے
یہاں پر بھی ایک واقعہ قابل تحریر گذرا یعنی کالج قائم ہوتے وقت تعلقہ داروں کا ایک جلسہ
شوریٰ منعقد ہوا جس کے صدر نشین خود کمشنر اودھ اور نائب الصدر مہاراجہ اور معتمد مرزا تھے
اس جلسہ میں ابتدائی امور طے ہوئے منجملہ ان کے اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے یا
کالج اور ابتدائً ہیڈ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل مہاراجہ کی رائے باتفاق راجہ تجمل حسین خاں وغیرہ
تعلقہ داران حاضرین یہ تھی کہ خرچ زائد ابتدا میں نامناسب ہے لہذا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا جائے جنرل

---

[۱] یہ جاگیر بڑا گاؤں ضلع سیتا پور ملک اودھ میں واقع ہے ۱۲

بیرو اور مرزا نے رائے پرنسپل کی دی مہاراجہ نے برائے طنز کہا کہ "ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے اس میں پڑھتے ہیں اس واسطے آپ نے یہ رائے دی ہے" مرزا کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے یکایک جامہ سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ "تو ایک دھوتی بند سور ہا سکر بولنے والا تو معاملات تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے" مہاراجہ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلق داران اودھ کیا ہندو کیا مسلمان مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گئے اور جنرل بیرو نے انگریزی میں بہ تشدد کہا کہ "مرزا کیپ یور ٹمپر" (Keep your temper) یعنی اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔ یہ سن کر حضرت نے کل کاغذات جنرل کے سامنے پھینک دئے اور یہ کہہ کر کہ آپ دوسرا معتمد بنائیے کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے جلسہ درہم برہم ہو گیا مرزا اس ہی حالت غیظ و غضب میں گھر واپس آئے اور امیر خاں داروغہ پر غصہ اتارتے ہوئے اندر کوٹھی میں چلے گئے۔ یہ کپڑے اتار ہی رہے تھے کہ سامنے سے مہاراجہ کی سواری نمودار ہوئی میں نے دوڑ کر چچا کو اطلاع دی وہ اس ہی طرح صرف کرتہ پہنے باہر چلے آئے عجب طرح کی ملاقات ہوئی مرزا تو نادم و شرمندہ صورت سر جھکائے ہوئے بیٹھے رہے مہاراجہ ایک دو منٹ کے بعد تبسم کناں گویا ہوئے کہ مرزا صاحب میں ایک امر خاص کی بابت آپ کا شکریہ ادا کرنے کو آیا ہوں" مرزا نے کہا "مہاراج اب زیادہ آپ مجھ کو شرمندہ نہ کیجئے میں ایک جاہل مزاج سپاہی پیشہ آدمی ہوں مجھ سے آج نہایت جاہلانہ خطا سرزد ہوئی جس کی میں معافی مانگتا ہوں" مہاراجہ نے ارشاد فرمایا "نہیں مرزا صاحب میں یہ قسم کہتا ہوں کہ میں واقعی آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اس واسطے کہ ان تعلق داروں نے حضور اور مہاراج وغیرہ القاب دے کر مجھ کو بلا استحقاق واجب التعظیم بنا دیا تھا آج آپ نے مجھ کو بیدار کیا" اور یہ کہہ کر کہ "میں آپ سے گلے ملنا چاہتا ہوں" اٹھ کھڑے ہوئے

مرزا بھی شرمندہ کھڑے ہوگئے اور مہاراج کے سینہ پر سر رکھ کر کہا کہ انچہ شد شُد برائے خُدا اب آپ مجھ کو زیادہ خود میری آنکھوں میں حقیر نہ کیجئے اور میری گستاخی معاف کیجئے اور مجھ کو اپنا ایک ادنیٰ خدمت گار سمجھئے۔ اتنے میں راجہ تجمل حسین خاں بھٹوا مئو اور بابو دکھنا بخش بھی آ گئے۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ مہاراجہ نے مرزا کی تائید سے قانون تعلق داران بڑی دھوم دھام سے جاری کرا کے اپنے نواسہ دوہوا صاحب کو اپنا جانشین بنا لیا اور اسی قانون کی رو سے اپنے بھتیجے ترلوکی ناتھ کو محروم کر دیا۔

راجہ امیر حسن خاں | یہ دونوں صاحبزادے میرے ہم مکتب مثل راجہ امیر حسن خاں تھے راجہ امیر حسن خاں کا واقعہ بھی قابل گزارش ہے۔ اُن کے والد راجہ **نواب علی خاں** **واجد علی شاہ** کے دربار میں بہت مقتدر اور علی نقی خاں وزیر کے نظر کردہ خاص اور بیگمات کے پاس صاحب رسوخ تھے۔ غدر میں ان کا انتقال ہوگیا در حالیکہ ان پر شبہ بغاوت کا قائم ہوگیا تھا رانی صاحبہ محمود آباد امیر حسن خاں کم سن یتیم کو اپنے ساتھ سیتاپور لے آئیں اور مرزا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ مرزا صاحب اس یتیم کو آپ اپنی فرزندی میں لیجئے اور مجھ بیوہ کی مدد کیجئے مرزا نے راجہ کو آغوش میں لے لیا اور رانی صاحبہ کی بڑی خاطر داری کی مجھ کو رانی صاحبہ اچھی طرح یاد ہیں میں کم سن تھا مجھ سے پردہ نہ تھا الغرض مرزا نے بکمال کوشش ان کا علاقہ چھڑا دیا اور راجہ سرکاری وارڈ ہوگئے۔ اوّل مدرسہ سیتاپور میں بعدہٗ **بنارس** اور اس کے بعد لکھنؤ تعلیم گاہ میں ہمارے ساتھ تعلیم پاتے رہے رانی صاحبہ ہمیشہ مجھ کو محرم کے کونڈے اور بڑے بڑے کھٹل بھیجا کرتی تھیں سیٹھ جئے **دیال** **تعلق دار بسواں** نے حال میں مجھ سے کہا کہ مرزا نے جو سلوک رانی صاحبہ کے ساتھ کیا اُس کے کاغذات ان کے پاس اب تک موجود ہیں۔ ان کے فرزند مہاراجہ سر **محمد علی محمد خاں**

اپنے والد مرحوم سے زیادہ شہرت حاصل کی ہو۔

یہاں پر ایک قصہ دلچسپ بھی قابل بیان ہو راجہ نواب علی خاں کے کوکا گھورو میاں نامی کے گھر میں ایک پروردہ لڑکی نرگس نامی تھی بقول میر ؎

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہہ اُس کی ایک نئی ہے چال

یہ لڑکی گھورو میاں پر عاشق ہو گئی اور جب وہ اندر زنانہ میں آتے تھے یہ لڑکی اپنے نرگس شہلا کو ان کے رخسار گلزار پر نہ فقط دوختہ کیا کرتی بلکہ دور سے کھڑی رہ کر اُن کی بلائیں لیا کرتی۔ یہ امر اُن کی بی بی کو ناگوار ہوا اور خود گھورو میاں کو بھی شرم آتی تھی اور یہ لڑکی اپنے جوش جنوں میں ان حرکات سے باز نہ آتی تھی اور بقول مومن خاں مومن ؎

وصال تو تھا کہاں میسر مگر خیال وصال ہی میں
مزے اُڑاتے ہو ہیں نکلتی جو ساتھ انداز رم نہ ہوتا

اپنے عشق کی بھڑاس اس طرح نکالتی تھی بالآخر گھورو میاں نے نہ فقط گھر سے بلکہ محمود آباد سے باہر نکال دیا وہ سراسیمہ و پریشان باہ سرد و دل پُر درد اس شعر کے مطابق کہ ؎

تیری طرح تجھ پہ بھی کوئی جفا کرے
تیرا بھی دل کسی پہ فدا ہو خدا کرے

فریاد کرتی ہوئی سیتاپور آئی چوں کہ ہمارے گھر سے واقف تھی میری بڑی چچی مرحومہ کے باہر کی ڈیوڑھی میں اپنی دھونی جمائی۔ وہ میانہ قد سرو آزاد مثل زلف پُر پیچ خمیدہ وہ گندم رنگ مثل گُل یاسمین بے خون سفید موئے سر ریشم سیاہ تا بکمر آب مستانہ مثل سبزہ* چمن آنا رسید یہ اس کا سراپا مجھ کو یاد ہے۔ عمر اُس کی قیاساً سترہ اٹھارہ برس کی ہو گی۔ شغل اس کا یہ تھا

*مثل سبزۂ چمن آنا رسیدہ

کہ رخ بجانب دیوار چشم اشک تار رفغاں بر لب نام معشوق ورد زبان زد مطابق این اشعار فریاد کناں

ز ہجراں بر لب آمد جانِ غم ناک	الا یا لیت شعری این القاک
بہر جمعیتہ وصل تو جوئیم	لعل اللہ یجمعنی وایاک
کساں را ہر دل از دیدہ خیزد	و قلبی کان قبل العین ہواک
ز حسرت با در و دیوار گوئیم	الا یا ربع سلمیٰ این سلماک

ہمارے یہاں کے زنانہ ملازمین ماما مغلانی وغیرہ ترس کھاکر بہلا پھسلا کر گھورو میاں کا نام لے کر کہ وہ آرہے ہیں کچھ کھلا پلا دیا کرتی تھیں کبھی گریبان دریدہ بزبان دردناک گویا ؎

سر بکوہ و بیاباں تو دادہٗ مارا

جنگل میں نکل جاتی تھی اسی طرح سال دو سال اس پر گزرے تھے کہ ایک روز خبر آئی کہ گھورو میاں نے انتقال کیا وہ رخ بدیوار بیٹھی تھی کہ کسی سنگدل بیداد گر نے اس سے کہہ دیا کہ تیرا معشوق حوروں کی آغوش محبت میں سدھارا یہ سن کر وہ ہوش میں آگئی اور یہ کہہ کر کہ کیا یہ خبر سچ ہے آنکھیں بند کرلیں اور پھر نہ کھولیں شاید دوسرے روز نام گھورو میاں بزبان انتقال کرگئی میرے ساتھ کے پڑھنے والوں میں صرف تین صاحبوں نے نام پیدا کیا۔ راجہ امیر حسن خاں راجہ بھنگا جن کے آبا و اجداد نے حضرت سید سالار غازی کو شہید کیا اور مہاراجہ اجودھیا صاحب یعنی نہ وہ مہاراجہ صاحب و ذاتی جیسے تھے ویسے ہی رہے ۔ راجہ بکرم ساہ راجہ کھیری گرھڑے بہت امید تھی مگر افسوس کہ کم سنی میں انتقال کیا ان کی رانی صاحبہ نے بڑا نام پیدا کیا۔ مگر جو خاص تعلقات مجھ سے اور ان کے شوہر سے تھے اس کا حال ان کو معلوم نہیں ۔ بابو کھنا بخش کا گھر تباہ ہو گیا سنا ہے کہ بابو راجکمار ان کے دست گرفتہ ہی اس تباہی کا باعث ہوئے ۔ دنیا میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہمارے زمانہ میں بھی اکثر دست گرفتہ دست گیرندہ

کے پولٹیکل قاتل ہو گئے ہیں مثل مشہور ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال نقل ہے کہ ایک شخص نے احمد سے کہا کہ محمود تجھ کو گالیاں دے رہا ہے۔ احمد دیر تک سوچتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا کہ میں نے تو محمود کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی پھر وہ کیوں گالیاں دیتا ہے (خود میری ایک عزیزہ کیا کچھ برائی میرے ساتھ نہیں کر رہی ہے ایک دو میرے نمک حرام ملازمین اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں معلوم نہیں کیا نتیجہ ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون)

راجہ تجمل حسین خاں

اب صرف راجہ تجمل حسین خاں تعلقدار بھٹو امئو کے حالات مختصر لکھ کر اپنا تیسرا ورقِ زندگی الٹتا ہوں۔ راجہ صاحب دبلے سوکھے سبزہ رنگ میانہ قد سادہ مزاج اس زمانہ کے مطابق تعلیم یافتہ تھے ایام غدر میں اکثر راجگانِ ہنود و مسلمان بادشاہ کی نمک خواری کی وجہ سے انگریزوں کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے تھے منجملہ ان کے یہ بھی مع اپنے ملازمین اور اہل قرابت جنرل اوٹرام کو روکنے کے واسطے عیش باغ میں صف آرا ہوئے اور دو ہوم کی لڑائی ہوئی۔ راجہ زخموں میں چور اردگرد کثیر التعداد کشتگان مردوں میں بیہوش پڑے رہے ان کا قدیم خادم وہ بھی سر سے پا تک مجروح اُن کے پاس پڑا ہوا تھا راجہ کو جب ہوش آیا تو شبِ ماہ تھی اس کی روشنی میں معلوم ہوا کہ سب ساتھی کام آئے اتنے میں ان کا خادم بھی ہوشیار ہوا بمشکل تمام رینگتے ہوئے ایک درخت کے سایہ میں درب باغ کے اندر پہونچے دن کو چند لوگ ان کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہونچے اور ان کو اٹھا لائے زندگی باقی تھی بچ گئے غدر کے بعد جنرل بیرو نے ان کو گرفتار کیا باہم جواب ترکی بہ ترکی ہوئے راجہ نے بکمال جواں مردی کہا کہ ہم پر ادائے حقوق نمک خواری فرض تھا۔ رئیس اودھ کا نمک کھایا تھا لڑے اگر تمہارا نمک کھائیں گے تمہارا ساتھ دیں گے۔ جنرل اُن کی جواں مردی پر فریفتہ ہو گیا اور بہت قوی سفارش کر کے ان کو بری کرا دیا۔ یہ نقل راجہ صاحب خود بیان کرتے تھے

جس زمانہ میں میں خود کالج میں طالب علم تھا لکھنؤ بہت آباد تھا۔ علاوہ تعلقہ داران کے امرائے عہد نوابی اکثر زندہ تھے اور نواب وزیر اودھ کو چونکہ جماعت سوداگرانِ مشرقی ہند یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود مختاری کا لالچ دے کر شاہانِ دہلی کا نمک حرام اور خطابِ شاہ سے مخاطب بنا دیا تھا تاکہ ہندوستان میں طوائف الملوکی ہو اور کمپنی کو اپنا کام نکالنے کا موقع ملے۔ پس اس خاندان کے یہ مصنوعی شاہزادیاں و شاہزادگان بھی لکھنؤ میں مقیم تھے شہر آباد و شاد و اہل شہر کمال مرفہ حال تھے یہ امر مشہور ہے کہ اس ہی مصلحت سے اس گورنمنٹ و الکران مذکور نے یہ خطاب ناصر الدولہ والی ملک دکن کو عطا کرنا چاہا مگر ناصر الدولہ نے کمال شرافت جواب دیا کہ یہ خطاب اگر مجھ کو میرے مالک اور آقا بادشاہِ دہلی عطا کریں تو جائز ہے اور میری قدر و منزلت ہے تم اس کے مجاز بھی نہیں ہو اور نہ اس پر میری قدر و منزلت ہے پس والیانِ دکن نواب تک ہز ہائنس رہے اور والیانِ اودھ ہز مجسٹی بن گئے مگر بقول عوام ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

بادشاہت کی لیاقت نہ رکھتے تھے برٹش گورنمنٹ نے رعایائے اودھ بندگانِ خدا پر رحم فرما کر واجد علی شاہ کو کلکتہ چلتا کیا اور ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

لے بعد غدر تعلق داران اودھ مسلمان اور ہندو دونوں کو خاص قانون کے تحت متبنّیٰ لینے کا اختیار دیا گیا۔

حضرت غفران مکان میر محبوب علیخان آصفجاہ سادس

سفرِ حیدرآباد دکن

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ مدرسہ کی تعلیم و درسی کتابوں پر میرا دل نہیں لگتا تھا۔ مجکو خود حیرت ہے کہ میں نے انٹرنس کا امتحان بدرجۂ اوّل کیوں کر پاس کیا۔ بہرحال فرسٹ آرٹ کے امتحان میں ناکامیاب رہا اور کالج سے ایسا برداشتہ خاطر ہوگیا کہ بار دوم امتحان دینے کے واسطے کسی طرح دل نہ چاہا اور فکر دامن گیر ہوئی کہ چچا مرحوم پر اپنا بار نہ ڈالنا چاہیئے۔ اتفاقاً مجھ میں اور میری چچی میں بے مزگی بھی پیدا ہوگئی اور میں نے کسی طرف تلاش روزگار نکل جانے کا قصد مصمم کر لیا۔ سید حسین صاحب بلگرامی نے میرے اس خیال کی تائید کی۔ خلاصہ یہ کہ چچا مرحوم نے بھی مجکو اجازت عطا فرما دی اور بالآخر حیدرآباد دکن کا سفر بوجوہ چند قرار پایا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ نواب میر تراب علی خاں سالار جنگ مختار الملک وزیر اعظم ممالک حیدرآباد دکن سیر کناں لکھنؤ میں بھی آئے تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمان داری بدرجۂ رؤساء خود مختاران عظام کی تھی۔ کل امیران صوبجات ہند کو حکم پہونچ گیا تھا کہ ان کو مہمان سمجھیں اور رزیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس اس ہی غرض سے ہمرکاب تھے۔ لکھنؤ میں یہ امیر اودھ جنرل ایل بیرو کی کوٹھی میں فروکش ہوئے کئی اُمرائے دربار و جمعداران فوج ظفر موج بھی ساتھ تھے۔ جنرل بیرو نے تعلق داران اودھ اور اُمرائے شہر سے بھی ان کی ملاقات کرائی من جملہ ان کے مرزا عباس بیگ[1] میرے عم بزرگوار مرحوم بھی تھے۔ مرزا کی وجاہت وزیر باتدبیر کو اس قدر پسند آئی کہ اپنی ریاست میں ملازمت کا پیام دیا۔ مرزا چوں کہ بفضلہ تعالیٰ حوائج دنیا سے مستغنی و

---

[1] راقم کے چھوٹے بھائی مرزا فیاض بیگ مرحوم کو چچا مرزا عباس بیگ نے اپنا متبنیٰ کر لیا تھا اور از روئے قواعد تعلقداری علاقہ بڑا گاؤں کا دیگر اہل خاندان کے حقوق کے ساتھ انھیں کو اپنا وارث گردانا تھا ۱۲

آزاد مزاج تھے۔ بہت تہذیب کے ساتھ انکار کیا اور کہا کہ میں ایک لائق ذی علم نوجوان آدمی آپ کو دوں گا۔ چنانچہ سید حسین بلگرامی کو دوسرے روز مع اپنے خط کے ان کی خدمت میں بھیدیا۔ نواب کو ان کے خیالات پسند آئے اور تین سو روپیہ حالی مشاہرہ پر اپنے پاس ملازم رکھنا چاہا۔ مگر چونکہ تین سو روپیہ یعنی ڈیڑھ سو کالج سے اور ڈیڑھ سو چچا مرحوم دفتر لکھنؤ ٹائمز سے دیا کرتے تھے۔ سید صاحب نے انکار کردیا۔ راجہ امیر حسن خاں تعلقدار محمود آباد نے نواب ذی شان کی بہت آؤ بھگت کی اور چچا مرحوم نے صرف چند خوان نتیجۂ ہنر مندی رکابداران لکھنؤ بھجوادیئے۔ اس طرح چچا صاحب مرحوم اور نواب مغفور میں راہ و رسم اتحاد قائم ہوگئی تھی، دوسری وجہ یہ ہوئی کہ میرے حقیقی پھوپی زاد بھائی مرزا غلام فخر الدین خاں بن نواب علی بخش خاں[1] بن نواب الٰہی بخش خاں المتخلص بمعروف بسفارش عم بزرگوار حیدر آباد دکن میں خدمت تحصیلداری سرپور ٹانڈور پر مقرر ہوچکے تھے۔ اس خاندان کی حکایت عجیب و غریب اور مصداق فاعتبروا یا اولی الابصار ہے۔ نواب الٰہی بخش خاں و نواب احمد بخش خاں ملازم دربار ریاست الور تھے۔ ان کے حسن کارگزاری کے باعث ریاست الور سے جاگیر لوہارو قریب اسّی ہزار روپیہ سالانہ کی اور اسی قدر جاگیر فیروز پور جھرکا بسفارش صاحبان انگریز دربار شاہی سے عطا ہوئی تھی۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف صوفی مشرب درویش مسلک اور تارک الدنیا تھے۔ سیکڑوں مریدین شب و روز ان کی ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے اور ہر مرید کو کھانا کپڑا اور نقد سرکار نواب سے ملا کرتا تھا۔ علاوہ اس کے عام طور پر روزانہ لنگر بھی جاری تھا محفل سماع روز دھوم سے ہوا کرتی تھی خود بھی شاعر تھے یہ

---

[1] برادر زادہ نواب صاحب لوہارو۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب صاحب کے بھائی تھے۔ درویش صفت اور گوشہ نشین بزرگ تھے ان کی صاحبزادی مرزا نوشہ غالب سے منسوب تھیں۔ نواب غلام فخر الدین خاں راقم کے پھوپی زاد بھائی اور خسر تھے ۱۲

شعر ان کا مجکو یاد ہے ؎

اس ضعیفی میں بھی کم ہوویں گے لہری ہم سے

سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہم سے

ریاست کی سند نواب احمد بخش کو حاصل ہوئی مگر وہ اپنے بھائی کی خدمت میں رہتے تھے اور کل اخراجات نواب کے کمال کشادہ دلی کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے۔ نواب کے فرزند نواب علی بخش خاں سیر و سفر کے واسطے باہر نکل گئے تھے اور ایک عرصہ تک حیدرآباد دکن میں نواب امیر کبیر کے ہاں مہمان رہے ان ہی کی سفارش سے داروغہ محمد مقیم خاں نواب امیر کبیر کے ہاں ملازم ہوئے اور وہ رسوخ حاصل کیا کہ ان کے ہاں کے مدار المہام مقرر ہوئے، اور خانی اور بہادری کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ ان کا بیٹا حمزہ علی خاں مجھ سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ حمزہ علی خاں کی بیٹی کے ساتھ نواب اقبال الدولہ فرزند خرد نواب رشید الدین خاں وقار الامرا کا نکاح ہوا۔ ان کے بطن سے ایک صاحب زادہ نواب ولی الدین خاں پیدا ہوئے۔ ان صاحب زادہ کی تعلیم کے واسطے میں نے اپنے لڑکوں کے استاد مولوی ہدایت اللہ[1] مرحوم کو مقرر کرایا تھا جو ان کے ساتھ انگلستان بھی گئے تھے۔ یہ صاحب زادہ مجھ سے اجمیر شریف میں ملنے کو آئے تھے۔ الغرض خاندان لوہارو سے ہمارے دو رشتے ہوئے یعنی پھوپی امانی خانم کا نکاح نواب علی بخش خاں سے ہوا، گو زن و شوہر میں ہمیشہ نااتفاقی رہی اور دادا مرزا نوشہ کا نکاح دختر نواب الٰہی بخش خاں سے ہوا۔

---

[1] مولوی ابو محمد ہدایت اللہ پارسی نسل تھے۔ ان کے والد مسلمان ہوئے تھے۔ مولانا عربی۔ فارسی اور انگریزی میں عمدہ لیاقت رکھتے تھے۔ عربی میں علامہ تھے۔ میرے بھی استاد تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۸ء (غرۂ جمادی الاول) میں ہوا۔ قادریوں کے مقبرہ کے احاطہ میں قریب مسنعد پورہ مدفون ہیں۔ ان کی قبر پہ میں نے نام وغیرہ کندہ کرایا ہے ۱۲ ذوالقدر جنگ

بچپن میں جب میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا تو دادی مجھ کو ایک دونی دیا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بی بی میں کبھی ہمیشہ اَن بَن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ مغرور و متکبر تھیں مگر مرد اس عالی دودمان کے کمال درجہ احباب پرست، خوش رفتار و خوش گفتار، کنبہ پرور تھے۔ چنانچہ ہز ہائنس نواب لوہارو حال (یعنی **نواب سر امیر الدین**) اپنے خاندان کے بہت اچھا نمونہ ہیں۔ **فیروز پور جھرکا** جو ان کے قبضہ سے نکلا اس کی بھی عجیب حکایت ہے۔ **فریزر** صاحب کلکتہ سے رزیڈنٹ ہو کر دلی میں آئے۔ آدمی زندہ دل عیّاش طبع تھے پہلے انھوں نے ایک خوب صورت میواتن کو رکھا۔ اس کی گیت اس زمانہ میں مشہور تھا اس کا مصرعہ یہ تھا ؎

دُمر کلکتہ سے چلا فریجن پانچوں پیر منائے رب جانے پانچوں پیر منائے

مگر ایک مصرعہ اور بھی یاد رہ گیا ؎

پیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ میری سرن کرسی کا بیٹھنا سیکھ

اس کے بعد مشہور ہے کہ فریزر نے **نواب شمس الدین[۱] خاں** کی بہن جہاں گیرا نامی کو کہیں

---

[۱] جنرل ہاروی اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ فریزر صاحب نے نواب صاحب کے سامنے اُن کی بہن کا نام لیا تھا اور یہ نواب صاحب کے لئے باعث اشتعال ہوا۔ فریزر صاحب کے قاتل کا نام کریم خاں معروف بہ "بھر مارو" تھا۔ شبہہ نواب شمس الدین خاں پر ہوا اور مقدمہ میں جرم قتل ان پر ثابت ہوا۔ اور ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب اس الزام میں پھانسی چڑھائے گئے۔ مقام پھانسی دہلی میں کشمیری دروازہ کے قریب تھا نواب نے اُس روز ہلکے سبز رنگ کا نہایت مکلف لباس پہنا تھا مگر پھانسی کے وقت وہ کپڑے اوتار دئے گئے تھے ونسنٹ سمتھ اپنی کتاب (Rambles and Recollection of an Indian official) مرتبہ میجر جنرل اسلیمن میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ زمین پر جس وقت لاش تڑپی تو دفعتہً منہ نواب کا کعبہ کی طرف ہو گیا۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا اور دیکھئے کلیات غالب مرتبہ علی بخش خاں صفحہ ۳۔

دیکھ لیا۔ نواب کو جب یہ خبر پہونچی تو اپنے ایک جاں نثار کے ذریعہ فریزر کو قتل کرا دیا صاحبان انگریز نے نواب کو بحکمت گرفتار کر کے پھانسی دے دی اور فیروز پور جھرکا ضبط کر لیا رکھتے ہیں شمس الدین خاں کسی کم نسب عورت یا طوائف کے بطن سے تھے۔ مرزا داغ مشہور شاعر کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ انھیں نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے۔ مرزا داغ کی ایک اور بہن کسی انگریز مارٹن نامی سے تھی اس کا نام نواب بیگم تھا اور وہ بہت تعلیم یافتہ اور شکیلہ اور جمیلہ تھی اس کا ایک شعر مجکو یاد ہے ؎

چلے آؤ جلدی سے دیکھے گا کون

مرا دن ہے بدتر شب تار سے

یہ نیک بخت نہایت عابدہ زاہدہ تھی ایک بڑے ذی علم درویش سے جے پور یا اجمیر شریف میں نکاح کیا تھا۔

آمدم بر سر مطلب۔ وجہ سوم یہ تھی کہ جنرل بیرو جو ہمارے مربّی تھے وہ فالج میں مبتلا ہو کر اپنے وطن انگلستان چلے گئے تھے۔ ایسا ہر دل عزیز حاکم اب کہاں آتا ہے۔ حالت مرض میں ڈاکٹر نے ممانعت کی تھی کہ کوئی ان کے پاس نہ جانے پائے۔ اجیتیا سنگھ لنگڑے ایک تعلقدار موقع پا کر اس کے کمرے کے آتش دان میں چھپ رہے اور جب جنرل بالکل تنہا اپنے کمرے میں رہے۔ یہ آتش دان سے نکل کر اُس کے پاس پہونچے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوب روئے۔ میم دوڑی ہوئی آئی اور راجہ کو باہر نکالا۔ حیدرآباد کے قصد سے قبل ایک عجیب واقعہ ہوا یعنی میں جب کالج سے گھر آیا تو ایک برہمن مفلوک الحال دروازہ پر کھڑا ہوا تھا پوتھی بغل میں دبی ہوئی تھی اس کے سوال پر میں نے کہا کہ کیوں جھوٹی باتیں بنا کر حرام کھاتا ہے کہیں نوکری کر ابھی تو جوان تندرست ہے اس نے جھلّا کر کہا میاں ذرا بیٹھ جاؤ اور اپنا

ہاتھ دکھاؤ میں بھی بیٹھ گیا اس نے اوّل ہاتھ دیکھا اور بعدہٗ پوتھی خوب بچار کر بولا کہ فلاں دن تم دکن روانہ ہو جاؤ گے میں ہنس پڑا اور کہا کہ لو جاؤ اور اپنا راستہ لو تمھاری پوتھی کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میاں فلاں دن میں پھر آؤں گا۔ اگر تم یہاں رہے تو تمھارے سامنے میں پوتھی کو پھاڑ کر پھینک دوں گا۔ ورنہ چلتے وقت کسی کو جو تمھارا جی چاہے میرے واسطے دیتے جانا۔ افسوس ہے کہ چلتے وقت کچھ چھوڑ جانا بھول گیا اور واقعی اسی دن روانہ ہوا۔ الغرض روزِ سفر صبح کو میں عم بزرگوار کی خدمت میں برائے سلام رخصت گیا اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن پر پہونچ کر ریل پر سوار ہو گیا۔ ایک خدمت گار گھانسی خاں نامی اعلیٰ درجہ کا خانساماں اور باورچی میرے ساتھ تھا۔

حالاتِ سفر | جل پور میں ایک روز قیام کر کے میں ہوساول پہونچا اور وہاں کے مسافر خانہ میں ایک درخت کے نیچے قیام پزیر ہو گیا۔ گھانسی خاں نے جلدی جلدی کھانا تیار کر دیا۔ صبح کو یہ قرار پایا کہ پہلے سرور آکا بھائی نواب فخرالدین خاں کے پاس چلو وہاں سے حیدرآباد چلیں گے۔ ایک بیلوں کی گاڑی کرایہ کی۔ باوجودیکہ راستہ معلوم نہ تھا مگر گاڑی بان کے کہنے پر ناگپور تک کرایہ کر لیا۔ راستہ میں پالک واڑی پہونچ کر گاڑیوان نے شرارت کی اور آگے جانے سے انکار کیا مجبوراً ایک دوکان میں آ اتر پڑا اور فکر یہ ہوئی کہ اب گاڑی کیوں کر حاصل کی جائے جو آگے بڑھیں۔ خیال آیا کہ یہاں کسی ذی حکومت سے ملو شاید کام نکل جائے۔ سہ پہر کو نفیس کپڑے پہن کر اس تلاش میں نکلا۔ قصّہ مختصر معلوم ہوا کہ ڈپٹی کالکٹر یہاں مقیم ہیں میں سیدھا ان کے پاس چلا گیا وہ باہر میدان میں کرسیاں بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ مجھکو دیکھکر بہت خاطر تواضع سے بٹھایا اور میرا نام و نشان پوچھا۔ میرا نام نشان سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا تم نے مجھکو نہیں پہچانا میں تو تمھارے چچا کا بڑا دوست ہوں

تب مجکو بھی یاد آیا ان کی حکایت عجیب ہے۔ یہ اُوناؤ میں مقرر تھے ایک مشہور بدمعاش دزد و قزاق
بہ تجسس و تلاش بسیار گرفتار کر کے ان کے سامنے پیش کیا گیا اُنھوں نے اس کو پوری قانونی
سزا کا حکم لکھدیا اس قیدی نے یہ کہا کہ میں تو جیل خانہ میں نہ رہوں گا تم اپنی ناک بچاؤ۔ چونکہ
یہ بدمعاش چند بار کسی چالاکی سے جیل خانہ سے بھاگ چکا تھا۔ ڈپٹی صاحب پر بہت خوف طاری ہوا
اور اپنا تبادلہ وسط ہند میں کرالیا۔ الغرض بعد حرف و حکایات میں نے وجہ سفر اور قصد سرپور ٹانڈہ
بیان کیا۔ ڈپٹی صاحب نے کہا تم یہیں سے سیدھے چانڈا[1] جاؤ۔ سرپور[2] پہونچ جاؤگے اور
چپراسی کو حکم دیا کہ ایک گاڑی فوراً مرزا صاحب کے پاس پہونچا دو۔ میرے سامنے کی دوکان
میں ایک اور بزرگوار فروکش تھے نام ان کا مرزا عبدالرحیم بیگ تھا۔ سفید تگا داڑھی تا بہ ناف لمبا
قد گندم رنگ بیٹھے ستار بجا رہے تھے وہ بھی مجھ سے ملنے آئے۔ بعد حالات پرسی مجھ سے کہا کہ
دیکھئے کیا اتفاق ہے آپ بھی مغل میں بھی مغل آپ بھی سرپور جا رہے ہیں اور میرا منزل مقصود
بھی وہی ہے مجھ کو بھی ایک گاڑی منگوا دیجئے تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔
الغرض گاڑی منگا دی گئی اور ہم دونوں ہمسفر و ہمصفیر ہو گئے۔ موسم گرمی کا تھا مئی یا جون کا
مہینہ تھا آفتاب کی تپش ناقابل برداشت تھی۔ ایک دھواں زمین سے اُٹھ کر تا بفلک پہونچتا تھا
دور کیا پاس کی چیز بھی اُس دھوئیں کی دیوار سے نظر نہ آتی تھی۔ یہ قرار پایا کہ رات کو سفر اور
دن کو قیام کیا جائے۔ مرزا صاحب کے پاس ایک بندوق تھی اور ایک جوان بیٹا بابو نام ہمرکاب تھا۔
بہت سی نارنگیاں گاڑی میں بھر لیں اور مغرب کے وقت پالک واڑی سے روانہ ہو گئے۔
گھانسی خاں نے ایک کلہاڑی مول لے لی تھی اس میں ایک ڈنڈا لگا لیا تھا یہ سامان جنگ

---

[1] بالارشاہ سے تقریباً چھ میل
[2] ضلع عادل آباد کی ایک تحصیل ہے۔

میرے ساتھ تھا۔ پانچ بجے نماز عصر پڑھ کر سوار ہوتے اور دن کو نو/دس بجے مناسب و سایہ دار مقام دیکھ کر اُتر پڑتے۔ دن بھر چادریں اور پلنگ کی دریاں گاڑی کے گرد لپیٹ کر آرام لیتے اسی طرح ایک مقام موسوم بہ ہینگن گھاٹ[1] پر پہونچے صبح کو چار بجے تھے رائے قرار پائی کہ یہاں اُتر پڑیئے۔ ایک درخت کے سایہ کے نیچے قیام کیا اور گھانسی خاں لوٹا لے کر وضو کے واسطے پانی لینے گیا۔ چھ سات بج گئے آفتاب بلند ہوگیا پانی کے انتظار میں نماز قضا ہوگئی آیا تو خالی لوٹا لے کر آیا تمام قصبے میں کنوئیں سوکھے ہوئے تھے حتیٰ کہ ندی کے جھرے بھی خشک۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے اس وقت مرزا عبدالرحیم بولے کہ غلطی ہوئی اب نو دس کوس پر پانی ملے گا۔ میں تو سرنگوں ہوا وہ اپنا بستہ اُٹھا لائے اور ایک مرثیہ تصنیف خود مجکو سنانے لگے۔ سن رسیدہ بزرگ آدمی تھے اس پر میں نے منغض ہو کر کہا کہ یہ کیا وقت مرثیہ خوانی کا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا تم تو کم سن جوان سرد و گرم زمانہ نا دیدہ ہو ذرا سی مصیبت میں گھبرا گئے۔

چشمِ ما بسیار ایں خوابِ پریشاں دیدہ است

یہ کہہ کر بستہ تو الگ رکھ دیا اور غالبؔ کا شعر پڑھکر طالب شرح ہوئے شعر یہ ہے ؎

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں نے باکراہ تمام ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے معنی بیان کرنے شروع کر دیئے۔ اُدھر ایک جوان آدمی دھوتی باندھے صرف ایک کرتہ پہنے درخت کی شاخ پکڑے ہوئے بغور معنی سن رہا تھا۔ اس وقت تک تو کچھ خیال نہ تھا جب وہ آگے بڑھے اور دری پر بیٹھنے کی

---

[1] قاضی پیٹھ بالارشاہ کے ریل کے رستہ پر واقع ہے۔ بالارشاہ کے بعد اب یہ قصبہ زیادہ آباد ہے۔ گرنیاں متعدد ہیں ۱۲

اجازت مانگی تو میں سمجھا کہ کوئی پنڈت یا کایستھ ہونگے۔ وہ دری پر بیٹھ گئے اور ایک دو شعر غالبؔ کے پڑھکر تشریح کے طالب ہوئے۔ مجکو نہایت حیرت ہوئی مگر میں نے معنی بیان کرنے شروع کردئے۔ عبدالرحیم بیگ چپکے سے اٹھ کر ایک طرف گئے اور وہاں سے آکر میرے کان میں کہا کہ یہ یہاں کے تحصیلدار ہیں بعدہٗ ان سے کہا کہ تحصیلدار صاحب یہ نوجوان مسافر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے پوتے ہیں تحصیلدار صاحب کھڑے ہوگئے اور کہا میں بذریعہ رسل و رسائل ان کا شاگرد ہوں اور خوب دبوچ کر مجھ سے گلے ملے اور کہا چلئے یہ سامنے دروازہ میرے مکان کا ہے صرف چند قدم کا فاصلہ ہے۔ میں نے ہر چند عذر معذرت کی مگر کیا مانتے تھے اور ہم بھی صرف بظاہر عذر معذرت کرتے ہوئے خوشی سے ان کے ساتھ ہو لئے تحصیلدار صاحب نے بہت نفیس دعوت کی جب کھانے سے فارغ ہوئے ہاتھ دھوتے وقت ایک مردہ بچھو کلی کے ساتھ میرے منھ میں چلا گیا۔ میں نے جو کلی جلدی سے باہر پھینکی تو سب حواس باختہ ہوکر میری طرف بڑھے اور تحصیلدار صاحب کی حالت قابل بیان نہیں۔ الغرض چلتے وقت ایک چھوٹا گھڑا پانی کا میری گاڑی میں رکھوا دیا اور کہا کہ میں اپنے بچّوں کا حق کاٹ کر آپ کو دیتا ہوں۔ بوقت استفسار معلوم ہوا کہ گرمیوں میں یہاں پانی بہشتی مسلمانوں کے واسطے اور کہار ہندوؤں کے لئے ہر ہفتہ دُور سے لاکر بھر جاتے ہیں تاکہ سات آٹھ روز کفایت کرے۔ کوئی پانچ بجے بعد نماز عصر ہم اس منحوس مقام سے روانہ ہوئے اور کوشش یہ کی کہ شبا شب کسی پانی کے مقام تک پہونچ جائیں۔

ایک اور واقعہ مضحک اس سفر کا قابل بیان ہے۔ مرزا صاحب اور ان کا فرزند بابو ہر وقت بندوق تلوار سنبھالے رہتے تھے اور گھانسی خاں کلہاڑی لئے ہوئے آگے آگے چلتا تھا راستہ جنگل میں تھا جستہ جستہ جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ مغرب کا وقت آگیا تھا مرزا صاحب ایک

کھیت میں جھاڑ کے پیچھے لوٹا لے کر برائے رفع حاجت گئے اور حکم دیا کہ تا واپسی ہم لوگ آگے
نہ بڑھیں۔ تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نصف جسم اسفل کھلا ہوا ازاربند پکڑے بھاگے چلے
آتے ہیں۔ قریب آ کر فرزند کو آواز دی کہ ابے نامعقول کیا دیکھ رہا ہے۔ دوسرا لوٹا لا۔ ہم سب
تعجب میں رہے کہ بھئی کیا معاملہ ہے اور بابو لوٹے کی تلاش میں گیا۔ مرزا صاحب نے ارشاد فرمایا
کہ میں بیٹھا ہوا تھا ایک شے سیاہ رنگ میرے سامنے دکھائی دی میں اس کو ارنا آپلا سمجھا اور
تنکے سے اس کو اچکایا وہ پھن کر کر کھڑا ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا کچھ دور تک وہ میرے
پیچھے بھی آیا مگر خدا نے بچا دیا۔ اتنے میں بابو لوٹا لے کر واپس آیا اور کہا کہ باوا جان وہ حقیقت
میں ارنا آپلا ہی تھا۔ اس پر باوا نے ایک تھپڑ اس کو رسید کیا اور کہا کہ تو مجھکو جھٹلاتا ہے۔
الغرض وہاں سے آگے بڑھے چاندنی رات تھی کہ یکایک مرزا صاحب نے حکم دیا کہ گاڑیاں
روکو اور مجھ سے کہا کہ آپ بھی کچھ آواز سنتے ہیں۔ میں نے جو غور کیا تو واقعی ایک آواز مثل
گھنٹوں کے مسموع ہوئی۔ مرزا صاحب خود تو بندوق لے کر گاڑیوں کے پیچھے برائے حفاظت
کھڑے ہوئے اور بیٹے کو سیدھے ہاتھ پر مع تلوار قائم کیا اور گھانسی خاں کو مع کلہاڑی گاڑیوں
کے آگے کھڑا کیا ایک میں تنہا رہ گیا مجھ سے کہا کہ آپ بائیں ہاتھ پر کھڑے ہو جئے جس وقت
ڈاکو روبرو آئیں مجھ کو آواز دیجئے اتنے میں وہ آواز قریب ہی آ گئی۔ سب سے پہلے میری
نگاہ پڑی میں نے دیکھا کہ ایک گنوار برہنہ جسم ایک لکڑی کندھے پر رکھے ہوئے اور اس میں
کچھ بوجھ لٹکا ہوا بھاگتا چلا آتا ہے۔ اس کی لکڑی میں شاید گھونگرو بندھے ہوئے تھے۔
مجکو اس وقت ہنسی آ گئی اور آواز دی کہ مرزا صاحب ڈاکہ آن پہونچا۔ مرزا صاحب گھبرا کر
بولے کہاں کس طرف۔ الغرض نہایت شرمندہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ بعد طے منزل کسی قدر
پتھریلی زمین اور گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ مرزا صاحب دلیل راہ تھے راستہ میں پہنچے

بیس روپیہ قرض مانگے کہ سرَور پہونچ کر ادا کردیئے جائیں گے اور رائے یہ قرار پائی کہ ایسے گھنے جنگل میں شب کا سفر ناجائز ہے ایک گاؤں کے باہر جس کا نام میں بھول گیا درخت کے نیچے فروکش ہوگئے۔ راستہ کی تکان کے باعث غفلت سے آنکھ لگ گئی صبح کو جو میں نماز کے واسطے اُٹھا تو دیکھا کہ مرزا صاحب مع گاڑی غائب۔ گھانسی خاں کو بہت غصّہ آیا اور کہا کہ ابھی بہت دور نہ گئے ہونگے میں پکڑ لاتا ہوں مگر اس خیال سے کہ پردیس اور مسافرت اور گھنا جنگل ہے میں نے اس کو نہ جانے دیا اور اب اس فکر میں بیٹھا کہ کدھر جاؤں اور کس سے راستہ دریافت کروں اتنے میں ایک نوجوان سفید پوش پنجابی وضع وہاں آئے اور مجھکو دیکھکر مستفسر احوال ہوئے وہ اس مقام کے ڈاکٹر تھے اور مجھ سے کہا کہ ہم تو جنگل میں پڑے ہوئے ہیں دنیا کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ آپ تازہ وارد ہیں یقین ہے کہ اخبار پڑھتے ہونگے کیا کوئی جہاز حجاج کا سمندر میں ڈوب گیا۔ میرے والدین حج کو گئے ہوئے ہیں اس واسطے متردد ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا واقعہ ہوتا تو مجھکو ضرور اس کا علم ہوتا اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ غلط راستہ پر کیوں آئے چاندا تو یہاں سے مشرق کی طرف بہت دُور ہے آپ کو اُلٹا جانا پڑے گا اور میں نے تو سرَور کا نام بھی نہیں سُنا مگر ہاں سرحد مغلئے یہاں سے چند گھنٹے کے فاصلے پر ہے وہاں آپ کو پتا لگ جائے گا۔ گھانسی خاں نے کہا کہ ہم کو ایک بدمعاش نے دھوکا دیا اور اس مقام پر پہونچا کر مع بیس روپیہ کسی طرف بھاگ گیا۔ ڈاکٹر کو ہماری بیچارگی پر افسوس آیا اور کہا کہ بیگار میں نکلوا دیتا ہوں آپ سرحد مغلئی میں داخل ہو جائیے وہاں منزل مقصود کا پتا لگ جائے گا۔ الغرض ایک ڈھیر انھوں نے میرے ساتھ کر دیا اور کہا کہ آگے گاؤں پر یہ دوسرا ڈھیر دے آئے گا۔ اسی طرح آپ سرحد پر پہونچ جائیں گے۔ کچھ ڈھیڑوں کو دے دیا کرنا۔ اب وہاں سے روانہ ہوئے۔ دوپہر کو ایک گاؤں میں پہونچے اور ڈھیر نے گاؤں سے واپس آکر کہا کہ صاحب اب کو توال بیگار دینے سے انکار کرتا ہے۔ میں از حد پریشان ہوا

اور اُس ڈھیر سے کہا کہ یہاں کا کوتوال کون ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ یہاں کے ڈھیڑوں کا جمعدار ہے
اس پر گھانسی خاں نے کہا میں اس کو پکڑے لاتا ہوں آپ اس ڈھیڑ کو ابھی نہ جانے دیجئے گا۔
چنانچہ فی الحقیقت گھانسی خاں ایک ڈھیڑ ننگ دھڑنگ کو پکڑ لایا اور مجھ سے کہا کہ اگر آپ حکم
دیجئے تو میں اس کو تحصیلدار صاحب کے پاس لے جاتا ہوں وہ یہاں سے قریب خیمہ زن ہیں۔
یہ سن کر کوتوال صاحب پریشان ہوئے اور کہا کہ میں ڈھیڑ دیتا ہوں یہاں سے ڈیڑھ دو کوس
پر سرحد ہے مگر آٹھ آنے اس کے واسطے اور ایک روپیہ اپنے واسطے لوں گا۔ گھانسی خاں نے
ایک دھول اس کے لگائی اور کہا کہ ابے تحصیلدار صاحب کے دوست سے یہ تکرار کر رہا ہے
مگر میں نے کہا کہ اچھا ڈھیر دیدے تجکو اور اس کو دونوں کو انعام دوں گا۔ عصر کے وقت
وردا ندی پر پہونچا یہ ندی پایاب تھی اس کے پار ہو کر مغلئی میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی
ایک گاؤں تھا وہاں پہونچے تو بہت سے گاؤں والے میرے گرد جمع ہو گئے۔ اس عرصہ میں
ایک شخص سفید پوش، دراز قامت، سانولا رنگ، کمر بستہ، دستار بسر، شمشیر بکف، ڈھال برپشت
طپنچہ و پیش قبض اور کٹار وغیرہ در کمر بارہ سنگھا بنا ہوا میرے پاس آیا بعد استفسار حالات
اس نے میری بڑی خاطر کی اور کہا کہ سرپور ٹانڈور یہاں سے چار پانچ منزل ہے اور
چارپائی وغیرہ ضروری چیزیں اس نے حاضر کردیں وہ اس گاؤں کا ٹھیکہ دار تھا اور فتح خاں
اس کا نام تھا۔ گھانسی خاں شام کی تیاری میں مصروف ہوا۔ میں فتح خاں سے باتیں کر رہا
اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ سالار جنگ کا رعب حکومت اس کورده اور اس جنگل میں بھی
قائم ہے اور معلوم ہوا کہ راستہ نہایت خطرناک اور دشوار گزار ہے گو قزّاق اور راہ زن کا
اب خطر نہیں رہا مگر مردم خوار شیر اس جنگل میں بکثرت ہیں پچاس ساٹھ قدم پر مسافرین کے
ہوشیار رہنے کے واسطے باگھورے بنا دیئے ہیں گاڑیوان نے آگے بڑھنے سے انکار کیا۔

فتح خاں نے کھانا منگا دی اور بیگار ساتھ کر دیا۔ راستہ میں مجھکو تو گیدڑ بھی نہ دکھائی دیا بالآخر راجورا پہونچے یہاں پر اس گاڑیوان نے آگے بڑھنے سے انکار کیا میں بہت زیادہ پریشان ہوا کہ نئی ریاست نئی حکومت گویا نئی دنیا، نیا دانہ، نیا پانی گھنا جنگل اشجار سر بفلک کشیدہ باہم اس قدر چسپیدہ کہ دھوپ زمین تک نہیں پہونچتی اور موذی اور غیر موذی ہر قسم کے جانوروں سے بھرا ہوا کوئی ہتیار پاس نہیں۔ راجورا مغلئی کی تحصیل اور صدر مقام تھا میں نے نفیس کپڑے پہنے اور زرق برق بن کر تحصیلدار کی ملاقات کو گیا۔ وہاں ایک چپراسی نے دھمکا دیا کہ سرکار آرام خاص میں ہیں دو تین بجے باریابی ہوگی۔ میں وہاں سے پریشان تر واپس ہوا۔ ہنوز چند قدم چلا تھا کہ کئی سپاہی وردی پہنے ہوئے دکھائی دیئے دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ کوتوالی ہے اور امین صاحب کی کچہری ہے میں نے یہاں قسمت آزمائی کا قصد کیا اور ایک سپاہی سے کہا کہ امین صاحب کو اطلاع کرو کہ ایک مسافر ملنے کو آیا ہے۔ امین صاحب نے کچہری میں آنے کی اجازت دی۔ جوں ہی میں ان کے سامنے گیا امین صاحب دوڑ کر میرے گلے چمٹ گئے اور کہا اس کوردہ میں آپ کیوں کر آئے۔ میں حیرت میں تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں مگر بظاہر میں بھی بہت تپاک سے ملا۔ گویا میں نے بھی پہچان لیا۔ امین صاحب نے دعوت کا سامان مہیا کیا اور باہم حرف و حکایات میں مشغول ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ مرزا ولی بیگ[1] کے

---

[1] مرزا ولی بیگ و تہور خاں صاحب واجد علی شاہ کے مقربین میں سے تھے بعد غدر حیدرآباد چلے گئے تھے مرزا ولی بیگ کوتوال شہر مقرر ہوئے نہایت دلیر سردار تھے حتیٰ کہ عربوں اور پٹھانوں پر بھی اپنا رعب جما دیا تھا۔ تہور خاں صاحب پانسو روپیہ ماہوار پر منصب دیوانی پر سرفراز ہوئے امیرانہ طبع امیرزادے تھے پانسو روپیہ ماہوار ان کا پانچ روز کا خرچ تھا ہر وقت وزارت پناہ سے طالب امداد رہتے تھے اور وزارت پناہ بھی بوجہ ان کے عالی خاندان اور اعلیٰ مرتبت ہونے کے امداد میں دریغ نہ کرتے تھے۔ حافظ قرآن مجید اور نہایت پابند صوم صلوٰۃ شب زندہ دار تھے ان کے مکان پر پردیسی مہمانوں کا ہجوم رہتا تھا اور جب روپیہ نہ رہتا تھا تو ایک چادر بچھا کر اس پہ بھنے چنوں کا ڈھیر لگا دیتے تھے اور خود مع مہمانوں کے پیٹ بھر لیا کرتے تھے۔ میرے رشتہ دار تھے اور مجھ پر مہربان تھے ۱۲

حقیقی بھتیجے مرزا احمد بیگ ہیں اور اکثر ہم سے لکھنؤ میں ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز آرام سے
قیام کیا دوسرے روز وہاں سے روانہ ہوئے۔ امین صاحب نے دو کو توالی کے جوان ساتھ
کر دیئے۔ قطع راہ کرتے ہوئے سرآور پہونچے۔ آغا بھائی سے ملے ان کو از حد تعجب ہوا کہ میں
کیوں کر صحیح سالم سرآور پہونچا اور میری جرائت کے بہت معترف ہوئے۔ وہاں میں نے تمام
موسم گرما و بارش ختم کیا بعدہٗ ادھر میں نے حیدر آباد جانے کی تیاری کی اُدھر وہ رخصت
لے کر دہلی جانے کے واسطے مستعد ہوئے۔ سرآور ایک نہایت مختصر قصبہ ہے اور اس گھنے جنگل کے
بیچ میں واقع ہے۔ جھونپڑیوں ٹٹیوں میں قوم گونڈ آباد ہیں۔ ننگے منگے سیاہ رنگ ایک لنگوٹی
اور ایک کپڑا سر پر لپیٹا ہوا۔ عورتوں میں ایک کپڑا چھاتیوں سے سیدھے کندھے سے لے کر
بائیں بغل سے نکل کر پیچھے بندھا ہوا یہ ان کی پوشاک مردوں کا نقشہ ترکمان سے بہت مشابہ
عورتیں بجز اس کہ نہایت سیاہ چمکتا رنگ ہے نقشہ نہایت خوب صورت اور سر کے بال بہت دراز۔
اس قصبہ میں ایک گڑھی اگلے زمانے کی اب کھنڈر تھی صرف اس کا دروازہ پختہ رہ گیا تھا
جس کو بنک (Bunk) کہتے تھے۔ چنانچہ میں بھی ایک چھپر میں مقیم ہوا جس کے گرد ٹٹی کی
دیوار قد آدم تھی تمام گرمی اور برسات اس ہی چھپر میں گزرا نی مشغلہ یہ تھا کہ کچھ انگریزی کتابیں
ساتھ تھیں ان کو پڑھا کرتا تھا اور خود بھی انگریزی نثر لکھنے کی مشق کرتا تھا۔ مانک راؤ تحصیل کا
محرر مجھ سے انوار سہیلی پڑھا کرتا تھا۔ اس تعلقہ کے عمل دار منشی امین الدین پستہ قد اس قدر کہ
میرے شانہ تک آتے تھے۔ ریش دراز تا بہ ناف فارسی میں نظم و نثر کے بڑے مدعی حتی کہ مقدمات کا

لے ایک مقدمہ میرے سامنے بھی اُنھوں نے فیصل فرمایا دو جوان لڑکیاں قوم گونڈ برہنہ جسم کہ جنون کی پردہ دری
نہ خرد کی بخیہ گری کی ضرورت عمل دار صاحب کے روبرو اس جرم میں پیش کی گئیں کہ انھوں نے ایک شخص کو مار ڈالا ہے

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

فیصلہ بھی مقفٰے ومسجّع عبارت میں تحریر کرتے تھے۔ دفتر تحصیل کی جانچ کے واسطے اور چند مقدمات کے
فیصلہ کے واسطے اس قصبہ میں آئے ہوئے تھے۔ امین اس تعلقہ کے کسی انگریز کے بٹلر یعنی خانساماں
تھے نہ پڑھے نہ لکھے۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر مدراسی عمامہ اور صرف ایک کرتہ دربر ایک رومال
بجائے پائے جامہ بندھا ہوا مدراسی زبان ایک غول عرب کا برائے حفاظت خزانہ تحصیل بسرکردگی
ایک کبیر السن عرب جس کو جاؤش کہتے تھے وہ ہر روز بعد ظہر مجھکو قہوہ پلایا کرتے تھے۔ امین صاحب کا
یہ حال کہ گھوڑے کا دانہ گھانس روزانہ اور رہائش ونگہداشت رعایا کے سر تھی۔ کپڑے وہی جو
اوپر بیان ہوئے۔ دال چانول وغیرہ جنس ماہانہ بنیوں سے وصول کرتے۔ گوشت کو جی چاہتا
تو جنگل سے ہرن وغیرہ مار کر سکھا رکھتے تنخواہ پوری سالم ومسلّم بچا رکھتے۔ میں اور آپ کا بھائی مرحوم
یا مرغیاں کھاتے یا ہفتہ میں ایک بار بکرا حلال ہوتا تو گوشت کھانے والوں کو گوشت میسر ہوتا۔
اللہ تبارک تعالی نے مجھکو ایک بار یہاں سانپ سے بچایا اور ایک بار شیر سے۔ میں اور امین صاحب
اکثر سہ پہر کو تالاب کی طرف نکل جاتے تھے گڑھی کی منہدم دیوار میں ایک سانپ سفید ناگ نہایت
قوی اور دراز اکثر قریب مغرب بل سے نکل کر آدمیوں کی تاک میں بیٹھا رہتا تھا اور ادھر کا
راستہ بند کر دیا تھا۔ ایک دن سہ پہر کو میں اور امین صاحب تالاب کی طرف گئے وقت مغرب کا
قریب آیا میں تو برائے نماز جلدی واپس آگیا۔ امین صاحب کو یاد نہ رہا وہ میرے بعد اسی راستے
سے واپس آئے۔ سانپ پھن اٹھا کر ان کی طرف مخاطب ہوا یہ سمجھ گئے کہ موت نے آن گھیرا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) بروقت سوال ان لڑکیوں نے جرم کا اقبال کیا اور مزید بیان یہ دیا کہ ہم منتر پڑھکر
جوہیں جھاڑی جڑ سے اکھاڑی یہ مر گیا اس اقبال جرم پر عملدار صاحب نے سزائے قتل عمد کا فتوی دیدیا۔ مجھ سے
خاموش نہ رہا گیا اور ان سے کہا کہ برائے خدا ان بے گناہوں کا خون اپنے سر پر نہ لیجئے علاوہ اس کے محکمۂ اعلیٰ سے
ضرور یہ فیصلہ منسوخ اور آپ پر اعتراض ہوگا۔ خلاصہ ایں کہ ان لڑکیوں کی جان تو بچ گئی مگر معلوم نہ ہوا کہ دوسرا
فیصلہ کیا عز صدور پایا ۱۲

امین صاحب نے اس پر بندوق سر کردی گولی عین اس کے پھن پر پڑی اندھیرا ہوگیا تھا یہ
سکتہ کی حالت میں کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے کھڑے رہے جب سانپ نہ آیا تو ذرا ہوش درست
ہوئے۔ بندوق ہاتھ سے گر گئی تھی اس کو چھوڑ کر بھاگے اور میرے مکان ہی میں دم لیا
اس طرح کہ میری چارپائی پر گر پڑے اور سانپ سانپ پکارتے رہے۔ دوسری بار ایک
شب کو اسی رات کے بعد قصبہ میں شیر شیر کا غل مچا۔ چاؤش مع چند عرب توڑے دار بندوق
لے کر میرے پاس آ پہونچا وہ شیر میری ہی قیام گاہ میں کود کر پائخانہ کی ٹٹی میں جا بیٹھا عبدؒ
نامی چاؤش کے داماد نے یہ جرأت کی کہ وہیں جا کر اُس کو مارا۔

سفر از سر پور تا حیدرآباد دکن

مانک راؤ میرا ایک شاگرد ایک عربی گھوڑا میرے پاس لایا سبزہ رنگ بڈھا تھا
مگر قد کا دراز تھا بارہ روپیہ کو میں نے خرید کیا۔ بھائی صاحب تو براہ چاندا دہلی
روانہ ہوئے۔ میں اس گھوڑے پر سوار کھا چہ میں سامان گھانسی خاں اور دو کوتوالی کے
جوان ساتھ۔ علی الصباح امین صاحب اور چاؤش سے رخصت ہو کر حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا۔
عصر کی نماز میں نے ایک میدان میں پڑھی۔ یہاں قافلہ بنجاروں[1] کا پڑا ہوا تھا گرد اس میدان کے
عظیم الشان گھنا جنگل تھا اور اسی میں راستہ تھا بنجارے سب مسلح تھے۔ لوگوں نے رائے

---

[1] بنجاروں کی بابت یہاں پر ایک امر عجیب میرے دل پر القا ہوا معلوم نہیں کہ ناظرین ہذا مجھ سے متفق ہونگے یا نہیں -

انگریزی مورخین کا بیان ہے کہ زمانۂ راجگان ہنود قدیم و عہد بادشاہان مسلمین تمام اقلیم ہند پر قحط و مجد بیہ کا دورہ اس قطعہ ملک میں رہا کرتا تھا اور بوجہ عدم توجہ حکومت بندگان خدا کی جانیں تلف ہوا کرتی تھیں اور اس بنا پر اکثر صاحبان انگریز کو ناز ہے کہ ہماری حکومت میں قحط نابود ہوگیا۔ تمام ممالک محروسۂ

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

رائے دی کہ شب کو یہاں قیام کیا جائے اور صبح کو جنگل میں داخل ہوں مگر جوانی کی امنگ اور جسمانی طاقت کے گھمنڈ میں میں نے اسی وقت داخل ہونے کا قصد کیا بالخصوص جب یہ سنا کہ دو تین گھنٹے میں جنگل سے نکل کر فلاں قصبہ میں پہونچ جائیں گے۔ لیکن جب لوگوں نے بنجاروں کی دھمکی دی تو میں خود بڑے بنجارے کے پاس گیا وہ ایک چارپائی پر مثل راجگاں مسند پہ بیٹھا ہوا تھا۔ لال پگڑی سر پر ایک کمری در بر دھوتی گھٹنوں تک ایک حقہ سامنے لگا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی چارپائی پر بیٹھ گیا اور راستہ کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا جنگل دشوار گزار اور جانوران موذی سے خطرناک ہے۔ لیکن اگر بیل تیز رفتار ہیں تو اندھیرا ہونے تک پار ہو جاؤ گے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

سرکار عظمت مدار میں نرخ یکساں ہو گیا اور رعایا خوش حال ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ ہر طرف پختہ سڑکیں اور جابجا نہریں بنا دی گئی ہیں اور ریل گاڑی نے ہر شہر و قصبہ بلکہ گاؤں گنویں میں اناج پہونچانا آسان کر دیا۔ یہ دعویٰ میرے نزدیک بے دلیل معلوم ہوتا ہے گو بے شک سڑکوں نہروں اور ریلوں سے رعایائے ہند کو بہت آرام و آسائش ملی ہے مگر ساتھ ہی اس کے افلاس بھی بڑھ گیا اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ریل و نہر سڑک و دیگر آرام دہ نوایجادوں کا مالی فائدہ صرف ہماری آقا قوم کو پہونچ رہا ہے اور اہل ہند ان کے طفیل سے اور مغربی ترقی علوم و فنون کی نوایجادوں کی وجہ سے صرف آرام و آسائش کی زندگی سے مستفیض ہو رہی ہیں۔ برخلاف اس کے زمانۂ وحشت عہد راجگان ہنود و شاہان مسلمین میں یہ آسائش و آرام و لطف دنیاوی زندگی نہ تھا مگر تمام اقلیم ہند اس زنّاردار قوم بنجارہ کے طفیل آباد و شاد تھی اور اناج و مال و دولت اقلیم ہند سے باہر نہ جاتا تھا بلکہ ملک ہی میں خرچ ہوتا تھا۔ امساک باراں کی اصلاح قوت بشری سے باہر ہے مگر گاہ گاہ اگر کسی حصۂ اقلیم میں قحط و مجدبہ واقع ہوتا تھا تو یہ قوم دستگیری کرتی تھی اب یہ قوم بھی دائرہ شائستگی مغربی میں آ کر مفقود ہو گئی ہے کاش اگر کوئی بنجارا بی اے، ایم اے ڈگری یافتہ اپنی قوم کی تعریف تاریخ مع رسم رواج و مذہب لکھتا تو یہ تصنیف بھی بہت دلچسپ ہوتی ۱۲

میں نے اس سے ایک بنجارا ساتھ لیا اور اللہ تبارک تعالیٰ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہوا
درخت سربفلک کشیدہ اور شاخ در شاخ اس قدر چسپیدہ کہ تھوڑی دور چل کر معلوم ہوا کہ گویا
رات ہو گئی۔ دو جوان کوتوالی کے بندوق لئے ہوئے گاڑی کے آگے آگے گھانسی خاں
کلہاڑی باز اور بنجارا ہتیار بند گاڑی کے پیچھے پیچھے اور میں گھوڑے پر سوار کبھی داہنے
اور کبھی بائیں میں نے بنجارے سے پوچھا کہ یہاں راہزن اور چور وغیرہ کا اندیشہ تو
نہیں ہے۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ صاحب سالار جنگی حکومت ہے یہاں سے
حیدرآباد تک سونا اچھالتے ہوئے چلے جاؤ۔ الغرض آدھا جنگل طے کیا تھا کہ کھاچر کے
نیچے کی لکڑی ٹوٹ گئی۔ اب سب ساتھی پریشان ہو گئے۔ گھانسی خاں نے کہا کہ میاں
ایک جوان ساتھ لو اور تم پار ہو جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں تم لوگوں کو اکیلا نہ چھوڑوں گا۔
کوتوالی کے جوانوں نے کہا کہ ہم جاتے ہیں اور بڑھئی کو پکڑ لاتے ہیں۔ گھانسی خاں نے
چپکے سے کہا کہ اگر ان کو جانے دو گے تو پھر یہ دن کو واپس نہ آئیں گے اور ہم یہیں پڑے
رہیں گے۔ الغرض سوکھے پتے اور لکڑیاں جمع کی گئیں اور ان کے ڈھیر چاروں طرف
روشن کئے گئے۔ گھوڑا، بیل، کھاچر سے باندھے گئے آدمی گرد کھاچر کے بیٹھے۔ میں
درخت پر چڑھ گیا اور ایک موٹی سی شاخ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور اس کے
تنے سے پیٹھ لگا لی۔ تمام شب بفضلہ تعالیٰ کسی جانور کی آواز تک نہ سنائی دی۔ صبح کی
روشنی ہوئی تو میں نے نماز پڑھی اور کوتوالی کا جوان گاؤں گیا اور ایک دو ساعت
کے بعد بڑھئی لایا کوئی دس بجے کے قریب وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک
خشک نالا پڑا۔ جوانوں نے غل مچایا کہ گاڑی ٹھیراؤ۔ یہاں شیر کے پنجے ریت میں
دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے گاڑی نہ ٹھیرائی اور گھوڑے کو دوڑاتا ہوا نالے کے پار

ہوگیا اُس وقت گھوڑے نے کنوتیاں اُٹھائیں اور بیتابی ظاہر کی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے ٹیلے پر خدا کا شیر بیٹھا ہوا تھا پشت ہماری طرف تھی اور فقط اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور ٹیلے سے اُتر دوسری طرف راہی ہوا۔ الغرض ہم گوداوری کے کنارے پر پہونچے وہاں چند سفید پوش شاید ملازم ریاست ٹھیرے ہوئے تھے۔ کھاچر کو اسی کنارے پر چھوڑا۔ گھوڑے کو ٹوکرے سے باندھا اور خود مع ہمراہیان ٹوکرے میں بیٹھ کر ندی پایاب ہوا۔ وہاں کسی گاؤں سے کوتوالی کے جوان ایک کھاچر حیدرآباد تک کرایہ کر کے لے آئے اور مجھ سے رخصت ہو کر مع بنجارا واپس گئے۔ میں منزل بہ منزل شریفوں کے جنگل میں شریفے کھاتا ہوا کریم نگر پہونچا۔ قصبہ آباد تھا تعلقدار وغیرہ حکّام کا مستقر تھا۔ وہاں ایک روز زیر درخت بیرون قصبہ قیام کیا اور پھر منزل بہ منزل امجال پہونچا۔ دوسرے روز امجال سے چل کر حیدرآباد میں داخل ہوا۔ بھائی صاحب نے چلتے وقت ایک خط مجھ کو دیا تھا اس کے لفافہ پر لکھا ہوا تھا۔ بلدۂ حیدرآباد محلہ مستعد پورہ نزد برادرم حکیم علی رضا برسد۔ میں سیدھا دریافت کرتا ہوا مستعد پورے پہونچا اور حکیم صاحب کے دروازے پر آواز دی۔ ایک نوجوان گندم رنگ میانہ قد لنگی باندھے ہوئے کالا سا رومال سر پر لپیٹے ہوئے باہر نکلے۔ بعد سلام علیک کے وہ خط میں نے ان کو دیا اُنھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ بھائی صاحب سید علی رضا گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ میں محمد رضا ان کا برادر خُرد ہوں۔ ان کا مکان مسکونہ خالی ہے آپ تشریف لائیے۔ البتہ ان کے آنے کے بعد

دوسرے مکان کی فکر کی جائے گی۔ میں تھکا ماندہ اس کو غنیمت سمجھا اور اس
مکان میں آتر پڑا۔ لکھنؤ سے چل کر میں حیدرآباد نو دس ماہ بعد پہونچا۔ مئی سنہ ۱۸۷۲ء
میں لکھنؤ چھوڑا اور سنہ ۱۸۷۳ء کی اوائل میں حیدرآباد پہونچا۔ عم بزرگوار رحمۃ اللہ
تعالیٰ علیہ نے مجھکو دو خط دیئے تھے۔ ایک خط بنام نواب مختار الملک دیوان
دکن اور دوسرا بنام کندا سامی مصاحب خاص وزیر باتدبیر موصوف۔

کوشش برائے باریابی دربارِ وزارت

حکیم علی رضا تو کئی ماہ گاؤں ہی میں رہے۔ میں اس ہی مکان میں مقیم رہا۔ یہ دونوں بھائی حکیم نیاز علی بادشاہی طبیب کے بیٹے تھے۔ شہر دہلی محلہ دریا گنج کے رہنے والے تھے۔ بھائی صاحب سے اور حکیم نیاز علی سے گہری ملاقات تھی اور ایّام امیدواری میں بھائی صاحب بھی

لے حکیم کے مکان میں میں قریب چھ سات ماہ قیام پذیر رہا۔ شاید ہفتہ عشرہ گذرا ہوگا کہ گھانسی خاں اور مجھ کو بخار آگیا مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ ایک دن گھانسی خاں رضائی لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتا تھا۔ دوسرے روز میں اسی طرح پلنگ پر دراز ہوتا تھا۔ گھانسی خاں تو گھبرا کر لکھنؤ چل کھڑا ہوا۔ میں قریب ایک ماہ کے اس بلا میں مبتلا رہا۔ حکیم گھوڑوں کا سوداگر تھا۔ ایک سبزہ گھوڑا اور ایک سمند سیاہ زانو بچھیرا اس کے اصطبل میں تھا۔ بچھیرا میں نے خرید کیا۔ سبزہ کچھ بیمار ہو گیا۔ حکیم نے مجھ سے کہا کہ ایک جلّاب لے لو تو بخار جاتا رہے گا۔ چنانچہ اس نے جلّاب کا نسخہ لکھا کہ پاؤ سیر مغز تخم بیدانجیر اور پاؤ بھر فلاں چیز اور پاؤ بھر کوئی اور چیز۔ اس ہی وزن پر کئی دوائیں لکھ دیں میں نے وہ نسخہ کوٹ چھان کر تیار کیا اس کے بڑے بڑے انٹے گولے کوئی تیس ۳۰ چالیس ۴۰ بنے۔ حکیم نے کہا کہ ایک گولہ بآب شیر گرم کھالو۔ میں کیا بیان کروں کہ کیا میری حالت ہوئی۔ بیس ۲۰ پچیس ۲۵ دستوں کے بعد حالت نشست و برخاست باقی نہ رہی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک آگ پیٹ میں لگ گئی۔ زندگی باقی تھی خود مجھ کو خیال آیا اور گھبرا منگا کر اس کا پانی نکال کر میں نے پیا تو وہ آگ بجھی اور اسہال سے نجات ملی۔ اس وقت حکیم نے شرمندہ شرمندہ اعتراف کیا کہ یہ نسخہ گھوڑے کے واسطے بنایا تھا۔ میری زبان کو کو نہیں لی گئی تھی میں نے بھی خوب اُس کو بُرا بھلا کہا اور سمجھا کہ جان بچی لاکھوں پائے۔ مگر تپ نے مفارقت نہیں کی اور میں سمجھا کہ اب اپنا وقت قریب آگیا۔ ایک دن میں اس ہی تپ میں مبتلا پڑا ہوا تھا اور پلنگ کے پاس حکیم وغیرہ چند لوگ چوسر کھیل رہے تھے کہ مجھ کو غفلت آگئی مجھے اسی حالت میں یہ نظر آیا کہ ایک بزرگ نہایت متبرک صورت میرے روبرو کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جا ہم نے تجھے چھوڑ دیا۔ تیرے پاس اسم اعظم ہے اب ہمارے مزار پر پیشاب نہ کرنا۔ اس کے بعد میں چونک پڑا اور دیکھا کہ پسینہ میں غرق ہوں۔ بخار تو پھر نہیں آیا مگر ضعف سے نشست و برخاست کی حالت باقی نہیں رہی۔ حکیم سے دریافت کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہاں کسی بزرگ کی قبر تھی۔ میں نے وہ مقام گلاب سے دھلوایا عود وغیرہ جلوایا اور فاتحہ بھی دلوائی مگر افسوس یہ رہا کہ میں نے ان بزرگ سے یہ نہیں پوچھ لیا کہ میرے پاس وہ کونسا اسم پاک ہے جس کو انہوں نے اسم اعظم بتایا۔ یہ قصہ والد نے مجھ سے بیان فرمایا و اسم مجھے بتائے جو اس وقت وہ خود (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

اس ہی مکان میں مقیم تھے ایّام غدر میں کانے مٹکاف نے حکیم نیاز علی کو پھانسی دیدی تھی۔ یہ دونوں بھائی مع ایک بھتیجا و بھتیجی کے حیدرآباد بھاگ آئے تھے۔ یہاں آن کر انہوں نے اپنی بھتیجی کو شاہزادی مشہور کیا اور حضرت فردوس منزل **افضل الدولہ شاہ دکن** کے محل میں داخل کرانا چاہا۔

افضل الدولہ بہادر

اس زمانہ میں نورالدین شاہ قادری ساکن پنجاب و شاہ دکن کے پیر مشہور تھے۔ اور شاہ دکن کو بھی اس قدر اعتقاد ان شاہ صاحب سے تھا کہ زر و جواہر ٹوکرے بھر کر شاہ صاحب کو بھیجا کرتے تھے۔ اور مشہور تھا کہ ایک بار اپنا خاص ہاتھی مع زر و عماری شاہ صاحب کو عطا کیا۔ وزیر مختار الملک نے شاہ صاحب کو اطلاع دی کہ ہم زر و عماری کے نوکر ہیں آپ کے سلام کو حاضر ہوتے ہیں شاہ صاحب نے ہاتھی عماری فوراً واپس کر دی۔

اس رئیس ذیشان کے عہد میں ہر قسم کے فقرا شہر میں بہ کثرت موجود ہو گئے تھے۔ ڈھوپچی شاہ اور رنگی شاہ اور اسی طرح کے عجیب و غریب مضحک اسماء کے فقرا بےفکری سے عیش کر رہے تھے۔ اور ان کی طرف سے وکلا ڈیوڑھی مبارک میں حاضر رہتے تھے اور یہ وکلا بھی امیر دولتمند بن گئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ رسوخ حضرت نورالدین شاہ قادری کو تھا۔ حضرت کا سن شریف اسّی سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔ نہایت ضعیف و نحیف صرف مرجھایا ہوا پوست اور سوکھے ہوئے استخواں باقی رہ گئے تھے۔ حکیم رضا علی نے حضرت شاہ صاحب کے ذریعہ سے کام نکالنا چاہا۔ خلاصہ اینکہ یہ لڑکی محل میں تو نہ گئی اور پیر مرشد نے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ۔ ایک بعد نماز صبح اور دوسرا بعد نماز عشا پڑھا کرتے ہیں اور تاکید کی کہ یہ مدت العمر ترک نہ ہوں، چنانچہ ۱۹۰۱ء سے یہ دونوں برابر جاری ہیں۔ ذوالقدر جنگ

اس کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو کر خود نکاح کر لیا۔ اور دو سو روپیہ بطور منصب سالے کے اور سو روپیہ بڑے خسرے کے اور چالیس روپیہ چھوٹے خسرے کے جاری کرائے اور یہ دونوں بھائی آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ میں نے پچیس روپیہ اپنے اور گھانسی خاں کے دو وقتہ خوراک کے محمد رضا کو دیدیئے۔ حکیم کے مونہہ میں پانی بھر آیا اور مجھکو چٹ نواب صاحب خطاب دیدیا۔ اور ان کی بی بی نے کہلا بھیجا کہ آپ ہرگز دوسرے مکان کی فکر نہ کیجئے ہم ہر طرح کی خدمت کرنے کو موجود ہیں۔

کنداسامی ندیم سرسالار جنگ میں نے دو تین روز تو سفر کی تکان کے باعث آرام لیا۔ بعدہٗ نفیس کپڑے پہنکر عطر وغیرہ لگا کر طمطراق کے ساتھ کنداسامی کے پاس پہونچا۔ یہ شخص ابتدائً محکمۂ تعمیرات کا ٹھیکہ دار تھا۔ اور قوم کا تلنگا دراز قد سیاہ رنگ کہ حبشی بھی اُسے دیکھ کر شرما جائے موٹے موٹے ہونٹ لنبے لنبے کان اس میں چھوٹے چھوٹے چھلّے پڑے ہوئے مضحک صورت کج مج گفتار مگر وزیر با تدبیر کا مصاحب خاص تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پر صاحب عالی شان یعنے رزیڈنٹ کی خاص توجہ مبذول تھی اور وزیر اعظم کو بھی ایسے شخص انگریزی داں کی ضرورت تھی کہ جس میں زیادہ قابلیت اور بلند حوصلگی اور سازش و غلط بیانی کا مادّہ نہ ہو اور مابین رزیڈنٹ و مدارالمہام سیدھی سادھی وکالت کرے اور خود غرضی و ذاتی نفع کی تدابیر نہ سوچے۔ کنداسامی انگریزی سے بقدر ضرورت واقف اردو فارسی عربی سے بے بہرہ تلنگی وغیرہ السنۂ دکن میں مشّاق تھا۔ بدصورت ایسا کہ شام کو سامنے آجائے تو رستم بھی ڈر جائے۔ مگر رزیڈنٹ لاڈلا مختار الملک

---

[1] وزارت پناہ کے عہد حکومت میں امید و بیم کل عہدہ داران و عمّال ریاست کی صرف ذات با برکات ممدوح سے وابستہ تھی پینیکار کے عہد میں خود مسٹر جونز رزیڈنٹ نے باب رزیڈنسی مسدود کر دیا تھا عہد وزارت لایق علی خاں میں بھی لوگوں کی امید و بیم مسند وزارت سے متعلق رہی گو جناب مولانا مہدی علی خاں میر نواز جنگ سردار عبدالحق دلیر جنگ اور ان کی پیروی میں مولوی سید حسین بلگرامی موتمن جنگ نے دروازہ رزیڈنسی کا کھٹ کھٹانا شروع کر دیا تھا۔

کا بکار آمد تھا۔ الغرض صبح کے وقت پاپیادہ ان کے قصر عالیشان کا پتہ پوچھتا ہوا ان کی خدمت میں پہونچا واقعی مکان ان کا قصر عالیشان تھا نہایت سرسبز و شاداب باغ اس میں اونچی کرسی کی دومنزلہ کوٹھی فرش فروش میز کرسی سے آراستہ شیشہ آلات سے چمکتی ہوئی بہت میانے جھٹکے گھوڑے سیڑھیوں کے پاس جمع جس سے معلوم ہوا کہ یہی وقت ان کے دربار کا ہے۔ میں بھی بلا پرسش اوپر چڑھ گیا۔ ایک کمرہ میں ایک کوچ پر نود ولت راجہ کنداسامی مثل مہاد یو جلوہ فرما تھے۔ اور روبرو کرسیوں پر اہل دربار متمکن تھے میں بھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اٹھ کر چچا مرحوم کا خط ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اور عرض کیا کہ میں ایک خط نواب صاحب کے نام بھی لایا ہوں۔ فرمایا کہ کسی موقع پر میں آپ کا ذکر کروں گا مگر نواب کو آج کل فرصت بہت کم ہے۔

دوسرے مصاحب خاص مولوی امین الدین خاں

میں ان کا سوکھا سا کھا جواب سن کر مایوسانہ واپس چلا آیا مگر ہفتہ عشرہ میں کئی بار ان کی دربار داری کرتا رہا۔ ان کے ہمسر مصاحب وزارت اور ربار سوخ مولوی امین الدین خاں تھے۔ ان کے والد[1] ایام غدر میں الور سے حیدرآباد پہونچے آدمی نہایت ذی لیاقت اور گرم و سرد زمانہ بھگتے ہوئے امراء علماء کی صحبت یافتہ وزارت پناہ کے دربار میں بہت جلد ایسا رسوخ حاصل کیا کہ کل مدراسی مسلمان و پارسی و حیدرآبادی اہلکاران با رسوخ سے سبقت لے گئے اور حل وعقد و انتظام ریاست میں وزیر باتدبیر کے دست راست بن گئے۔ مگر فوراً ہی رقیبان ناہنجار نے کچھ کھلا کر ان کو شہید کر دیا۔ قدردان وزیر نے ان کے دونوں بیٹوں کو اپنا دست راست و دست چپ بنا لیا مولوی امین الدین خاں کی وجہ سے اکثر اہل دہلی مثل عنایت الرحمن خاں و ہدایت اللہ خاں

---

[1] مولوی مؤید الدین خاں۔

*متوفی ۱۳ جنوری ۱۸۸۵ء

وغیرہ اور اہل اودھ بالخصوص علمائے کاکوری وغیرہ معزز عہدوں پر سرفراز تھے اور بازار مدراسیوں اور پارسیوں کا سرد ہونے لگا۔ رحیم بخش نامی ایک باربردار، بادشاہ دہلی کا اور رفیق میرے چچا خسر نواب[1] معین الدین حسن خاں کا مکہ معظمہ سے واپس آ کر حیدرآباد میں مقیم ہوا اور ٹین گری کی دوکان پتھر گھٹی پر کھولی تھی۔ اکثر ہندوستانی ملازمین دفاتر متفرقہ کے منشی محرر اور وکالت پیشہ وغیرہ آتے جاتے اس کی دوکان پر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ میرے پاس بھی آیا۔ ایک دن اس نے مجھ سے مولوی امین الدین خاں کا ذکر کیا اور ماموں بخشی انعام اللہ خاں کی قرابت کا حال بھی بیان کیا۔ رائے یہ قرار پائی کہ ماموں صاحب کا ایک خط منگوانا چاہئے۔ الغرض وہ خط بھی آیا اور میں رحیم بخش کے ساتھ مولوی صاحب کے پاس پہونچا۔ دروازہ پر اس ہی طرح میانے پالکیاں گھوڑے بکثرت کھڑے ہوئے تھے۔ دروازہ میں گھستے ہی سامنے ایک دالان اونچی کرسی کا دکھائی دیا۔ جس میں اہل دربار جمع تھے سامنے اس دالان کے گویا دروازہ کی چھت پر ایک طویل کمرہ تھا۔ دیر کے بعد مولوی صاحب کمرے سے اُتر کر دربار میں آئے۔ کل اہل دربار سرو قد کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر گھنی سلام کرنے لگے۔ میں بھی کھڑا ہو گیا وہ مجھ کو دیکھتے ہی میرے پاس دیوار سے لگ کر دو زانو بیٹھ گئے۔ میانہ قد ریش دراز مونچھیں ندارد سر کے بال کانوں تک لینے ایک لباس ایسا پہنے ہوئے جو انگرکھا نہ اچکن نہ شیروانی گھٹنوں سے نیچا اور گلے سے ناف تک بوتام لگے ہوئے اور اس ہی کپڑے کی ٹوپی سر پر پہنے ہوئے کسی سے بات نہ چیت کوئی پندرہ منٹ بیٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اہل دربار بھی سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔ میں بھی مع رحیم بخش واپس آیا۔

---

[1] یہ میرے نانا نواب فخر الدین خاں مرحوم اور والد کی سفارش سے نواب امیر کبیر خورشید جاہ کی طرف سے منصب پاتے تھے اور نواب امیر کبیر ان کے ساتھ نہایت احترام کے ساتھ پیش آتے تھے ان کی قبر محلہ چنچل گوڑہ میں میرے آبائی مکان کے قریب عباد اللہ شاہ کے تکیہ میں بجانب غرب بنی ہوئی ہے۔ ذوالقدر جنگ

چند ماہ تک میں بھی ہر جمعہ کو دربارداری کرتا رہا۔ کوئی شکل کاربرآری کی نظر نہ آئی۔ ایک روز عم بزرگوار کا خط آیا۔ اس میں دو خط انگریزی ملفوف تھے۔ ایک خط جنرل بیرو کا ولایت سے بنام وزیر روشن ضمیر اور دوسرا خط مسٹر براوننگ صدر ناظم یعنی ڈائرکٹر صیغہ تعلیمات ملک اودھ۔ مسٹر ٹریور مددگار اوّل رزیڈنٹ حیدرآباد کے نام تھا۔ میں وہ خط لیکر مسٹر ٹریور کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھ کو بلا کر بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھایا اور کچھ خاندان کے حالات اور تعلیم وغیرہ کے پوچھے۔ بعدہٗ ایک خط وزیر اعظم کے نام لکھ کر مجھ کو دیدیا اور کہا جب تمہارا جی چاہے چلے آیا کرو۔ میں سلام کرکے خوش خوش چلا آیا۔ مگر فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ میں کسی طرح دربار وزارت میں پہونچوں اور یہ خط پیش کروں۔ مشہور یہ تھا کہ سالہا سال لوگ جب تک کوئی ذریعہ نہو اس دربار میں نہیں پہونچ سکتے۔ جوان عمر تھا خاندان کی شیخی اور امیرانہ تعلیم و تربیت یافتہ دو جگہ کی دربارداری سے مایوس اور جگہ جانے سے طبیعت میں کراہت پیدا ہو گئی اور اب یہ ارادہ کیا کہ یہاں سے چلدو اور کسی جگہ قسمت آزمائی کرو شاہ نورالدین قادری کے بھی دربار میں جایا کرتا تھا۔ گر وہ بھی صرف دولت مند درویش رہ گئے تھے۔ کسی رکن ریاست سے پیام سلام تک نہ رکھتے تھے۔ اور مجھ سے کبھی بات چیت کی نوبت نہیں آئی اس واسطے کہ ان کے مزاج میں فقیرانہ بے نیازی بحد غرور بہت تھی ان کے برادرزادہ شاہ رحیم الدین قادری ایک لنبے چوڑے پنجابی جوان پنجابی زبان پنجابی پوشاک، بہت خوش مزاج اور خلیق تھے۔ مگر چچا بھتیجے میں کمال درجہ نااتفاقی تھی اور چچا نے اپنے چھوٹے سالے کے بیٹے کو اپنا جانشیں مقرر کردیا تھا۔ مگر ان کا وکیل مرزا[1] غضنفر بیگ

---

[1] یہی بزرگوار میرے پاس اسی ہزار روپیہ کے نوٹس منجملہ ایک لاکھ روپیہ لائے تھے اور بیس ہزار روپیہ مولانا معظم مہدی علی خاں نے رکھ لئے تھے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ مرزا غضنفر بیگ صرف مدارالمہام اور عہدہ داران ریاست کے پاس وکالت کرتے تھے۔ ڈیوڑھی مبارک شاہی میں حافظ منصب علی وکیل تھے اور جلد دولت دنیا سے مستغنی ہوگئے۔ (باقی برصفحہ آیندہ)

ایک بہت چالاک چرب زبان بھتیجے کا طرفدار تھا اس شخص نے مولوی امین الدین خاں کے پاس بڑا رسوخ حاصل کیا تھا اور ان کے ذریعہ سے بہت سے کام شاہ صاحب کے بکمال خیر خواہی اور عقیدت مندی نکالا کرتا تھا۔ میں اس فکر میں تھا کہ کب تک اپنے عم بزرگوار کی فیاضی پر عمر بسر کروں آخر ایک روز دیوانِ حافظؔ میں فال دیکھی یہ شعر برآمد ہوا ؎

گر بدیوانِ غزل صدر نشینم چہ عجب
سالہا بندگیٔ صاحبِ دیواں کردم

اس شعر کو پڑھ کر ذرا دل کو تسکین ہوئی۔ ایک صاحب سید انور علی متخلص بہ تنویرؔ۔ اس ہی محلہ میں رہتے تھے اور مولوی امین الدین کے دفتر معتمدی میں ملازم تھے ہر شب میرے پاس آیا کرتے تھے اور اپنے مصنفہ مرثیئے سنایا کرتے تھے۔ مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے مزاج میں کمال ظرافت اور چہل تھی علاوہ شاعری کے فنون سپاہ گری میں بھی دعویٰ رکھتے تھے چٹکی سے ایسا تیر چلاتے تھے کہ روبرو کا دروازہ اگر بہت دور نہ ہو تو پھٹ جائے ایک شب مجھ کو زیادہ فکرمند دیکھ کر سبب خاموشی دریافت کر کے کہا کہ ایک گھڑا پانی کا صحن میں رکھوا دیجئے میں غسل کر کے آپ کے واسطے استخارہ کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے نہا کر استخارہ کیا" اور کہا کہ آپ کو ذریعہ کی ضرورت نہیں جس دن آپ چلے جائیں گے دیوان سے ملاقات ہو جائے گی۔ ہرگز سفر کا یہاں سے قصد نہ کیجئے گا" میں سن کر چپ ہو رہا۔

ایک عجیب واقعہ میں اکثر بعد نماز عصر مکان کے دروازہ کے باہر ایک بنچ پر سر راہ جا بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی طرف سے ایک[1] بزرگ لنگوٹی بند ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) حافظ منصب علی صاحب ذوالقدر جنگ کی زوجہ کے حقیقی نانا اور لیاقت جنگ اور جہاں نما یار جنگ کے والد تھے۔

[1] ان صاحب کے وصال کا بھی عجیب قصہ ہے میں بعد فراغت درس وزیرزادگان مستعد ہو رہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کودتے اچھلتے ڈ لکی چال شہر کی طرف جایا کرتے تھے اور بہت جلد پرانے پُل سے سیندھی شراب میں سرشار رال ٹپکتی ہوئی واپس آتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے اور نہ کسی سے روپیہ پیسہ قبول کرتے تھے۔ سڑک کے لڑکوں کی فوج ان کے جلو میں رہتی تھی۔ ایک دن جو وہ پُل سے واپس آئے تو سیدھے میری طرف آئے اور میرا حقہ چھین کر ایک لنبا دم لگایا اور آسمان کی طرف دھواں پھینکتے ہوئے کودتے اچھلتے مع جلوس طفلاں آگے بڑھ گئے۔ میں نے آدمی کو آوازدے کر حقہ کی چہنال دھلوائی جب انہوں نے ہر روز یہی طریقہ اختیار کیا تو میں نے اندر دروازہ کے نشست اختیار کی وہ دروازہ کے اندر بھی گھس آئے اور حقہ چھین کر معمولی دم لگاکر میری آنکھوں میں آنکھیں ملاکر بولے کہ تجھ کو بلا رہے ہیں اور تو نہیں جاتا یہ کہتے ہوئے وہ تو چلدئے۔ میں نے دروازہ کے اندر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ دوسرے روز بھی یہی اتفاق ہوا۔ اس شب کو میں از حد فکر مند تھا۔ آخر میں نے میر صاحب کے استخارہ کے زمانے کا مصمم ارادہ کیا اور پھر حضرت حافظ سے مشورہ لیا یہ شعر نکلا ؎

ور چو حافظ نبرم رہ ز بیاباں بیروں
ہمرہِ کوکبہ آصفِ دوراں بروم

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) آرہا تھا کہ ڈھول بیٹھ کے پاس میں نے ہجوم آدمیوں کا دیکھا دریافت سے معلوم ہوا کہ ان شاہ صاحب کو دفن کر رہے ہیں میں جب قریب پہونچا تو دفن کر چکے تھے میں افسوس کناں پُل پر پہونچا تو کوتوالی کا جمعدار دہلی والا میر ملاقاتی کھڑا ہوا تھا اس کی زبانی معلوم ہوا کہ بجائے سہ پہر اس دن صبح کو شاہ صاحب اچھلتے کودتے ڈلکی چال نہایت خنداں و شاداں مع جلوس کو دکاں ہر ایک سے گلے ملتے ہوئے میرے ناکے تک آئے میں نے ان سے پوچھا کہ اس گلے ملنے کی کیا وجہ ہے وہ مجھ سے بھی لپٹ گئے اور بولے کہ بھائی ہم اپنے گھر جا رہے ہیں یہ کہتے ہوئے وہ پل پر چلے گئے شہر کے اندر سے ہاتھی نواب رشید الدین خاں وقار الامرا کا اچھا خاصہ آرہا تھا دروازہ تک پہونچتے ہی مست ہو گیا فیلبان لوگوں کو آوازدیتا ہوا سنبھال سنبھال کر پل تک لایا اُدھر سے شاہ صاحب بھی پل پر پہونچے ادھر شاہ صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور کہا کہ دوست ہم تمہاری تلاش میں آرہے تھے اُدھر سے ہاتھی نے سونڈ لپیٹی کی اور ان کو اٹھا کر ندی میں پھینکدیا اور میرے ناکے تک آتے آتے پھر بھلا چنگا ہو گیا۔

اس شعر کو پڑھ کر اس قدر ہمت ہوئی کہ میں نے قسمت آزمائی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ نکلتے ہوئے جاڑے تھے علی الصباح کوئی چار بجے اُٹھ کر نہایا اور نماز پڑھکر کپڑے پہنے۔ پگڑی باندھی کمر کسی اوپر سے مغرق چوغا پہنا یابو پر سوار ہوا (گھوڑا پیچ ڈالا تھا) جو ہیں دروازہ سے نکلا مہترانی جھاڑو دیتی ہوئی دکھائی دی دل اور مضبوط ہوا۔ قبل طلوع آفتاب در وزارت پر پہونچ گیا۔ اور بیساختہ اندر گھس گیا۔ پہرہ دار نے مجھ کو نہ روکا سامنے دالان دکھائی دیا میں وہاں پہونچا۔ دالان کے سائبان میں چند لوگ حلقہ باندھے ہوئے حقہ کا دم لگا رہے تھے میں بھی اس حلقہ میں او کڑوں بیٹھ گیا۔ حقہ گردش کرتا ہوا میری طرف بھی آیا میں نے بھی دم لگایا اس وقت میرے نزدیک ہم نشیں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں میں نے اپنا مقصود بیان کیا اس بھلے مانس نے اب مجھ کو غور سے دیکھا اور کہا تعجب ہے کہ آپکو کسی نے نہیں روکا اور یہ کونسا وقت ملاقات یا سلام کا ہے ہم لوگ کہ پہرے کے سوار ہیں اس وقت ذرہ روشنی زیادہ ہو جائے تو وہ دیکھو اوپر پردہ پڑا ہوا ہے نواب صاحب ہمارا سلام لے لیں گے میری رائے یہ ہے کہ آپ ہٹ جائیے بلکہ اس وقت آپ چلے جائیے اور کسی وقت آکر کوشش کیجئے۔ میں وہاں سے اُٹھ آیا اور اب روشنی بھی خاصی ہو گئی اتنے میں ایک شخص دستار و کمربستہ حجرہ میں سے نکلا مجھ کو دیکھکر بہ ترش روئی کہا کہ تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے ہو میں نے کہا کہ میں فرسٹ اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کا فرستادہ ہوں اس نے تعجب سے کہا کہ یہ کس کا نام ہے اور کھڑکی پردہ کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ وہ سب سوار بھی صف بستہ کمرہ کے سامنے کھڑے ہو گئے شاید نواب صاحب اوپر برآمد ہوئے ہونگے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس عرصہ میں کئی چوبدار بھی آگئے اور مجھ کو خوب گھورا اس سوار مذکورۂ بالا نے میرے پاس آکر دوستی کی راہ سے کہا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے ورنہ یہ چوبدار

آپ کو بجبر یہاں سے نکال دیں گے یا کچھ وعدہ کر لیجیے کہ کھڑا رہنے دیں میں نے اس سے کہا
کہ تم ایک چوبدار کو میرے پاس لے آؤ۔ الغرض چوبدار نے جو ایک کلدار روپیہ اپنے ہاتھ
میں محسوس کیا مجھ سے کہا کہ نہ یہ وقت سلام کا ہے نہ یہ وقت باریابی کا ہے آپ یہاں
تشریف لاکر بیٹھ جائیے ہمارے فقیر محمد آتے ہیں شاید وہ کوئی مشورہ آپ کو دیں۔ باریابی کے
واسطے تو زبردست ذریعہ درکار ہے۔ میں اس دالان میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور لوگوں کی
آمد و رفت کا تماشہ دیکھتا رہا۔ بڑی دیر بعد پھر وہی چوبدار میرے پاس آیا اور کہا کہ فقیر محمد تو
آج تشریف نہیں لائے ان کے بیٹے آئے ہیں ان سے مل لیجیے۔ الغرض میں ان سے ملا اور
ٹریور صاحب کا خط ان کو دکھایا۔ وہ ترش رو ہو کر بولے کہ ہم پٹہ رساں نہیں ہیں آپ کی
عقل جاتی رہی ہے۔ کسی اہل دربار کا ذریعہ ڈھونڈئیے میں نے کہا اگر آپ یہ خط پہونچا دیں
تو میں آپ کی خدمت کرنے کو موجود ہوں یہ سنکر ڈھیلے پڑے اور پوچھا کیا دوگے میں
نے پچاس کا نام لیا وہ خط لیکر کھڑے ہو گئے اور کہا بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں یہ کہہ کر
اوپر چلے گئے۔ میں کوئی نو دس بجے تک ان کا منتظر رہا۔ بالآخر میں نے اس ہی چوبدار
سے کہا بھئی وغیرہ صاحب کہاں چلے گئے۔ کچھ تو خبر لاؤ میں دس روپیہ تمہاری بھی تواضع
کروں گا۔ وہ یہ سن کر اوپر پہونچا اور وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ انہوں نے کہا کہ آپ
کا خط نواب صاحب نے پڑھ کر آپ کو ایک بجے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے" لائیے میرے روپیہ"
میں نے کہا پتھر گھٹی تک چلئے روپیہ موجود ہے کہا اس ہی چوبدار کو لے جائیے۔ الغرض
میں رحیم بخش کی دوکان پر آیا اور کہا پچاس روپیہ فوراً یہاں سے بنئے لا دو وہ رقم لے
آیا۔ اس چوبدار نے اپنا تقاضہ کیا میں نے کہا ایک بجے میں پھر آتا ہوں اس نے کہا وہ
خدمت دوسری ہوگی میں نے کہا میں یہ اور وہ دونوں یاد رکھوں گا۔ وہ خوش خوش

روانہ ہوا میں نے بازار سے منگا کر کچھ کھا لیا اور ایک بجے تک اس ہی دوکان پر جمعداروں اور اُمرائے کے آمدورفت کے جلوس کا تماشہ دیکھتا رہا۔ ایک بجے پھر اس ہی دالان میں پہونچا وہ چوبدار وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ میں ان کے ساتھ اوپر گیا۔ کمرہ صاف فرش دری چاندنی سے آراستہ تھا اور ایک مسند صدر مقام پر بچھی ہوئی تھی۔ مگر مسند پوش پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے سے وہ دوسرے کمرہ میں گیا۔ وہاں چند لوگ منتظر باریابی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ کو بھی وہاں بٹھا دیا اور خود ایک اور اندر کے کمرہ میں چلا گیا اور فوراً واپس آکر کہا کہ چلو اُٹھو یاد فرمایا ہے جو ہیں ہیں کمرے کے اندر گیا۔ سامنے چند قدم کے فاصلہ پر مسند بچھی ہوئی تھی اور نواب صاحب بکمال شان و شوکت مسند آرا تھے نشستہ حالت میں قد بلند و بالا چوڑا سینہ گورا رنگ جامہ وار کی شیروانی در بر کلاہ زرّین برسر بہت سے کاغذ مسند کے پاس اور کئی کاغذ اور پنسل ہاتھ میں لئے ہوئے بیٹھے تھے کہ چوبدار نے آواز دی آداب بجا لاؤ ادب سے قاعدہ سے، میں فوراً جھک گیا اور ہندوستانی آداب بجا لایا۔ چوبدار میرا ہاتھ پکڑ کر مسند تک لے گیا۔ میں نے پانچ روپیہ رومال پر رکھ کر نذر گزرانی بخندہ پیشانی روپیہ اُٹھا لئے اور حکم بیٹھنے کا دیا۔ ہاتھ کے کاغذ ایک طرف رکھدیئے اور مخاطب ہو کر میرا نام و نشان وغیرہ دریافت فرمایا۔ میں نے اُٹھ کر عم مرحوم کا خط پیش کر دیا اس کو پڑھ کر ایک نظر مہربانی کی مجھ پر ڈالی اور پوچھا کب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ میرا بیان سن کر فرمایا کیوں آپ نے دیر لگائی میرے دربار میں کسی کی ممانعت نہیں ہے۔ خیر آپ بے تکلف آتے رہیئے۔ اس کے بعد چچا مرحوم کے حالات اور میری لیاقت کی

لـہ تمام امرا اور جمعداروں کے سلام کا دن اور وقت مقرر تھا۔ یہ لوگ مقررہ دن اور وقت پر ایوان کے سلام کو مع اپنی اپنی فوج اور تمام لوازمہ کے ساتھ جایا کرتے تھے۔

بابت سوالات کرتے رہے کوئی دس پندرہ منٹ گفتگو رہی۔ عطر بردار نے عطر دان[1] میرے سامنے رکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر عطر لے لیا اور سلام کر کے اُلٹے پاؤں کمرہ کے باہر خوش خوش، بشّاش بشّاش نکل آیا۔ میاں وغیرہ صاحب نے کہا کہ اب آپ کی باریابی محال ہے۔ میں بہت گھبرایا اس نے کہا کہ یہاں ہر سلام والے کا دن مقرر ہے آپ کے واسطے کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ میں نے پچاس کا وعدہ ان سے اور کیا وہ اندر پہونچے اور واپس آکر کہا کہ آپ کے واسطے چہار شنبہ کا روز آٹھ بجے صبح کا وقت مقرر ہوا اور مجھ کو مبارک باد دی کہ وہ اُمرا جو بندگان عالی کی ڈیوڑھی سے تعلق رکھتے ہیں ان کے ساتھ آپ کا سلام مقرر ہوا۔ اس طرح اب میری درباروداری و امیدواری شروع ہوگئی۔

مختصر حالات امرا و اہلکارانِ ریاست — اس وقت نواب[2] مختار الملک شجاع الدولہ سالار جنگ میر تراب علی خاں بہادر کی حکومت اپنی بہار پر تھی اوقات شریف ان کے یہ تھے کہ حوائج نشست وغسل وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کی نماز پڑھتے اور خدمتگار شاگرد پیشہ اور پہرہ دار اور دیگر اہل

---

[1] یہ رسم دیگر امرائے عظام کی ملاقات میں جاری نہ تھی اور یہ اشارہ برخاست کا تھا شمس الامرا امیر کبیر عمدۃ الملک کی ملاقات میں برخاست کا اشارہ صرف مسند کے پہلو کے تکیئے بدلنا تھا امیر کبیر شمس الامرا رشید الدین خاں وقار الامرا کے ہاں کوئی اشارہ ختم ملاقات نہ تھا دربار شاہی میں بھی صرف مسند کے تکیئے بدلے جاتے تھے البتہ رزیڈنٹ کے دربار میں ایک کشتی جس میں پان ہار عطر کی شیشی ہوتی تھی رزیڈنٹ اور اس کے ہمراہ صاحبان انگریز کو دی جاتی تھی یہ علامت برخاست کی تھی۔

[2] وزارت پناہ کے دو بیٹے تھے لائق علی خاں مہتر اور سعادت علی خاں کہتر۔ یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ وزارت پناہ کی آرزو یہ تھی کہ مکرم الدولہ کو اپنی خدمت دیوانی و مدار المہامی دربار شاہی سے عطا کروانے اور بڑے صاحبزادہ کو حسب رواج شاہانہ قدیم صوبہ داری اورنگ آباد پر معہ فوج و لشکر و نشان و ڈنکہ و عماری سرفراز کراتے اور چھوٹے صاحبزادہ کو امیر فوج و سر عسکر یعنی کمانڈر انچیف افواج قاہرہ سلطانی پر ممتاز کراتے سالار جنگ اوّل بتاریخ ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء متولد ہوئے بعہد حکومت حضرت ناصر الدولہ بتاریخ ۲۲ شعبان ۱۲۶۹ھ م ۱۸۵۳ء چوبیس سال کی عمر میں مدار المہام مقرر ہوئے۔ نواب صاحب مسٹر ڈٹین کی علیحدگی کے بعد ورنگل کے تعلقدار بھی رہ چکے تھے۔ حضرت افضل الدولہ کے انتقال کے بعد بتاریخ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء ایجنسی قائم ہوئی اور نواب صاحب بشرکت نواب امیر کبیر عمدۃ الملک ایجنٹ مقرر ہوئے بتاریخ ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۰ھ م ۸ فروری ۱۸۸۳ء انتقال کیا۔

SALAR JUNG FAMILY

نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول
واب سعادت علیخان منیر الملک نواب لایق علیخان سالار جنگ ثا

کا سلام اس طرح لیتے کہ خود اوپر برآمد ہوتے اور نیچے دالان میں حاضر باش صف بستہ کھڑے رہتے۔ پردہ اُٹھتے ہی چوبدار آواز دیتا یہ سب لوگ جھک جاتے اور تین تسلیمات بجالاتے۔ وہاں سے خانہ باغ میں اُترتے ٹیپو خاں وغیرہ چابک سواران چند گھوڑے خاصہ کے اور چند کوتل لئے ہوئے حاضر رہتے اس وقت صرف مخصوص مصاحبین دستار و کمر بستہ لیتے لیتے دکھنی چھینٹ کے انگرکھے اور مدراسی اچکنیں پہنے ہوئے موجود رہتے کبھی کبھی ہر دو صاحبزادگان بھی ہمرکاب ہوتے اگر کوئی قسمت ور امیدوار کسی مصاحب کے ذریعہ سے پہونچ جاتا تو اس کی عرضی بھی لے لیتے اور گاہ گاہ شہر کے باہر سرور نگر وغیرہ کی جانب نکل جاتے۔ بہر حال سورج نکلتے نکلتے کلھیاری میں مسند پر جلوہ افروز ہو جاتے۔ لباس نہایت سادہ۔ ٹخنوں سے اونچی گھٹنوں سے نیچی مختلف رنگ کی جامہ وار کی شیروانی دوہری زنجیر دار گھڑی زیب صدر، کلاہ زریں بشکل بخارائی یا سمرقندی برسر، پائجامہ بیشتر سفید، گوشۂ کلاہ آگے جھکا ہوا، دراز قامت، کشادہ سینہ، موئے سر تراشیدہ، ڈاڑھی مونڈی ہوئی مونچھ بڑھی ہوئیں، بہت صاف گندمی رنگ، چہرہ پر کمال درجہ رونق و رعب حکومت، باہر جاتے وقت یا رزیڈنٹ یا دیگر امرائے ہمسر سے ملتے وقت دستار وزارت برسر ڈیوڑھی مبارک آستانۂ شاہی میں حاضر ہوتے وقت جامہ و نیمہ در بر، انگریزی پوشاک و انگریزی وضع سے گریزاں اہل دربار سب کے سب دکھنی پوشاک یا مدراسی لباس ہندوستانی ملازمین شیروانیاں پہنے ہوئے اپنے اوقات وایام مقررہ پر حاضر۔ سلام کا طریقہ یہ کہ ہر سلام کے واسطے علحدہ مقامات، یعنی کمرہ مقرر اور صبح سے رات کے بارہ بجے تک امراء جمعداران فوج و اہلکاران دیوانی و منصب داران و امیدواران فضل و کرم و خوش باشان بلدہ و ملازمین تعلقہ و اضلاع مقررہ دن اور مقررہ وقت پر حاضر رہتے تھے۔ خلاف روز یا خلاف وقت اگر کوئی آتا تو میاں فقیر محمد کسی کو باریاب نہ ہونے دیتے۔

فقیر محمد — فقیر محمد ایک نہایت سن رسیدہ، خمیدہ قامت، سیاہ رنگ، مختصر سی ڈاڑھی چوبدست بدست، دستار چوبداری برسر کمر بستہ سب درباروں کا منتظم اور نہایت جابر اور جلّاد آدمی تھا۔ اگر حاضرین دربار میں کسی کی نشست غلط ہوتی یا حرکات سکنات بے قاعدہ ہوتے تو فقیر محمد للکارتا بلکہ چوبدست سے ادب آموز ہوتا۔ رفیق الدولہ ایک نہایت معزز جمعدار صاحب جمعیت و جاگیر میرے مقررہ روز کے حاضر باش تھے۔ ایک روز کسی وجہ سے انہوں نے پگڑی سر سے اتاری ہی تھی کہ فقیر محمد کی چوبدست نے ان کے مونڈا تشیدہ سر پر پہونچ کر ان کو آگاہ کیا کہ دربار وزارت ہے نانی جان کا گھر نہیں ہے۔ ایک صاحب نے فقیر محمد کی جبر کی شکایت تحریراً پیش کی اس پر تحریراً جواب صادر ہوا کہ اگر میرے دربار کو اپنی حاضری کے لائق نہیں سمجھتے تو آپ تکلیف نہ کیا کیجیے۔ انہی درباروں میں نذریں[1] عیدین و نوروز وغیرہ کی لیا کرتے تھے اور جس قدر روپیہ جمع ہوتا تھا وہ سب حق وزارت سمجھا جاتا تھا۔ جو واقعی ایک رقم کثیر ہوا کرتی تھی۔ ان درباروں میں نشست نواب صاحب کی کبھی دس دس منٹ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

چند اصول متعلق انتظام ریاست — انتظام ریاست میں اس وزیر باتدبیر نے چند اصول کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

---

[1] ایشیا میں کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ قدیم الایام سے رسم نذر جاری تھی اور نذر دینے والے سود در سود فائدہ میں رہتے تھے یعنی خلعت و جواہر و مناصب و وظائف و عہدہائے جلیلہ سے سرفراز ہوتے تھے۔ ممالک یورپ میں جب بادشاہت قائم تھی بادشاہ بجبر اپنے امرا سے نقد و جنس وصول کرتا تھا اس زمانہ میں چونکہ لگام حکومت عوام کے ہاتھ میں ہے اور سوداگران دولت مند و اہل فنون مثل وکلائے عدالت یعنی بیرسٹر مقتدر ہو گئے کار رہیں تاریخ قدیم کو یاد کر کے کہتے ہیں کہ اس قسم کے مظالم اب تک ایران و ہندوستان وغیرہ میں جاری ہیں یہی وجہ ہے کہ صاحبان انگریز رؤساء ہند پر معترض ہیں اس رسم قدیم کے ممانعت سے رئیس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مگر رعیت فوائد سے محروم ہو جائے گی۔

اوّل اینکہ ہر ملازم ریاست کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ بالمشافہ عرض معروض کر سکتا تھا۔

دوئم اینکہ زبان فارسی میں جہاں تک ممکن ہو تعلیم حاصل کیجائے؛

سوئم اینکہ امرازادگان کو تعلیم علمی دیجائے؛ چنانچہ اس غرض کی حصول کے واسطے سن رسیدہ امرازادگان مثل بشیرالدولہ و اکرام الدولہ و شمشیر جنگ و میریاور علی خان وزرائے مددگار بخطاب صدرالمہام مقرر کئے گئے۔ اور چونکہ یہ حضرات ناتجربہ کار تھے لائق اور کارگذار مددگار موسوم بہ معتمدین مقرر کئے گئے۔

چہارم اینکہ سوائے اعلیٰ عہدہ داران مال جن کا لقب صدر تعلقدار تھا اور کل ریاست میں تنخواہ پانچسو روپیہ سے زیادہ نہ کیجائے۔ اور کسی عہدہ دار ادنیٰ و اعلیٰ کو بذات خود اختیار بحالی برطرفی ترقی تنزلی وغیرہ کا نہ دیا جائے۔ صرف سفارش کر سکتے تھے۔

پنجم۔ رزیڈنٹ صاحب سے سوائے معمولی خانگی دوستانہ خط و کتابت کے باقی کل انتظامی معاملات میں فارسی مراسلت کیجائے۔ معمولی خانگی دوستانہ خط و کتابت کے واسطے انگریزی دفتر تھا جس میں صرف دو تین مدراسی نقل نویس اور سردفتر مسٹر یورین نیم یوروپین موسوم بہ معتمد خانگی تھے۔ اس دفتر سے ایسے امور جیسے طلب فیل گھوڑا گاڑی، کھانے کی ملاقات کی دعوت، یا شکار کی پروانگی وغیرہ متعلق تھے۔ امور انتظامی میں دخل نہ تھا۔ فارسی دفتر کا نام دفتر ملکی تھا اور منشی محمد صدیق اس کے معتمد تھے۔ نثر فارسی بہت اچھی لکھتے تھے اور نہایت سیدھے سادے نمازی متقی خیر رساں آدمی تھے۔ روزانہ باریاب ہوتے تھے دخل در معقولات یا سازش یا ضرر رسانی ان کے ذہن میں بھی نہ تھی۔ اپنے موجودہ وقار

---

۵۷ یہ بھی ایک اصول تھا کہ کسی مدراسی یا ہندوستانی کو خدمت کار فرمائی نہ دیجاتی تھی صرف کارکن یعنی معتمد مقرر کئے جاتے تھے۔ اضلاع میں صدر تعلقداری تک ترقی دیجاتی تھی مگر صوبۂ اورنگ آباد پر صرف قدیم خاندان کا امیرزادہ مقرر ہوتا تھا۔

وماہوار پر نہایت بشاشت کے ساتھ قانع تھے اور عجب تر اینکہ یہی صفات کل انتظامی صیغوں میں پائی جاتی تھیں۔ شرارت اور دخل بیجا اور ترقی مدارج کے واسطے سازش و ہوس مطلق نہ تھی۔ صرف وزارت پناہ کی خوشنودی و رضامندی کے خواہاں تھے۔ اور اس وزیر باتدبیر کا حسنِ سلوک اور وسعتِ اخلاق ایسا تھا کہ یہ لوگ مودبانہ بے تکلفی کے ساتھ رفتار گفتار رکھتے تھے۔ بالخصوص صبح کے وقت دستار بر سر و کمر بستہ چند حاضر باش مثل سید[1] سعدالدین و مولوی شیخ احمد و داروغہ عبدالوہاب اور ان سب سے زیادہ استاد رضا علی بجائے اس کے کہ غیبت اور شکایت وغیرہ کریں ہنسی مذاق کے مہذبانہ و مودبانہ حرف و حکایات سے وزارت پناہ کے جفاکش ذہن و دماغ کو خوش اور بشاش کرتے اور خود نواب صاحب ایسے وقت کو غنیمت سمجھ کر ان کے ہنسی مذاق میں حصہ لیتے اور یہی موقع ان کو کبھی کبھی بلیرڈ کھیلنے میں بھی ملجاتا تھا۔ الغرض اس دفتر ملکی سے مراسلت خریطہ جات معاملات شاہ دکن و صدر صوبہ دار ہند یعنے وائسرائے و مراسلت مابین وزیر دکن و کیل منجانب صدر صوبہ دار یعنی رزیڈنٹ بابت اہم معاملات ملکی و معمولی معاملات متعلقہ افواج انگریزی مقیم سکندرآباد و بولارم و مفوضہ ملک برار و مقدمات دیوانی و فوجداری و مال مابین رعایائے سرکارین وغیرہ متعلق تھی۔ اور یہ مقدمات مولوی امین الدین خاں اور نائب اول رزیڈنٹ بمشورہ باہمی فیصل کیا کرتے تھے۔ لیکن جب مسٹر بوین کا انتقال ہوا ۔ اور مسٹر آلیفانٹ معتمد خانگی اور سید حسین صاحب بلگرامی ان کے پیش دست مقرر ہوئے تو تا قیام مسٹر مذکور بعض اہم معاملات مابین سرکارین بھی اس دفتر سے متعلق

---

[1] سید سعدالدین کی نسبت ان کے ایک ہم وطن مدراسی شاعر نے ایک ہجو بھی منظوم کی تھی اس کا ایک شعر مجھ کو یاد رہ گیا ہے ؎

کاٹیدن و نوچیدن و برآنگ پڑیدن ؛ کتّا ز تو پلّی ز تو بیندر ز تو آموخت

ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر مذکور" یا بدستے وگرے دست بدستے وگرے" حیدرآباد سے شباشب روانہ کردئے گئے جس کا ذکر آیندہ آنے والا ہے۔

ششم اینکہ۔ ذات بابرکات حضرت بندگان عالی حضور پرنور و آستانہ شاہی کی بابت اور اہم معاملات ملکی کو نواب مستغنی عن الالقاب شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک کے مشورہ سے کرتے تھے۔ اور نرسنگ راؤ ایک نہایت مہذب ذی وقعت آدمی منجانب امیر کبیر بطور وکیل ہر روز آستانہ وزارت پر اس ہی کام کے واسطے حاضر رہتے تھے۔

ان امیر کبیر کی ذات بابرکات ملک دکن میں نہایت ہر دل عزیز تھی اور اہل بلدہ محبت مفرط کی وجہ سے ان کو منجھلے میاں پکارا کرتے تھے۔ علوم ریاضیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور عربی فارسی سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس قدر خوش اخلاق و فیاض و کریم النفس تھے کہ ان کے علاقہ کے ملازمین پائیگاہ تو ایک طرف اہل بلدہ کہہ و مہ گویا ان کی پوجا کرتے تھے اور کل امرا و جمعداران و منصبداران و سررشتہ داران ریاست ان کے آگے سر جھکاتے تھے

ہفتم اینکہ کل انتظام ڈیوڑھی مبارک میں جو امراء و ملازمین آباً عن جدٍ پر سرکار چلے آتے تھے اس میں کوئی تبدل و تغیر جائز نہ رکھتے تھے تاکہ حقوق قدیم سے کوئی محروم نہ کیا جائے۔

ہشتم اینکہ محلات شاہی کے انتظام میں بغیر مشورہ جدۂ ماجدہ حضور پُرنور کوئی دخل نہ دیتے تھے اور اس قدر ان کی عظمت بڑھا رکھی تھی کہ بعض امور میں اسم گرامی بیگم صاحبہ کی پناہ لیکر رزیڈنٹ کی مداخلت بیجا سے محفوظ رہتے تھے۔

نہم اینکہ اصرار اس امر پر تھا کہ کوئی یوروپین یا نیم یوروپین ملازم ریاست بے ادبانہ

لہ ان کی جگہ میجر گاف جو حسب سفارش کپتان کلارک معتمد فوج مقرر ہوئے تھے اب معتمد خانگی بنائے گئے اور سید حسین صاحب ان کے پیش دست رہے۔

وبے تکلف باریاب نہونے پائے۔ لہذا کل ایسے ملازمین سوائے افسران فوج ننگے سر کلاہ بدست جوتے اُتار کر باریاب ہوتے تھے۔ بلکہ ہر یوروپین روبرو بیٹھ بھی نہ سکتا تھا کھڑے کھڑے عرض معروض کرکے چلا جاتا تھا اور وزارت پناہ ان سے کبھی انگریزی میں گفتگو نہ کرتے تھے بلکہ یہ بھی مسموع ہوا ہے کہ معاملات ملکی میں خود رزیڈنٹ سے اُردو میں رد و کد کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انگریزی مباحثہ میں رزیڈنٹ زبردست رہتا ہے اور اُردو میں میں اس پر حاوی رہتا ہوں۔

جب سے میں نے یہ سُنا میں خود بھی انگریزوں سے اُردو میں گفتگو کیا کرتا ہوں اور صاحبانِ انگریز بھی میری نیچی ڈاڑھی اور قدیم وضع پوشاک لباس دیکھ کر مجھ کو انگریزی داں نہیں سمجھتے بلکہ مغفرت مکان میر محبوب علی خاں کو بھی میں نے یہ نصیحت کی تھی اور یہی مشورہ دیا تھا کہ ہر اہم معاملہ میں صرف یہ ارشاد فرما دیا کریں کہ ما بدولت و اقبال اس امر پر غور کرکے تم کو تحریراً اطلاع دیں گے۔

وہ سب سے زیادہ اس امر پر اصرار تھا کہ دکن کے باہر رہنے والے ملازمین کو اپنی خانگی اور ڈیوڑھی مبارک شاہی اور صرف خاص کے معاملات میں ہرگز دخل نہ دینے دیتے تھے۔ اور یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اہل مدراس و ہندوستان و بمبئی وغیرہ قطعات ہند کے باشندے اگرچہ نہایت ہوشیار و تجربہ کار و مختلف علوم و فنون میں صاحب دستگاہ ہیں مگر فطرتاً ناممکن ہے کہ وہ ہم سے ایسی ہمدردی کریں جیسے وہ لوگ "جو اباً عن جدٍ" ہم سے تعلق رکھتے چلے آتے ہیں۔ ان بیرونی حضرات مذکورہ کی لیاقت و تجربہ کاری سے صرف ریاست کے انتظامی امور میں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس قاعدہ کی ایسی پابندی تھی کہ کوئی شخص بلا حصول اجازت

لے افسوس ہے کہ لارڈ کرزن کے وقت چونکہ کل معتمد عہدہ دار سوائے راجہ کشن پرشاد غیر ملکی تھے بخوف گورنمنٹ ہند کسی نے رائے مشورہ دینے کی جرأت نہ کی اور صرف اس خاموشی کی جلدوں میں خطابات سے سرفراز کئے گئے۔

خاص نہ رزیڈنٹ سے ملنے پاتا تھا نہ دیگر امرائے پاگاہ و پیشکاری سے مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی ایک دو مثالیں آیندہ آنے والی ہیں۔ صرف راقم ایک شخص تھا کہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اس کا ذکر بھی اپنے موقع پر آئے گا۔ مگر عجب تر اینکہ خزانۂ عامرہ و دفتر محاسبی پر بھی کوئی ہندوستانی مدراسی وغیرہ مقرر نہ تھا۔ صرف وہ ملازمین ہندو مذہب جن کے خاص تعلقات پشت بہ پشت چلے آرہے تھے وہی برسرکار تھے اور قدیم قواعد پر کل حساب ریاست رکھا جاتا تھا۔ اور یہ ارشاد ہوا کرتا تھا کہ انگریزی قاعدہ سے حسابات کے دیکھنے اور جانچنے میں بہت وقت صرف ہوا کرتا ہے۔ اکبر کے عہد سے آج تک جن قواعد پر حساب رکھا جاتا ہے وہ اس قدر سہل ہے کہ بہت جلد اور بلا وقت جانچ ہو سکتی ہے اور یہ دستور تھا کہ ہر روز بوقت دوازدہ ساعت شب ٹیپا پی را ما راؤ اور ان سے قبل ان کے باپ کردی وغیرہ کاغذات لیکر حاضر رہتے تھے اور وزارت پناہ جمع و خرچ پر دستخط کر کے اس دن تک کا جمع و خرچ بند کر دیتے تھے۔ اس کے بعد پوشاک شب خوابی پہن کر آرام فرماتے تھے۔ چنانچہ جس شب کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے دستخط کر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور صبح کو پنجۂ قضا ان کو ہم سے اُچک لے گیا ؎

بسے دور باید کہ چرخ ظفر

برآرد چو توشہسوارے دگر

ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضیٰ ہوتا ہے۔ کسی زمانہ میں کم عقل کم لیاقت ناقص تدبیر کے لوگ برسرکار ہوتے ہیں جس سے ملک و اہل ملک کو صدمہ پہونچتا ہے۔ چنانچہ حضرت سرور عالم رسول مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم نے اس کی نسبت جو پیشین گوئی فرمائی ہے اس کی صداقت کا ہم آج تجربہ کر رہے ہیں کسی عہد میں جو فروش و گندم نما لوگ

برسرِ کار ہوتے ہیں اور باوجود اپنی لیاقت اور ہنرمندی کے اپنی ذاتی فوائد کو امورِ عامہ پر ترجیح دیکر ملک اور اہل ملک کو تباہ کرتے ہیں۔ اور کوئی دور ایسا ہوتا ہے کہ صحیح العقل لوگ کارپرداز ہوتے ہیں اور انتظامی اصول قائم کرکے ملک اور اہل ملک کی روز افزوں ترقی میں کوشاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ دور ہی ایسا تھا کہ سُرتی مادھوراؤ گوالیار میں مہاراجہ جنگ بہادر نیپال میں اور سرسالار جنگ حیدرآباد میں ہمسراُن مدبّران ملک کے تھے جو یوروپ میں اپنا نام یادگار چھوڑ گئے ہیں۔

یازدہم اگرچہ رزیڈنٹ اور ان کے مددگاراول اور دیگر صاحبان انگریزی کی سفارش قبول فرماتے تھے۔ مگر گورنمنٹ کی کسی سفارش کو قبول نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب فوج باقاعدہ مرتب ہوئی تو وزارت پناہ نے کرنل نیول کو خود تلاش کرکے سرافسر فوج مقرر فرمایا اور گورنمنٹ آف انڈیا (Govt. of India) کے کسی نامزد کو قبول نہ کیا۔ اس ہی طرح حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں جنت آرام گاہ کے انتظام تعلیم کے وقت کپتان جان کلارک کو انگلستان سے براہ راست بلایا اور فارن آفس کی مداخلت بیجا کو ناجائز رکھا اور ہیجناں مسٹر بوین کے جو وزارت پناہ کے انگریزی استاد تھے۔ انتقال کے بعد مسٹر الیفانٹ کو پرائیوٹ سکرٹری بنایا۔ اسی طرح دیگر خدمات پر جن پر یوروپین کا ہونا ضروری تھا اور مفید تھا اپنے انتخاب سے ملازم رکھتے تھے۔

دوازدہم۔ ان کل اصولوں میں سب سے زیادہ قابل قدر یہ اصول تھا کہ اعزاز ہر کہ ومہ کے علیٰ قدر مراتب جو زمانۂ اکبر و عالمگیر سے چلے آتے تھے وہ بجد و کد قائم رکھے گئے تھے اور چونکہ وزارت پناہ نے اپنے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں نشو ونما پایا تھا ان اصول سے عملاً و سمعاً واقف تھے حیدرآباد کے تازہ وارد کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اکبر و عالمگیر

کے زمانہ کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔

احوالِ دربارِ وزارت پناہ | ایک اُندلسی قصہ موسوم بہ "قصہ جلبلاس" ہے اس کا ترجمہ میں نے زبان انگریزی میں پڑھا تھا جب میں آستانۂ وزارت پر حاضر ہوتا تھا نقشہ اس قصہ کا میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جایا کرتا تھا۔ جو اُندلسی مصنف نے وزیر اعظم کے دربار میں جلبلاس کی امیدواری کی بابت دلچسپ تفصیل سے لکھا ہے۔ آفتاب نکلنے سے قبل دوازدہ ساعت شب تک قابل دید گھما گھمی اور رونق رہتی تھی۔ علاوہ اُن پہرہ والوں کے جو شب و روز اُس وسیع جلوخانہ میں حاضر رہتے تھے۔ ملازمین اور عہدہ داران دفاتر و محکمہ جات کے میانہ منصب داران اور سررشتہ داروں کی پالکیاں، جمعداروں اور ان کے جلوس کے گھوڑے اور ہاتھی، امرا بلدہ کے جلوس، اور ہوا دار، امیدواروں کے میانہ، یہ تو باہر کا سماں تھا۔ اندرونِ دفتر خزانہ و محاسبی اور ان کے رُوبرو کے دالان میں جوانانِ نشست و چوبداران و فراشان وغیرہ اور اس ہی دالان سے زینہ پر چڑھ کر مختلف کمرے جن میں اہلِ دربار از صبح تا شام اوقات مقررہ پر حاضر ہر دربار کے واسطے وقت مقرر اور جدا جدا کمرہ جس میں فقیر محمد کی جابرانہ حکومت ان اہلِ دربار میں سے معزز تر حضرات آئینہ خانہ میں اپنے روز اور وقت مقررہ پر بامید باریابی اور گلیہاری میں معتمدین و صدران دفاتر و محکمہ جات منتظر یا دآوری بیٹھے ہوئے، ان سے معزز تر امرا مثل خاندان راؤ رمبا و راجہ شیوراج و ہرسہ صدر المہامان وغیرہم امرا باجمعیت و خطاب پہلے ہی سے وقت ملاقات مقرر کر لیتے تھے فقرا و مشائخ و علمائے دین کے واسطے بھی خاص وقت مقرر ہو جاتا تھا۔ ان کی ملاقات کے وقت مسند چھوڑ کر فرش پر بیٹھتے تھے۔ بلکہ بعض کا چند قدم استقبال بھی کرتے تھے۔ یہ مجمع کثیر جس میں مختلف مراتب و اعزاز کے اور اشخاص صاحب غرض لوگ

ہوتے تھے روزانہ آستانۂ وزارت پر حاضر رہتا تھا۔ اور یہ فیض بخش وسیع الاخلاق وزیر ہر فرد بشر سے اس طرح بخندہ پیشانی ملتا کہ وہ خوش خوش اپنے گھر واپس آتا اور یہ یقین کر لیتا کہ میں ہی مورد الطاف خاص ہوں۔ وسعت اخلاق کی دو تین مثالیں کافی ہوں گی۔

ایک بزرگوار عرصۂ دراز کے امیدوار نے سر دربار مسند کے پاس جا کر ایک رباعی پڑھی جس کا ایک شعر مجھ کو یاد رہ گیا ؎

کچھ نہ پوچھو کہ کیا پیتے ہیں کیا کھاتے ہیں
بیٹھ کر روزمیانہ میں ہوا کھاتے ہیں

ایک اور صاحب نے دربار عید میں کاغذ کے روپیہ کترکر نذر دیئے نواب صاحب نے ہاتھ کھینچا تو انہوں نے عرض کیا کہ جو کچھ گھر سے لایا تھا سب خرچ ہو گیا اور نذر دینی ضرور تھی پس اس ہی کو قبول فرمایئے۔ ایک منصب والے نے اپنا منصب اپنی اولاد پر منتقل کرایا بعد چندے درخواست پیش کی کہ سرکار نے میرا منصب میری اولاد پر منتقل فرمایا میں فاقہ مرتا ہوں میری پرورش فرمائی جائے۔ مثل مشہور ہے کہ حلیم کے غصہ سے بھی ڈرنا چاہیئے فطرتاً کانوں کے کچے تھے مگر انصاف پسند تھے بے دریافت حالات و واقعات سزا بھی نہ دیتے تھے۔ پھر بھی سخت گیر ایسے تھے کہ تباہ اور برباد کر دیتے تھے۔ مولوی احمد علی فرزند مولوی اکبر کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اس ہی طرح وہ چند لوگ جو شاہ دوزیریں باعث فساد تھے مثل مولوی محمود و اکبر علی[1] جو مسٹر ٹوئیڈی کے مورد عنایت تھے وغیرہ اپنی سزائے اعمال میں مبتلا ہوئے۔ اور قدردان ایسے تھے کہ خاک کو پاک کر دیا کرتے تھے چنانچہ غالب جنگ

---

[1] لائق علی خاں کے عہد وزارت میں اکبر علی کوتوال بلدہ کی خدمت اور خطاب اکبر جنگ سے سرفراز ہوا اس کی نسبت میں صرف اس قدر لکھتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے عذابوں میں تخفیف فرمائے۔

عرب جنید خاں پٹھان مہدوی تہنیت یاورالدولہ وغیرہ جنہوں نے عین کام کے وقت سرفروشی میں دریغ نہیں کیا تھا صاحب خطاب وجمعیت نقارہ ونوبت وجاگیر ومنصب ہوگئے۔ خلاصہ اینکہ جس طرح اپنی عظمت اور وقار ووقعت کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی بے ادبانہ حرکت کسی اہل دربار یا ملازم ریاست سے ہونے پائے اسی طرح ہر اہل دربار وملازم کی عزت کا خیال ازادنےٰ تا اعلیٰ علیٰ قدر حیثیت رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ ان کو آداب شاہی کے قائم رکھنے پر اصرار تھا اور اس کی بابت شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک مرحوم بھی برابر تاکید کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کسی منصب دار نے حضرت بندگان عالی کی نسبت لفظ بچہ کہا وزارت پناہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور علاوہ جرمانہ کے دربار اس کا بند کردیا۔ تہنیت یاورالدولہ اور عرض بیگی پر تاکید تھی کہ ہر بے ادب امیر ہو یا غریب ڈیوڑھی مبارک سے فوراً نکال دیا جائے۔ خلاصہ اینکہ اس وزیر باتدبیر کے کل حرکات وسکنات رفتار گفتار پابند قواعد وضوابط تھے۔ خوش خوراک از حد تھے۔ اطعمہ لذیذہ پر کمال درجہ حریص تھے۔ انگریزی، ومغلئی، وہندوستانی ودکھنی اطعمہ ہر قسم کے روزانہ طیار ہوتے تھے۔ داروغہ عبدالوہاب مدراسی منتظم باورچی خانجات تھے۔ دعوتوں کا یہ حال تھا کہ دن کی دعوت گاہ گاہ اور مختصر اور اکثر مختص بہ صاحبان انگریز ہوتی تھی جس کو "بریک فاسٹ" (Break fast) کہتے تھے۔ شب کی دعوت دہوم دھام سے ہوتی تھی کہ مہمان دنگ ہوجاتے تھے۔ انگریزوں کے واسطے میزیں الگ بچھتی تھیں[۱]۔ اس کے سامنے مکان میں دسترخوان دیسی مہمانوں کے واسطے بچھائے جاتے تھے۔ تمام بارہ دری روشنی سے جگمگا اٹھتی تھی۔ ہر چمن وشجر مختلف رنگ کی قنادیل سے پُرنور تھا۔ نواب صاحب دروازہ پر مہمانوں کے

---

[۱] جس پر پانچ سو سے کم انگریز نہ بیٹھتے تھے۔

لینے کے واسطے بذات خود کھڑے رہتے تھے۔ ذی مراتب صاحبان انگریز سے ہاتھ ملاتے تھے دوسروں کے واسطے صرف گردن ہلا دیتے تھے۔ دیسی لوگ دست بستہ آداب بجا لا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس رسم استقبال سے فارغ ہو کر خود رزیڈنٹ کے ساتھ میز پر بیٹھتے تھے۔ دیسی لوگوں کی مہمان نوازی میر نہور علی و دار وغہ عبدالوہاب وغیرہ و مصاحبین خاص کیا کرتے تھے۔ کل ملازمین ریاست و متوسلین خانگی مدعو ہوا کرتے تھے۔ میں نے انگریزوں سے سنا ہے کہ یوروپ میں بھی ایسی دعوت کسی جگہ نہیں ہوتی۔ رخصت کے وقت وزارت پناہ پھر دروازہ پر آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور لنبی لنبی عطر کی شیشیاں علیٰ قدر مراتب کسی کو بارہ کسی کو دس کسی کو دو کسی کو ایک عطا فرما کر رخصت کیا کرتے تھے۔ میرے حصہ میں پہلے دو آتی تھیں پھر پانچ ہو گئیں اور بالآخر نو کی نوبت پہونچی۔ خانگی انتظام بھی ان کا قابل دید اور حضرت آصف جاہ جنت آرام گاہ سے کم نہ تھا۔ ہر کارخانہ کی برآورد اور اخراجات ماہواری مقرر تھے ایک روپیہ زائد خرچ نہوتا تھا۔ ڈیوڑھی کا انتظام بیرون و محلات جدا جدا تھا۔ بیرونی انتظام شیدی عنبر خانساماں کی نگرانی میں محلات کا انتظام ان کی والدہ مرحومہ کے سپرد تھا۔ جاگیرات اور جمعیت کے واسطے علیحدہ انتظام تھا۔ کوئی ریاست کا ملازم خانگی انتظام میں یا خانگی ملازم ریاست کے معاملات میں دخیل ہونے پاتا تھا۔ اپنے ذاتی اخراجات میں نہایت جزورس تھے۔ مگر اپنے مرتبۂ وزارت کی وقعت قائم رکھنے میں کمال درجہ فیاض تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ قرضدار رہتے تھے۔ ایک روز جو میں سلام کے واسطے حاضر ہوا تو ایک ٹوکری تاڑ کے پتوں کی بنی ہوئی مسند کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ اس میں چند چیزیں سنگ مرمر کی آگرہ کی ساختہ رکھی ہوئی تھیں میرے چہرہ پر آثار تعجب دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ یہ عہدۂ وزارت کا جرمانہ ہے۔ ایک

انگریز مجھ سے ملنے آیا اور یہ تحفہ میرے واسطے لایا اور اپنی قیام گاہ پر جاکر پانچ ہزار کا بل ان اشیاء کی قیمت کا لکھ بھیجا۔

سواری مبارک حضور پر نور قلعہ گولکنڈہ میں رونق افروز تھی اور قاعدۂ قدیمہ یہ تھا کہ امرائے دربار ہمرکاب اپنی اپنی مقررہ مسل یعنی فرودگاہ پر مع خدم وحشم فروکش ہوتے تھے وزارت پناہ بھی ہمرکاب سعادت اپنی قدیم فرودگاہ پر جو اباً عن جدٍ ان کی ملک تھی فروکش ہوئے۔ میں لینے روزا ور وقت مقررہ پر اس مکان میں برائے سلام گیا۔ مکان بوسیدہ اور مرمت طلب تھا۔ میرے اس قول پر کہ مکان مرمت طلب ہے۔ ارشاد ہوا کہ روپیہ کہاں سے لاؤں۔ داروغہ نے تو تین ہزار کا تخمینہ پیش کیا ہے۔ یہ وزیر تھا کہ جس کی عظمت اور جس کا وقار نہ فقط ملک دکن میں بلکہ اقلیم ہند میں اور نہ فقط اقلیم ہند بلکہ ممالک یوروپ میں قائم تھا۔ اور جب اس وزیر با تدبیر نے سیر وسیاحت ہندوستان کا ارادہ کیا تو خود رزیڈنٹ جلو میں ہمرکاب حاضر تھا۔ اور وائسرائے کے احکام جاری ہوئے تھے کہ اس مہمان عزیز کی خاطر تواضع میں کوتاہی نہ کیجائے اور جب اس نے سفر یورپ کیا تو شاہ اطالیہ اور پاپائے روم نے اس کا استقبال کیا اور ایسی ہی مدارات اس کی فرانس میں ہوئی اور انگلینڈ میں جو اس کی مہمانداری کی گئی وہ شاہ ایران سے کم نہ تھی۔

نواب امیر کبیر | وزارت پناہ سے رتبہ میں اعلیٰ تر اور جاگیرات وجمعیت میں برتر نواب شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک معروف بہ منجھلے میاں تھے اور حضرت بندگان عالی سے قرابت قریبہ رکھتے تھے وزارت پناہ اگرچہ از حد پابند مراسم قدیمہ تھے۔ مگر پھر بھی انگریزوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے کچھ انگریزیت کی جھلک ان کے ہاں داخل ہوگئی تھی مثلاً نیا مکان آئینہ خانہ نفیس سامان آرائش و میز کرسی وغیرہ سے آراستہ تھا۔

اور انگریزی دعوتوں میں انگریزوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ان کے رشتہ دار بھی مثل نظام یار جنگ وغیرہ ان کے مقلد تھے۔ مگر نواب امیر کبیر کے ہاں انگریزیت کی بو بھی نہ تھی باوجودیکہ جوانی میں کلکتہ کا ایک سفر کر چکے تھے اور وائسرائے کے ہاں مہمان رہ چکے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا عالمگیر کے وقت میں داخل ہو گئے ہر ملازم سوائے افسران فوج کے نیچے نیچے دکھنی انگرکھے پہنے ہوئے کمر بستہ دستار بسر شمشیر بدست پیش قبض و رکمر اگر ضرورت ہو تو ہر وقت ورنہ صبح و شام باریاب ہو سکتا تھا۔ دربار کا دستور ان کے ہاں نہ تھا نہ کسی انگریز کی دعوت کرتے تھے سوائے اس کے کہ حسب قاعدۂ قدیمہ دربار شاہان دہلی ڈاڑھی منڈواتے تھے باقی کل امور میں پابند شرع شریف تھے۔ معاملات ملکی میں مطلق دخل نہ دیتے تھے اگر کوئی شامت کا مارا وزارت پناہ کی شکایت کرتا تھا تو خفا ہو جاتے تھے۔ اہل بلدہ کے ساتھ خواہ امیر ہو یا غریب نہایت فیاضی کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور پھر خود شرمندہ ہوتے کہ اس سے زیادہ کرنا چاہیئے تھا۔ عیدین نوروز و بسنت و ایام عرائس اولیائے کرام و شب برات وغیرہ ایام زینت میں ان کی ڈیوڑھی پر قابل دید رونق ہوتی تھی۔ عہدہ داران و منصب داران و داروغگان کل کارخانجات الغرض جملہ ملازمین پائگاہ مدعو ہوتے تھے اور اس خاندان کا دستور زمانۂ قدیم سے یہ تھا کہ ان سب مہمانوں کے ہاتھ دھلایا کرتے تھے۔ مگر چونکہ کبیر السن اور بہت کمزور و پوست استخوان تھے اپنے عوض اپنے بھتیجوں سے خدمت مہمانداری ادا کروایا کرتے تھے۔ دو بھتیجے تھے ایک محتشم الدولہ حبشن محل کے بطن سے تھے۔ دوم بشیر الدولہ ایک خاندانی بیوی کے پیٹ سے تھے۔

مملکت دکن میں پانچ علاقہ بڑے تھے

اوّل علاقہ صرف خاص۔ یہ براہ راست رئیس وقت

کے انتظام میں ہے اور محاصل اس کا اخراجات ذاتی وصفاتی و محلات میں صرف ہوتا تھا دیوان سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اور عمّال اس کے مقربان شاہی میں سے ہوتے تھے اور صاحب نوبت و عماری ہوتے تھے۔

دوم۔ علاقہ دیوانی۔

سوم۔ علاقہ پیشکاری۔ یہ حقیقت میں ابتداءً ایک علاقہ تھا اور کل ممالک محروسہ یعنی مع سمستان و جاگیرداران کو چک و سررشتہ فوج و منصب زیر انتظام وزیر اعظم تھا مگر راجہ چندولال کے وزارت کے زمانہ میں تفریق ہوگئی۔ ورنہ پیشکار محض مددگار وزیر اعظم تھا۔

چہارم علاقہ پائیگاہ[1]۔ علاقہ پاگاہ زیر انتظام ایک مقرب رئیس وقت یعنی آصفجاہ

---

[1] پاگاہ یا پائیگاہ۔ اس لفظ کے معنی اور وجہ تسمیہ میں نے حیدرآباد میں اکثر لوگوں سے دریافت کئے مگر جواب تسکین بخش حاصل نہ ہوا۔ تاریخ سلطنت مغلیہ دیکھنے سے البتہ کچھ پتہ چلتا ہے اس عہد میں ہر امیر دربار کو فوج و لشکر رکھنے کی پابندی تھی اور اس کے واسطے جاگیرات و مناصب عطا ہوا کرتے تھے۔ جاگیرات دو قسم کے ہوتے تھے ایک بزبان ترکی التمغا یعنی جاگیرات بجائے تنخواہ اور دوسرے جاگیرات خدمتی برلئے اخراجات فوج و لشکر اس ہی طرح دو طرح کے مناصب تھے ایک منصب رکاب سعادت جو وزیر اعظم سے لیکر ہر امیر دربار ادنیٰ و اعلیٰ اور ان کی اولاد کو عطا ہوتا تھا اور یہ منصب دار بادشاہ کے ذات خاص سے تعلق رکھتے اور خدمات مختلفہ و کارخانجات ہر شب و روز حاضر رہتے تھے۔ دوم منصب دیوانی جو برلئے تربیت و تعلیم شرفا و نجبا عطا ہوا کرتا تھا کہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جائے۔ اور دستور یہ تھا کہ ہر امیر صاحب جاگیر و فوج اپنی اپنی فوج اور منصب دار خود بھرتی اور مقرر کرتا تھا۔ اس انتظام میں وزیر اعظم سے لیکر صوبہ داران ممالک تک کی طرف سے خوف و اندیشہ رہتا تھا لہذا ایک فوج خاص اہل بغاوت کی سرکوبی کے واسطے قائم کی گئی۔ اور یہ ذات خاص بادشاہ سے تعلق رکھتی تھی اور افسران فوج نہایت صحیح النسب ہوا کرتے تھے اور ان کی قدر و منزلت بڑھانے کی واسطے شاہزادیاں ان کے گھر دی جایا کرتی تھیں اور یہ فوج اور امرائے فوج دارالسلطنت میں مقیم اور شبانہ روز خدمت حفاظت ذات بادشاہ کے واسطے مستعد بکار رہتی تھی اس فوج کو پائیگاہ اور اس کے افسر کو امیر کبیر کہتے تھے پس اس کے دو کام تھے ایک حفاظت ذات بادشاہ اور اس حیثیت میں گویا باصطلاح حال بوڈی گارڈ تھی۔ دوسرا سرکوبی وزراء و صوبہ داران باغی۔ نواب سر خورشید جاہ اکثر کہتے تھے کہ یہ نئی فوج جمعیت میسرم و رسالہ حبشیاں و فوج باقاعدہ جو ماتحت دیوان ہیں ہمارے تحت میں ہونی چاہئیں مگر چونکہ (باقی نوٹ صفحہ آئندہ)

اس واسطے قائم کیا گیا تھا کہ وزیر اعظم یعنی دیوان و دیگر اُمرائے عظام متمردی و سرکشی نہ کرنے پائیں۔ یہ ایک فوج تھی جو بسرکردگی تیغ جنگ کی گئی تھی۔

پنجم علاقہ سمستان۔ یہ چند مختصر رجواڑے تھے جو آصف جاہ کے باجگذار تھے۔ آخر الذکر کے راجگان باجگذار اپنی ریاستوں یعنی سمستانوں میں خود مختار صرف وزیر اعظم سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے زمانۂ قیام میں میں نے کسی سمستانی کو اعلیٰ حضرت کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پائیگاہ کے کل علاقہ جات امرائے پائیگاہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں وزیر اعظم کو کوئی تعلق نہ تھا۔ میرے ابتدائی زمانہ میں و عہد سلطنت حضرت افضل الدولہ میں نصف سے زائد پائیگاہ عمدۃ الملک مرحوم کے پاس تھی اور نصف باقی وقار الامرائے رشید الدین خاں مرحوم محتشم الدولہ اور بشیر الدولہ میں منقسم تھی بعد انتقال محتشم الدولہ وہ بھی حصہ بشیر الدولہ کے پاس آگیا۔ ان امراء کی گاہ گاہ جب سواری نکلتی تھی تو لوگ تماشہ دیکھنے کے واسطے جمع ہو جاتے تھے خصوصاً عمدۃ الملک جب رزیڈنٹ سے ملنے جاتے تھے تو اس شان و شوکت اور جمعیت کے ساتھ جاتے تھے کہ ڈنکا اور نشان ان کا رزیڈنسی کے دروازہ پر اور بوچہ سواری انکا ہنوز ڈیوڑھی کے دروازہ پر ہوتا تھا۔ اور رزیڈنٹ سیڑھیوں کے نیچے استقبال کرکے دست بدست لیجاتا تھا۔ علاقہ دیوانی یعنی ریاست ابد مدت کا کل انتظام بیرونی و اندرونی زیر حکومت دیوان یعنی وزیر اعظم تھا۔ اور کسی عہدہ دار و ملازم ریاست از ادنیٰ تا اعلیٰ کی مجال نہ تھی کہ بغیر اجازت وزیر اعظم رزیڈنٹ کے پاس یا امرائے پائیگاہ کے پاس جا سکے صرف دو تین مخصوص عہدہ داران ریاست اعلیٰ حضرت کی نذرول

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اخراجات اس کے دیوانی سے ہو رہے ہیں لہذا ہم خاموش ہیں پھر بھی مختار الملک تک تو مضایقہ نہیں ہے لیکن اگر بعد ان کے غیر اور آفاقی آدمی مقرر ہو تو بیشک ہم دعویٰ کرینگے اس واسطے کہ ہماری خود بقا رئیس و ریاست کے ساتھ ہے اور ہم اباً عن جدٍ ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

نواب امیر کبیر رشید الدین خان بہادر

کے واسطے وہ بھی ہمراہ وکیل ریاست تہنیت یاورالدولہ حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باب سازش ان کے زمانہ میں کلیتہً بند تھا اور تمام اہل ریاست کی امید و بیم[1] ذات واحد وزیر با تدبیر سے متعلق تھی۔ علاقہ صرف خاص ایک امیر زادہ قدیم و باخطاب و نوبت و نقارہ کی سپرد تھا جس کو خود اعلیٰ حضرت اپنے مصاحبین حاضر باش میں سے نام زد فرماتے تھے ایک علاقہ دار کو دوسرے علاقہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔

نواب وقار الامرا | نواب رشید[2] الدین خاں وقار الامراء برادر خرد مختلف البطن نواب شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک کے تھے۔ اس امیر با وقار اور وزیر با تدبیر میں قاطع بطن عداوت تھی۔ جس کی تفصیل ایک قصہ طویل اور لایق اس کے ہے کہ چادر نسیاں میں پوشیدہ رہے۔ نہایت دلیر سپاہی اور تند مزاج تھے۔ متوسط القامت سانولا رنگ چھریرا جسم مونچھیں ایسی چڑھی ہوئیں جس پر لیموں رکھدیا جائے، بلند حوصلہ اور مستعد بکار گو لکھے پڑھے نہ تھے اور مثل اپنے برادر بزرگ کے فیاض اور ہر شخص کے ساتھ سلوک کر کے خود شرمندہ ہوتے تھے کہ کافی سلوک نہ کیا گیا جلد خفا ہو جاتے تھے اور جلد معاف بھی کر دیتے تھے اکثر مجرمین و ملزمین اہل بلدہ بھاگ کر ان کی ڈیوڑھی میں پناہ لیتے تھے اور قانونی سزا سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ ان کے مفصل حالات اپنے مقام پر مسطور ہونگے۔

راجہ نرندر | راجہ نرندر پیشکار ریاست راجہ چندو لال کے پوتے تھے۔ راجہ چندو لال

---

[1] یہ امید و بیم اصل اصول انتظام ہے لایق علی خاں کے بعد یہ امید و بیم رزیڈنٹ کی طرف منتقل ہوگئی۔ اور اول جس نے دروازہ رزیڈنٹ کا کھولا جناب مولانائے معظم منیر جنگ محسن الملک مولوی مہدی علی خاں اور سردار عبد الحق دلیر جنگ تھے اس زمانہ سے آج تک ہر کہ و مہ حتیٰ کہ وزیر وقت رزیڈنٹ کے تیور کو دیکھا کرتا ہے۔

[2] تاریخ پیدائش ۲۲ رمضان سنہ ۱۲۳۰ ہجری مقدسہ۔ اپنے برادر کلاں نواب امیر کبیر عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد بتاریخ ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۹۴ھ م ۱۱ اکتوبر [illegible]ء میں شریک نائب رئیس مقرر ہوئے۔ ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۹ھ کو انتقال ہوا۔

کے واسطے وہ بھی ہمراہ وکیل ریاست تہنیت یاورالدولہ حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باب سازش ان کے زمانہ میں کلیۃً بند تھا اور تمام اہل ریاست کی امید و بیم[1] ذات واحد وزیر باتدبیر سے متعلق تھی۔ علاقہ صرف خاص ایک امیر زادہ قدیم و باخطاب و نوبت و نقارہ کی سپرد تھا جس کو خود اعلیٰ حضرت اپنے مصاحبین حاضر باش میں سے نام زد فرماتے تھے ایک علاقہ دار کو دوسرے علاقہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔

نواب وقارالامراء | نواب رشید[2] الدین خاں وقارالامراء برادر خرد مختلف البطن نواب شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک کے تھے۔ اس امیر باوقار اور وزیر باتدبیر میں قاطع بطن عداوت تھی جس کی تفصیل ایک قصہ طویل اور لایق اس کے ہے کہ چادر نسیاں میں پوشیدہ رہے۔ نہایت دلیر سپاہی اور تند مزاج تھے۔ متوسط القامت سانولا رنگ چھریرا جسم مونچھیں ایسی چڑھی ہوئیں جس پر لیموں رکھدیا جائے، بلند حوصلہ اور مستعد بکار مگر لکھے پڑھے نہ تھے اور مثل اپنے برادر بزرگ کے فیاض اور ہر شخص کے ساتھ سلوک کرکے خود شرمندہ ہوتے تھے کہ کافی سلوک نہ کیا گیا جلد خفا ہو جاتے تھے اور جلد معاف بھی کردیتے تھے اکثر مجرمین و ملزمین اہل بلدہ بھاگ کر ان کی ڈیوڑھی میں پناہ لیتے تھے اور قانونی سزا سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ ان کے مفصل حالات اپنے مقام پر مسطور ہونگے۔

راجہ نرندر | راجہ نرندر پیشکار ریاست راجہ چندولال کے پوتے تھے۔ راجہ چندولال

---

[1] یہ اُمید و بیم اصل اصول انتظام ہے لایق علی خاں کے بعد یہ امید و بیم رزیڈنٹ کی طرف منتقل ہوگئی۔ اور اول جس نے دروازہ رزیڈنٹ کا کھولا جناب مولانائے معظم منیر جنگ محسن الملک مولوی مہدی علی خاں اور سردار عبدالحق دلیر جنگ تھے اس زمانہ سے آج تک ہر کہ دمہ حتیٰ کہ وزیر وقت رزیڈنٹ کے تیور کو دیکھا کرتا ہے۔

[2] تاریخ پیدائش ۲۲ رمضان ۱۲۴۳ھ ہجری مقدسہ۔ اپنے برادر کلان نواب امیر کبیر عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد بتاریخ ۲۰ رمضان ۱۲۹۴ھ م ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۷ء میں شریک نائب رئیس مقرر ہوئے۔ ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ کو انتقال ہوا۔

کی حکایت مشہور ہے کہ جب وہ پنجاب سے دکن میں آئے تو مفلس قلّانچ تھے اور اس زمانہ میں
اہل بلدہ کلہم اجمعین چہ امیر چہ غریب ناخواندہ محض تھے اور بجز فن سپہ گری دوسرے کل
فنون و علوم کو حقیر سمجھتے تھے۔ صرف چند کایستھ اور برہمن اہل قلم تھے۔ راجہ چندو لال حالت
افلاس میں ایک چادر زمین پر بچھا کر زیر چار مینار مع کاغذ و قلم دوات روزانہ بیٹھتے تھے
اور لوگوں کے خط حسب حیثیت ایک آنہ سے لیکر ایک روپیہ تک لیکر لکھا کرتے تھے اور جو کچھ
اس طرح کماتے تھے بقدر گذران رکھکر باقی کل خیرات کر دیا کرتے تھے رفتہ رفتہ ان کی
خبر نواب امیر کبیر وقت کو پہونچی اور اس سرکار میں ملازم ہو کر اس قدر ترقی کی کہ تمام پائیگاہ
کے انتظام پر قابض ہو گئے۔ خلاصہ اینکہ حضرت بندگان عالی تک پہونچ گئے اور پیشکار
ریاست کی خدمت پر سرفراز ہو کر بہت جلد وزیر مختار ریاست ابد مدت ہو گئے۔ تمام امراء
ریاست میں صرف راجہ[1] نرندر علی لیاقت میں عمدۃ الملک اور مختار الملک کے ہمسر تھے۔ بلکہ عربیت میں
ان سے بھی زیادہ تھے اور سنسکرت اور تلنگی و مرہٹی میں بھی اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ داد و دہش
میں اپنے دادا سے کم نہ تھے۔ فقراء اور مشائخ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور وظائف اور اوراد
عملیات کا بہت شوق تھا۔ نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ ایک شب کو کہ میں تنہا باریاب تھا مہاراج
نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے اتھرون وید کے فلاں اشلوک میں صاف صاف پیشینگوئی
حضرت سرور عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم کی بابتہ باسم مبارک محمد و بکلمۂ
پاک لا الٰہ الا اللہ موجود ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے رشی و منی
جن کو باصطلاح اسلام نبی کہنا چاہیئے بعض ان میں سے صاحب شریعت ہوئے ہیں اور

---

[1] راجہ چندو لال کے پوتے ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۴ھ کو پیدا ہوئے۔ ۲ شعبان ۱۲۶۹ھ کو پیشکار مقرر ہوئے ۱۳۰۰ھ
میں سالار جنگ اول کے انتقال کے بعد منصرم مدار المہام مقرر ہوئے اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کی تخت نشینی
۳۰ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ تک خدمت وزارت پر مامور رہے۔ ۲۱ رمضان ۱۳۰۱ھ کو انتقال کیا۔

مہاراجہ نرندر پرشاد بہادر

بعض محض ہادیِ قوم جس طرح حضرت موسیٰ صاحبِ شریعت و حضرت مسیح تابع شریعت بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے بلکہ میں تو یہ کہوں گا ممالک و اقوام دیگر مثل ایران و چین وغیرہ میں بھی شارع و ہادی ہوتے آئے ہیں۔ مگر یہ سب حضرات صرف اپنی اپنی قوم کے واسطے شارع و ہادی تھے کسی نے دعویٰ عام ریاست اور بشیراً و نذیراً ہونے کا نہیں کیا جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ نے کیا ہے کہ لانبی بعدی یعنی میرے بعد کوئی صاحب شریعت نبی مبعوث نہ ہوگا اور یہ دعویٰ ان کا صحیح و سچ ثابت ہوا۔

اچھے خاصہ موحّد تھے باقی کل امور میں پابند مراسم ہنود تھے ان کے حالات بھی آئندہ آنے والے ہیں۔

حاضر باشان ڈیوڑھی مبارک شاہی میں سب سے بڑے اور ممتاز نواب تہنیت یاور الدولہ وکیل سلطنت مابین شاہ و وزیر تھے۔ ابتدائی حالت میں ایک معمولی منصب دار تھے مگر اپنے حسن لیاقت سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے اس مرتبہ کو پہونچ گئے۔ بہت صحیح العقل و دوربیں اور نہایت خیر خواہ شاہ و وزیر تھے۔

یہ عجیب[1] بات ہے کہ کل اہل حیدرآباد چہ ہندو و چہ مسلمان فطرتاً اپنے آقائے ولی نعمت

---

[1] یہ عجیب بات میں نے دیکھی کہ ہنود و مسلمان مثل شیر و شکر ملے جلے رہتے تھے اور جس طرح ہنود ہر سہ علاقہ جات دیوانی و پائگاہ و صرف خاص میں بعہدہ ہائے جلیلہ و مناصب و جاگیرات پر سرفراز تھے اسی طرح مسلمان بھی علاقہ پیشکاری و دیگر امرائے ہنود مثل راجہ شیوراج وغیرہ میں ملازم تھے اور ہنود کے تہواروں و مسلمانوں کی عیدوں وغیرہ میں باہم بلاتکلف شرکت کرتے تھے۔ خود مجھ کو بھی پابندی ان مراسم کی کرنی پڑی یعنی مہاراجہ نرندر جب مسند وزارت پر متمکن ہوئے تو یہ رو اسم مجھ کو بھی ادا کرنے پڑے اور بعض امرائے ہنود تو خود بندگان عالی حضور پُرنور سے برابری کا دعویٰ رکھتے تھے مثلاً راؤ رمبا جب ہمرکاب سعادت ہوتے تھے تو اپنا ہاتھی اور عماری حضوری ہاتھی کے برابر رکھتے تھے اور باہم طریق تعارف یہ تھا کہ ادھر راؤ اپنے ہاتھی پر ہاتھ رکھتے تھے ادھر بندگان حضرت پیشانی مبارک پر ہاتھ رکھ کر ان کا سلام قبول فرماتے تھے۔ دیگر امرائے ہنود دس دس لاکھ کی جاگیرات سے تمتانہ مثل امرائے اسلام اپنے اپنے علاقہ کے مختار تھے۔ اگرچہ عہد و نیابت آسمان جاہ بشیر الدولہ (باقی نوٹ برصفحہ آئندہ)

پر حاضر و غائب جان نثار کرنے کو موجود تھے۔ گویا بعد خدا اور رسول کے اپنے مالک کی پوجا کرتے تھے۔ اور امراء و ملازمین، ہنود تو اپنا دیوتا اوتار سمجھتے تھے۔ کسی پردیسی مدراسی، پارسی، انگریز، ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ بے ادبانہ اسم مبارک اعلیٰ حضرت زبان پر لا سکے۔ علاوہ تہنیت یاور الدولہ کے چند ذی وقعت حضرات منجانب وزیر و امیر کبیر روزانہ ڈیوڑھی مبارک پر حاضر رہتے تھے منجملہ اُن کے معز الدین صاحب و فصیح الدین صاحب منجانب وامیر کبیر اور شہسوار جنگ و مستحکم جنگ و اکرام جنگ بحیثیت بندگان خاص ڈیوڑھی مبارک روزانہ در دولت فلک رفعت شاہی پر حاضر رہتے تھے۔ صاحبان خدمت میں سب سے اعلیٰ عرض بیگی تھے۔ ایسے بدشکل و صورت کہ اگر شب ماہ میں یکایک سامنے آجائیں تو رستم بھی ان کو دیکھ کر ڈر جائے۔ ان کے بعد داروغگان کارخانجات مثل توشک خانہ و جواہر خانہ وغیرہ تھے۔ جو باعن جدِ اپنی خدمات پر حاضر رہتے تھے۔ امرائے ریزہ و جمعداران وغیرہم کے نام بنام تحریر کرنے کی ضرورت نہیں اس قدر بیان کافی ہے کہ کل اہل بلدہ ہندو مسلمان رفتار گفتار دستار میں ہم وضع تھے۔ تحریری زبان فارسی اور گفتگو دکھنی تھی۔ صرف ایک امیر باوقعت کا مختصر حال لکھ کر اپنی امیدواری کے حالات

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) میں مولوی مشتاق حسین نے امرائے ہنود معہ مہاراجہ پیشکار پر دست درازی کی تھی مگر میرے زمانہ میں محفوظ رہے۔ مولانائے ممدوح اپنے ہم وطنوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتے رہے اور بیشتر مسلمان طلباء کو انگلینڈ برائے تعلیم بھیجتے رہے۔ مگر میں نے اپنے ہنود بھائیوں کے ساتھ بھی اس سلوک میں دریغ نہیں کیا۔ مثلاً نگیا نائیڈو کہ میرا ملازم خانگی تھا اور منجملہ دیگران دختر بلند اختر ڈاکٹر راگھو ناتھ شاید سروجنی نام کہ آج فخر نسواں ہند ہیں اور ایک دو ڈاکٹر لاری کے سفارشی انگلینڈ بھیجے گئے بلکہ خود ڈاکٹر راگھوناتھ کہ عالم متبحر اور فقیر منش گویا آدھے مسلمان تھے مولوی سید حسین صاحب نے ان کو سررشتہ تعلیم سے موقوف کر دیا تھا اور بشیر الا صاحب مدراسی ان کے معاون تھے میں نے پھر ان کو بحال رکھا اور نہ صدر روپیہ مقرر کرا دیا۔ سنا ہے کہ میرے آنے کے بعد کسی وجہ سے کلکتہ چلے گئے اور وہیں بیکنٹھ باشی ہوئے۔

نواب امیر کبیر سر خورشید جاہ بہادر

شروع کرتا ہوں۔

نواب امیر کبیر خورشید جاہ

یہ امیر ذی شان نواب خورشید جاہ[1] فرزند اکبر نواب وقار الامرا رشید الدین خاں اور داماد اکبر حضرت مغفرت منزل افضل الدولہ جنت آرام گاہ کے تھے متوسط القامت گورا رنگ دُہرا جسم بہت حسین بارعب و داب اپنے والد کی حیات میں اپنا حصہ پائگاہ کا الگ کرکے خود مختار ہو گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دادا امیر کبیر ان کو بہت چاہتے تھے اور ان کے والد سے پوشیدہ لاکھوں روپیہ کا زر و جواہر ان کو دیا کرتے تھے جو باعثِ رشک ان کے والد کے ہوا کرتا تھا۔ علاوہ اس کے حضور پُر نور ان سے محبت رکھتے تھے۔ اور بہت کچھ زر و جواہر علاوہ جاگیرات خاص سے سرفراز فرمایا تھا جس کو ان کے والد سے کوئی تعلق نہ تھا اور جب ان کے چھوٹے بھائی اقبال الدولہ پیدا ہوئے تو باہم والد و فرزند میں بے لطفی اور زائد ہو گئی۔ بعد مختار الملک وزیر اعظم کے یہ امیر ذیشان نہایت منتظم اور کاروبار سے ہوشیار حساب کتاب اور فارسی نوشت و خواند میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی بھی مثل اُن کے والد کے مجرمین و ملزمین کی پناہ تھی۔ عدالت کوتوالی والے اندر قدم نہ رکھنے تھے۔ وزیر اعظم کے احکام کی تعمیل ان کے علاقہ میں مطلق نہ ہوتی تھی۔ گویا ان کے علاقہ کا ٹکڑا ایک مستقل ریاست خود مختار تھی۔ ان کے علاقہ کا اسٹامپ بھی الگ تھا۔ اور ان کی عدالت و کوتوالی کا انتظام بھی الگ تھا۔ مگر بڑا وصف ان میں یہ تھا کہ خود کارفرما اور کارکن مثل وزیر اعظم تھے۔ ان کے کوڑے والے خاص وردیاں پہنے ہوئے کوڑے بدست ایسے بیباک تھے کہ کسی کی اصل نہ سمجھتے تھے۔ وزیر اعظم نے ایک مختار جس کو سفیر کہنا چاہیئے خاص ان کے دربار میں مقرر کیا تھا جس کے ذریعہ سے فی الجملہ

---

[1] ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا۔

تعمیل احکام عدالت و کوتوالی ہو جاتی تھی۔ ان کو خانی و بہادری و جنگی کے خطابات دینے کا
اختیار بھی حضور پر نور سے عطا ہوا تھا۔ چونکہ لاڈلے داماد تھے اس واسطے خاص حضوری
پگڑی بھی عطا ہوئی تھی۔ ان کی ڈیوڑھی کے ملازم و علاقہ کی رعایا نہایت خوش و خرم و خوش
حال تھے۔ صدر صوبہ دار ہند یعنی نواب گورنر جنرل ان سے برابر کی ملاقات کرتا تھا اور
یہ بھی نہایت دھوم دھام سے صاحبان انگریز کی دعوت مثل نواب وزیر اعظم کیا کرتے تھے
دیگر حالات ان کے اپنے موقع پر بیان کئے جائیں گے۔

حالاتِ بلدہ و اہلِ بلدہ | یہ مختصر حالات تو اُمرائے وقت کے تھے اب بلدہ اور اہل بلدہ کے
حالات بھی ہدیۂ ناظرین کرنے خالی از لطف نہیں ہیں۔

کل شہر شاہ راہ و گلیاں بجز پتھر گھٹی تا صدر دروازہ ڈیوڑھی مبارک چوڑے چوڑے
سنگ خارا سے سنگ بستہ تھا۔ گلیاں تنگ اور نہایت گندی حالت میں تھیں حتیٰ کہ وہ
گلی جو گاڑی خانہ شاہی کو جاتی تھی موسوم بہ "مُونری" گلی تھی۔ صرف صدر دروازہ ڈیوڑھی
سے لیکر تا ڈیوڑھی دیوانی و دروازہ چادرگھاٹ پختہ سڑک گھوڑا گاڑی کے قابل تھی شہر
کی گندگی کی بابتہ حکایت مشہور تھی کہ وزارت پناہ نے انتظام صفائی شہر کرنا چاہا۔ مگر مخالفین
وزارت نے جس میں نام مولوی محمود و اکبر علی کا شریک تھا اور جو نواب وقار الامراء
رشید الدین خاں کی زبردست پناہ میں تھے حضرت افضل الدولہ جنت آرام گاہ سے
عرض کیا کہ یہ دیوان نمک حرام بلدہ کے راستے اس نیت سے صاف کرتا ہے کہ انگریزوں کی
آمد و رفت اندرونِ بلدہ جاری ہو جائے۔ پس حکم اقدس برائے ممانعت صفائی شہر و درستی
راستہ جاری ہوگیا۔

اہل بلدہ نہایت سیدھے سادے بھولے لوگ تھے اور اُن کی معاشرت بھی بہت سادی

تھی۔ ڈھنی چولی دار انگرکھے اپنی اپنی خاندانی پگڑیاں ان کی پوشاک تھی۔ غذا چاول زیادہ، روٹی بہت کم وہ بھی تنوری جسے "نان کی روٹی" کہتے تھے۔ پنکھا خس کی ٹٹی وغیرہ تکلفات ہمارے ہندوستانی بھائیوں نے شمالی ہند سے آکر جاری کئے عام غذا اہل بلدہ کی۔ موٹے چاول املی انبا ڑا وغیرہ کا ترش وشدید مرچوں والا سالن یا بازاری چاکنا بمعیت سیندھی بطور گزک اُمرا عظام کے دسترخوان پر علاوہ مذکورہ اغذیہ کے قدیم زمانہ کی غذائیں پلاؤ بریانی سنبوسے شکم پور پراٹھے اور طوطاک وغیرہ چنے جاتے تھے مگر ان سب سے زیادہ مختلف اقسام کی چٹنیاں کھوپرے خشخاش و بادام وغیرہ کی پسی ہوئی نہایت خوش ذائقہ اور عقولی کا مزعفر ہوا کرتا تھا۔ جاڑوں میں حلوا سوہن کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں سبز و زرد رنگ برنگ کاغذوں میں لپٹی ہوئی باہم تقسیم ہوتی تھیں اور ایک خاص غذا جس کو کٹہ کہتے ہیں بہت تکلف سے پکائی جاتی تھی یہ غذا نہایت با ذائقہ اور مفید گردہ و مثانہ ہوتی ہے۔ یہ غذا پکانے میں میری بڑی بہو سلمہا ید طولیٰ رکھتی ہے اور پورن پوریاں بھی خوب پکاتی ہے۔ کل خواص وعوام شراب فرنگ سے متنفر اور دکن کی سیندھی کے شائق تھے حتیٰ کہ ملّا مشائخ بھی اس سے بری نہ تھے۔ عُرسوں، یا عیدوں میں، یا شادی بیاہ کی تقاریب میں بریانی پکتی تھی۔ اور حق یہ ہے کہ ایسی بریانی اقلیم ہند میں کہیں نہ پکتی ہوگی۔ پلنگ چارپائی معدوم تھی۔ امرائے عظّام تک فرش پر بستر بچھا کر آرام فرمایا کرتے تھے۔ مثل مشہور تھی کہ حیدرآباد میں سَو میں ایک ایسا ہوگا کہ جو بچھو کے ڈنک سے محفوظ رہا ہوگا۔ عوام الناس کی علمی لیاقت یہ تھی کہ کایستھ لوگوں سے خط لکھوایا کرتے تھے اور اس ہی ایک فرقہ میں نوشت و خواند جاری تھی۔ زبان اہل شہر کی اردوئے قدیم تھی۔ تمام شہر میں ایک شاعر تھا۔ جس کا تخلص فیض تھا۔ اُس کا ایک مصرعہ مجھکو یاد رہ گیا ع وہ ہوا جامے سے باہر میں بھی ننگا ہو گیا۔

یہ حالت مسلمانوں کی تھی۔ ہنود میں کایستھ بیشتر اور برہمن کمتر فارسی اور حساب دانی میں مشتاق تھے۔ یہ فرق اس وجہ سے تھا کہ کل مسلمان سپاہ پیشہ نظم جمعیت میں ملازم تھے یا مناصب و وظائف سے سرفراز تھے۔ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی اردو میں آگیا ہوں بالخصوص جب میں پتھر گھٹی میں رحیم بخش کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا تو عجیب وغریب تماشہ دیکھتا تھا یعنی امرائے کوچک و جمعداران نظم جمعیت کی سواریاں مع اپنے جلوس کے بڑی شان وشوکت سے ڈیوڑھی دیوان پر برائے سلام وزارت پناہ جایا کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ لطف اس کا پانچ محرم الحرام کو آتا تھا۔ اس دن ڈیوڑھی دیوان کی برائے دعوت صاحبان انگریز سجائی جاتی تھی۔ علی الصباح تمام[1] نظم جمعیت اور سپاہ پاگاہ و علی غول جمعیت صرف خاص و دیوانی و پیشکاری قدیم پوشاک کے لباس میں زرہ و بکتر در برگرز و تبر در دست اور سران سپاہ یعنی جمعداران رنگ برنگ و زرق برق لباس و سرپیچ و دیگر جواہرات سے مزین مع جلوس چتر و نشان نقارہ نوازان پھریرا براں عرب شمشیر برہنہ رقص کرتے ہوئے بندوقیں سر کرتے ہوئے رسالہ حبشیاں رستم تواں و پلٹن میرم ترکی باجا نوازاں اور ان سب کے عقب میں فوج باقاعدہ بسر کردگی کرنل ہیومل مع انگریزی بینڈ دلکش یہ کل جمعیت یکے بعد دیگرے اول دیوان اور مہمانان انگریز کی سلامی اتارتی ہوئی براہ پرانی حویلی ڈیوڑھی پیشکار سے ہوتی ہوئی پنج محلہ سے برائے سلامی حضرت بندگان عالی گذرتی ہوئی چار مینار پہونچ کر منتشر ہو جاتی۔ اس عجیب و غریب تماشہ سے وہ شان ریاست نمودار ہوتی تھی جس کو صاحبان انگریز بھی دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے تھے۔ اور گمان کرتے تھے کہ وہ ۱۹ صدی عیسوی میں نہیں ہیں بلکہ عہد اکبر و عالمگیر میں آ گئے ہیں۔ افسوس کہ

---

[1] اس رسم کو لنگر کہا کرتے تھے جو قدیم زمانہ سے جاری تھا۔

یہ شان صرف وزارت پناہ کی زندگی تک قائم رہی۔ گو کچھ نمونہ اس کا مہاراج نرندر تک باقی تھا مگر عہد وزارت نواب لائق علی خاں میں گویا اس پر اوس پڑ گئی۔ ان کے بعد جو بجھتی ہوئی شمع رہ گئی تھی وہ بھی خموش ہو گئی۔

حالات زمانۂ امیدواری

چچا مرحوم کی فیاضی کی وجہ سے میرا زمانۂ امیدواری بہت آرام سے گذرا۔ ہر چہار شنبہ کو میں وزیر اعظم کے سلام کو اور جمعہ کو مولوی امین الدین خاں کی ملاقات کو جاتا تھا۔ باقی ایام اپنے نماز و وظائف میں گذارتا تھا۔ اکثر اہلِ دہلی ملاقات کو آجایا کرتے تھے۔ ان میں پیر جی امداد علی ایک ذی علم درویش منش کسی دفتر میں ملازم تھے کبھی کبھی آکر مثنوی شریف سنایا کرتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے مجھ کو اپنے ساتھ فقرا کی ملاقات کو لے جایا کرتے تھے۔ قدیم کہاوت ہے کہ مسافر جس شہر میں وارد ہو وہاں کے کوتوال اور حکیم سے راہ و رسم پیدا کرے چنانچہ میں اس محلہ مستعد پورہ[1] کے امین کوتوالی سے اکثر سہ پہر کو ملا کرتا تھا۔ یہ صاحب امیرزادہ خوش فراج رنگین طبع تھے۔ اپنی رنڈی کو گھوڑے کی سواری سکھائی تھی۔ جوان عورت تھی مگر کالی کلوٹی بینگن لوٹی تھی۔ اسی طرح حضرت عمر علی شاہؒ صاحب کی خدمت میں بھی پہونچا کرتا تھا۔ تقریب ملاقات یہ ہوئی کہ میں ایک شب کو کوئی دو تین بجے مکان سے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا وہ شب شب باہ تھی "سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار" اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک شخص بہت سی بطخیں آگے آگے ہنکاتا ہوا پرانے پل کی طرف جا رہا ہے۔

---

[1] حضرت شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ جس وقت میں پیدا ہوا موجود تھے اور انہوں نے میرا نام ذوالقدر رکھا تھا۔ مزار محلہ مستعد پورہ میں حضرت ہی کے مکان مسکونہ میں ہے ترک تھے اور اپنی نسل پر فخر فرماتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎ نسبم اشرف خیل اتراک ؛ جسم انجب ایلات تتر (ذوالقدر جنگ)

صبح کو بعد دریافت معلوم ہوا کہ یہ بزرگ اس محلہ کے واسطے فرشتۂ رحمت ہیں۔ ہر ڈھیڑ چمار تک ان کو علاج کے واسطے پکڑ لے جاتا ہے۔ اور ہر شخص کی شادی غمی میں شریک حال ہوتے ہیں۔ میں بھی بکمال اشتیاق ان سے ملنے گیا۔ مختصر کچا کوٹھا یعنی کھپریل کا مکان دری یا چاندنی بوریئے کے عوض صرف ندی کا ریت بچھا ہوا خود بدولت دیوار سے تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ نہایت قوی الاعضا ریش دراز یہ معلوم ہوتا تھا کہ سمرقند بخارا سے کوئی شخص رستم تواں تازہ وارد بیٹھا ہوا ہے۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ عربی فارسی اور شاید ترکی زبان کے بھی عالم ہیں۔ فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، حکمت، سب علوم قدیمہ گھونٹے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ہیئت و ہندسہ و تاریخ و جغرافیہ میں بھی معلومات وسیع رکھتے تھے۔ سن شریف ساٹھ کے اوپر معلوم ہوتا تھا۔ مریدین بہ کثرت تھے مگر کسی سے نذر قبول نہ کرتے تھے لوگوں کو حیرت تھی کہ روزانہ کا خرچ کیونکر چلتا ہے۔ میں نے ان سے علم اشتقاق حاصل کیا اس کے اصول کمپیریٹو فلالوجی (Comparative - Philology) سے بالکل جدا اور وسیع تر ہیں۔ حیات الحیوان ایک کتاب ادب عربی کی جس میں اکثر علوم کی بحث بہت لطف کے ساتھ کی گئی ہے میں نے اُن سے پڑھی۔ بے طمع ایسے تھے کہ حضرت افضل الدولہ کے عہد سلطنت میں جھوٹے سچے فقرا و مشائخ مالدار اور جاگیردار ہو گئے مگر انہوں نے بلدہ کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ کسی امیر یا دولت مند یا خوش باش آدمی کے گھر پر نہ جاتے تھے۔ مگر بچند شرائط نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم۔ حضرت افضل الدولہ کی ایک خواص آپ کی مرید کسی مرض صعب میں مبتلا ہوئی۔ اس شرط پر علاج کے واسطے راضی ہوئے کہ جب وہ محل مبارک میں جائیں کوئی فعل خلاف شرع و سنت سنیہ ان کی موجودگی میں نہ صادر ہونے پائے۔ اتفاقاً خود حضور پر نور مشتاقِ ملاقات محل مبارک

ہیں چلے آئے۔ شاہ صاحب تعظیم کے واسطے کھڑے ہوگئے اور السّلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے اور
کہا کہ آپ اس مختصر ریاست میں بجائے امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین ہیں آپ کی تعظیم
مجھ پر فرض تھی۔ اس سے زائد آپ کے حالات مستحق تعظیم نہیں ہیں" یہ کہکر وہاں سے اُٹھ کھڑے
ہوئے۔ ہر چند حضور پُر نور نے ان کو روکا مگر یہ لکڑی ٹیکتے ہوئے ایسے تیز چلے کہ گھر پر آکر
دم لیا۔ وزارت پناہ نے باوجودیکہ مذہب امامیہ رکھتے تھے ان سے ملاقات کرنی چاہی
مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ فرماتے تھے کہ "یہ وزیر محنتی جفاکش اور خیر خواہ رئیس
و ریاست بیشک ہے مگر "رافضی" ہے اور اصول حکومت اسلامیہ سے بالکل ناواقف ہی
اور اپنے عہد میں ایک انقلاب عظیم پر غلط کی بنیاد ڈال رہا ہی" ایک دفعہ سواری مبارک
سرورنگر[1] میں رونق افروز تھی۔ شاہ صاحب مجھ سے ملنے کو پاپیادہ مستعد پورہ سے چلے
آئے۔ سہ پہر کو میں نواب وزارت پناہ سے ملنے گیا۔ اتفاقاً شاہ صاحب کا بھی ذکر اثنائے
گفتگو میں آگیا کمال حیرت سے فرمایا کہ وہ تو کسی کے گھر پر نہیں آیا کرتے ہیں میں نے عرض
کیا کہ میرے حال پر کمال عنایت درویشانہ مبذول ہے۔ ذوالقدر کی شب ولادت
کو میرے مکان میں تشریف فرما تھے اور نام بھی انہیں نے رکھا ہی چونکہ میں ان کا شاگرد

---

[1] یہ مقام قدیم مستحکم فصیل کے اندر بلدۂ حیدرآباد سے چھ سات میل کے فاصلہ پر بجانب شرق واقع ہی۔ اس کے باہر اطراف میں دور دور تک شاہی شکارگاہ ہی جس میں ہرن و چیتل بہ کثرت ہیں۔ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں اکثر سرورنگر میں بغرض سیر و شکار قیام فرمایا کرتے تھے۔ اس ہی واسطے سالارجنگ اول نے والد ماجد سے کہا تھا وہ مکان محلہ جنجل گڑہ میں بنائیں۔ یہ محلہ پرانی حویلی سے کوئی تین میل اور شہر اور سرورنگر کے بیچ میں واقع ہی جنجل گڑہ سب مہدوی پٹھانوں سے آباد تھا اور نامی جمعدار مثل دولہ خاں اور جنید خاں ہمارے ہم سایہ تھے۔ ہر جمعدار کے پاس خاص اُس کی سواری کے دو دو سو گھوڑا عربی۔ وہبر اور دیسی تھا۔ چابکسوار روزانہ صبح کو گھوڑے پھیری کے لئے لیکر نکلتے تھے میں نے انہی گھوڑوں پر سواری سیکھی تھی۔ سرورنگر ایک مسماۃ سرور بیگم کے نام سے موسوم ہے ان کی قبر بھی قریب آصف نگر ارسطوجاہ کے مقبرہ میں ہی۔ (ذوالقدر جنگ)

بھی ہوں ہفتہ عشرہ میں یا وہ میرے پاس تکلیف فرماتے ہیں یا میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اور محفل سماع میں تو میری غیر حاضری معاف نہیں ہے۔ وزارت پناہ نے فرمایا کہ شاہ صاحب نہایت ذی وقعت عہدہ دار انگریزی فوج میں تھے۔ ملازمت ترک کردی۔ مال اسباب گھوڑے وغیرہ کل سامان معاشرت سے دست بردار ہو کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ مجھ سے نہایت ناراض ہیں تم سے اگر راہ ورسم ومحبت ہے تو میری ملاقات ان سے کرا دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان کو اپنے ساتھ لے آتا ہوں نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ وہ ہرگز نہ آئیں گے۔ صرف ایک تدبیر ہے۔ میں ہوا خوری کو ہر صبح باہر جایا کرتا ہوں۔ تمہارے خیمہ پر یکایک آ جاؤں گا ان کو گریز کا موقع نہ ملے گا بشرطیکہ تم ان سے نہ کہدو۔ الغرض میں فرودگاہ پر آکر متردد ہوا بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ نواب صاحب کی ناراضگی کی اصلاح کرنی ممکن ہے۔ مگر شاہ صاحب کی خفگی لاعلاج ہے۔ میں نے ان سے سب حال کہدیا شاہ صاحب نہایت برہم ہوئے اور کہا کہ "میں اس رافضی بدعتی سے ہرگز نہ ملوں گا" اور اپنا عصائے پیری لیکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا بہت اچھا آپ جائیے میں بھی ملازمت سے دست بردار ہوتا ہوں۔ اس واسطے کہ نواب صاحب کے خلافِ حکم میں نے آپ سے سب کچھ کہدیا۔ اب مجھ کو مونھ دکھانے کو جگہ نہ رہی آپ کی دعا نے مجھ کو یہ سب فائدہ پہونچایا اب آپ ہی بے روزگار کیجئے۔ یہ سن کر شاہ صاحب بیٹھ گئے اور کہا "قہر درویش بجانِ درویش"۔ میں ایک آزاد لنگوٹی بند آدمی سوائے انتظار "حتیٰ یاتیک الیقین" اور کوئی کام نہیں بقول مرزا غالب ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

معلوم نہیں ملاقات میں میں کیا کہہ بیٹھوں"۔ میں نے کہا کہ آپ مزاج قابو میں رکھئے اور صرف ملاقات کر لیجئے۔ صبح کو بعد نماز میں نے خیمہ کے باہر کرسیاں بچھوائیں اور خود دستار پہن کر کمر بستہ منتظر نواب صاحب کھڑا رہا۔ اتنے میں شاہ صاحب لکڑی ٹیکتے ہوئے خیمہ کے باہر آئے اور فرمایا میں اس باغ تک ہوا خوری کر لوں۔ باغ میرے خیمہ کے روبرو تھا اور شاید سیدا[1] باغ نام تھا۔ ہر طرف بلند دیواریں صرف ایک دروازہ آمد و رفت کا تھا۔ میرے سامنے شاہ صاحب باغ کے اندر داخل ہوئے اتنے میں نواب صاحب اسپ دواں تشریف لائے۔ میں نے نذر پیش کی فرمایا نذر تو میں قبول کرتا ہوں۔ شاہ صاحب کہاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی وہ اس باغ میں گئے ہیں میں بلوائے لیتا ہوں۔ فرمایا شاید تم نے ان کو اطلاع کر دی وہ ہوا ہو گئے۔ یہ فرما کر اپنی فرودگاہ پر تشریف لے گئے۔ میں نے ہر چند باغ میں تلاش کرایا ان کا پتہ نہ لگا۔ معلوم نہیں کس طرح باغ سے نکل کر وہ سیدھے چنچل گوڑہ میرے مکان پر پہونچ گئے۔

جب شہر کے اندر جاتا تھا تو ایک اور بزرگ سے ملاقات ہوتی پیر جی امداد علی ان کے از حد معتقد تھے۔ ان کا نام نامی مرزا سردار[2] بیگ تھا کبیر السن صرف پوست و استخواں اور بوجہ ریاضت شاقہ نہایت زرد رنگ دبلا چہرہ دراز قد کھادی کی کمری کھادی کی تہمد اور کھادی کی ٹوپی پہنے رہتے تھے۔ ذریعۂ معاش قرآن مجید کی جلد سازی بنا رکھا تھا۔ ان کے بھائی مرزا شہسوار بیگ ایک متمول صاحب جمعیت قدیم خاندان کے امیر تھے۔ شاہ صاحب نے اپنا کل حصہ ان کے نذر کر کے درویشی اختیار کی تھی۔ کسی امیر رئیس کو پاس

---

[1] یہ باغ حضوری ہے اور سرور نگر کی سڑک کے قریب واقع ہے جانب جنوب سڑک کے۔ جانب شمال فرانسیسی جنرل ریمانڈ کی قبر ایک بلند ٹیلہ پر واقع ہے۔ قبر کے محاذی آسمان گڑھ تعمیر کردہ نواب آسمان جاہ ہے۔

[2] گنبد اور مزار قریب محلہ نامپلی واقع ہے۔

نہ آنے دیتے تھے۔ مرید بھی کم کرتے تھے۔ عمر علی شاہ صاحب سے گہری چھنا کرتی تھی۔ روز سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ میرے پیر مرشد حضرت سید محمد بادشاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ تعالے علیہ[1] اس وقت ناظم عدالتِ فوجداری تھے۔ مگر بعد وقتِ عدالت تمام وقت اپنا غالبچہ والے مجذوب صاحب کی خدمت میں صرف کرتے تھے اور دائم الصوم و قایم اللیل تھے۔

اثنائے امیدواری میں ایک خط سید حسین صاحب بلگرامی کا میرے نام آیا کہ ضاقت علی الارض جس طرح ہوسکے مجھ کو حیدرآباد بلوالو اس زمانہ میں مسلمان ڈگری یافتہ لکھنؤ و دلی سے لیکر پنجاب تک تو شاید کوئی تھا نہیں۔ بنگالہ میں اگر تھے بھی تو دو تین ہی ہونگے علاوہ اس کے سید موصوف انگریزی عبارت آرائی میں کسی بنگالی سند یافتہ سے کم نہ تھے۔ بس ان کا وجود نہایت مغتنم سمجھا جاتا تھا اور اسی وجہ سے انگریزی حکّام بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ جوانی میں بہت آزاد خیال تھے لیاقت کی غیوری اس قدر تھی کہ انگریزی حکّام سے ملاقات بھی نہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ صاحب بہادر کو اطلاع ہونے تک باہر برآمدے میں چپراسیوں کے پاس بہت دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا اور اس کو سید صاحب گوارا نہ کرسکتے تھے۔ ہندوستان اور بنگالہ میں انگریزی مدارس کی آزادانہ تعلیم کا نتیجہ شروع ہوگیا تھا اور انگریزی حکّام کی تحکمانہ روش پر چند دیسی اخبار مثل ہندو پیٹریٹ وغیرہ نے زبان درازی شروع کردی تھی۔ سید صاحب بھی اُن اخباروں کے شریک رائے ہوگئے اور اودھ کے حکّام پر اپنی شوخ عبارت سے نوک جھونک

---

[1] حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ نے بالآخر ترک ملازمت کرکے مسجد اوجالہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ نواب وزارت پناہ نے چاہا کہ ان کی تنخواہ شش صد روپیہ حالت گوشہ نشینی میں جاری رکھیں مگر حضرت نے نامنظور فرمائی اس عذر سے کہ اجرت بلا خدمت ناجائز ہے ذوالقدر جنگ بھی حضرت کا مرید ہے۔ مزار درگاہ اوجالہ شاہ صاحب کے جانب شرق واقع ہے۔

شروع کردی۔ اس وقت کے حاکم اودھ یعنی چیف کمشنر سر جارج کوپر تھے۔ وہ ان کی شوخ عبارت کو برداشت نہ کرسکے اور اودھ سید صاحب کے واسطے تنگ ہوگیا۔ یعنی حکام انگریز ان کی تنبیہ پر آمادہ ہوگئے۔ بس اودھ سے ان پر ہجرت کرنی لازم ہوگئی۔ اس پریشانی میں انہوں نے مجھ کو خط لکھا۔ میں صاحب معروضہ نہ تھا۔ مگر جرأت کرکے سر دربار میں نے وہ خط وزارت پناہ کے ملاحظہ میں پیش کردیا۔ وہ اس کو پڑھ کر اُس وقت یہ کہکر کہ وہ چلے آئیں خاموش ہوگئے۔ مگر بالآخر نتیجہ اچھا نکلا یعنی میں نے وہ خط مولوی امین الدین خاں کو دکھایا۔ مولوی امین الدین خاں اپنے ماموں مولوی عنایت الرحمٰن خاں دہلوی سے ناراض ہوچکے تھے۔ اس وقت چند مدراسی انگریزی داں نہایت معمولی لیاقت کے دفاتر انگریزی میں نقل نویس یا مترجم ملازم تھے۔ جس طرح گاؤں میں اونٹ آیا لوگ سمجھے پرمیشر آیا۔ مولوی صاحب یعنی مولوی عنایت الرحمٰن خاں انگریزی عالم سمجھے جاتے تھے اور بسفارش اپنے بھانجے مولوی امین الدین خاں ناظم سررشتۂ تعلیمات مقرر ہوئے تھے۔ الغرض مولوی امین الدین خاں نے مجھ سے پوچھا کہ سید حسین صاحب مثل عنایت الرحمٰن خاں مجھ سے بغاوت تو نہ کریں گے[1] اور میری اطمینان دہی کو باور کرکے کہا کہ سید صاحب مجھے ایک خط لکھ بھیجیں ایک رسالہ عربی میں بفوائی سورۃ الرحمٰن مولوی صاحب نے مسئلہ شہادت پر لکھا تھا۔ اور مجھ کو بھی ایک نسخہ اُس کا بطلب داد دیا تھا۔ میں نے وہ رسالہ بھی سید صاحب کو بھیج دیا اور عربی خط کا تقاضا کیا۔ چند روز بعد سید صاحب کا بھی مقفّٰی عربی خط بنام مولوی صاحب آیا وہ خط مولوی صاحب نے نواب صاحب کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ ارشاد ہوا کہ میں نے آغا مرزا بیگ سے کہدیا تھا کہ چلے آئیں اور حالات یہاں کے دیکھیں وہی تین سو روپیہ

---

[1] یہ اندیشہ اُن کا امر واقعی نکلا اور وہ اس وجہ سے مجھ سے مدت العمر ناراض رہے۔

فی الحال دئیے جائیں گے۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔ ادھر سر جارج کو پرنے پورا سامان ان کی
سزا کا کر لیا تھا کہ وہ پریشان ہو کر لکھنؤ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بلدہ سے جو مکان پر
واپس آیا تو دیکھا سید صاحب میری چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً مولوی
امین الدین خاں کو اطلاع دی انہوں نے ان کو اپنے مکان پر بلا لیا۔ اور ایک کمرے
میں ٹھہرا دیا۔ اور دوسرے روز اپنے ساتھ نواب صاحب کے پاس لے گئے۔ وزیر
وسیع الاخلاق اور سید صاحب ذی علم اور بیباک بہت دیر تک باریابی رہی اور لنگر بارہ
دری میں ان کو رہنے کا حکم ہوا اور دونوں وقت کا کھانا باورچی خانۂ عامرہ سے مقرر کر دیا
گیا اور حکم ہوا کہ تا وقتیکہ تم اپنا مکان لو اور کھانے کا علیحدہ انتظام کرو تین سو روپیہ ماہوار تم کو
ملیں گے۔ بعدہٗ چار سو کر دئیے جائیں گے۔ اور خدمت یہ سپرد ہوئی کہ میرے عہد حکومت کی
تاریخ زبان فارسی میں تحریر کرو اور تاریخ وصّاف بطور نمونہ ان کو دی گئی کہ یہ طرز اختیار
کرو۔ سید صاحب نے فارسی کبھی نہ لکھی تھی تاریخ وصّاف، درّۂ نادرہ سے بھی زیادہ
بلیغ تھی کہ بغیر امداد قاموس ایک سطر بھی اس کی لکھنی محال تھی سید صاحب چہ کنم میں پڑ گئے
اتفاقاً ایک ذی علم منشی معتوب دربار ان سے ملنے کو آئے اور ایک دو ورق دیباچۂ
کتاب ان کو لکھ کر دئیے۔ یہ وہی دو ورق نواب صاحب کے پاس لے گئے بقول شخصے

یہ میں نے مانا کہ میرا نامہ دیا بھی قاصد نے دے کے دھوکا
وہ خط نہ پہچان لیں گے میرا مری عبارت نہ دیکھ لیں گے

نواب صاحب فوراً تاڑ گئے اور حکم دیا کہ اس شخص کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ اور تاریخ نویسی

لہ یہ شخص شاید کسی اردو اخبار کا نامہ نویس تھا وزارت پناہ اخبارات سے نفرت رکھتے تھے اس واسطے کہ بیشتر ان
میں سے طمع ناجائز سے پیٹ بھرتے تھے البتہ انگریزی معتبر اخبار بالخصوص انگلینڈ کے مطبوعہ مسٹر بوئن خلاصہ کر کے
پیش کرتا تھا یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ کوئی اخبار بلدہ یا ریزیڈنسی میں جاری نہ ہونے پاتا تھا (باقی نوٹ صفحہ آئندہ)

موقوف کرکے ان کو مسٹر لوٹن معتمد خانگی کے نیابت میں بماہوار چہار صد روپیہ مقرر کردیا یہاں یہ اپنی حسن لیاقت سے مچھلی کی طرح تیر گئے اور ان کا رنگ ایسا جما کہ بہ شراکت کپتان جان کلارک، حضور پرنور کی تعلیم انگریزی کے واسطے نامزد ہوگئے۔ گو بوجوہ چند نواب امیر کبیر عمدۃ الملک نے ان کا تقرر نا منظور فرمایا اور یہ اس عزت سے محروم رہے۔

سید صاحب کے آنے سے کچھ عرصہ قبل دفتر معتمدی عدالت سے میرے پاس روبکار آیا کہ تم دفتر تنقیح حسابات سررشتہ تعمیرات عامہ میں مقرر کئے گئے ہو[1] لہذا بہ تعمیل حکم نواب قدیر جنگ کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس دفتر میں بصیغۂ انگریزی ایک نیم یوروپین مسٹر گرے نامی اور بصیغۂ فارسی مولوی ہدایت اللہ خاں دہلوی پیش دست تھے اور دونوں مہتمم کہلاتے تھے۔ مولوی ہدایت اللہ خاں مرحوم میرے ننہیال کے رشتہ دار تھے مگر مجھ کو اس کا علم نہ تھا۔ یہ دونوں مہتمم میرے حال پر بہت مہربان ہوگئے۔ مگر مجھ کو حساب کتاب سے کوئی مناسبت نہ تھی اور نہ فارسی رقوم وغیرہ سے واقف تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ ملازمت کی شدید ضرورت تھی اور حکم وزارت پناہ کا سمجھا تھا۔ اس خدمت کو مجبوراً قبول کرلیا۔ مگر بعد دریافت معلوم ہوا کہ نواب صاحب کو اس کی اطلاع بھی نہ تھی۔ اور مولوی ہدایت اللہ خاں نے باشارۂ مولوی امین الدین خاں میرے واسطے یہ جگہ نکالی تھی۔ اس عرصہ میں ایک خط جنرل بیرو کا اسکاٹ لینڈ سے میرے پاس پہونچا۔ یہ نواب صاحب کے نام تھا اور

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اور اہل بلدہ کیا امیر کیا غریب وکیا ملازمین عہدہ دار اخبار کے نام سے بھی ناواقف تھے بعد انتقال وزارت پناہ چند قلم فروش مفلس انگریز جمع ہوگئے اور مولوی مہدی علی صاحب وغیرہ اہل ہندوستان شمالی نے ان کو ذریعہ اپنی کامیابی کا بنا لیا اور مہاراجہ نریندر پرشاد کے لئے آرٹیکل انگریزی اخباروں میں نکلنے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت سے جاری رہا اور منجملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ بھی باعث بدنامی حیدرآباد بالزام ہاٹ بیڈ آف انٹریگ (Hot bed of Intrigue) ہوگیا۔

[1] تاریخ تقرر ۱۵ دسمبر ۱۸۶۳ء ۱۲

اس میں میری سفارش لکھی ہوئی تھی کہ میں مترجم اچھا ہوں۔ سید حسین صاحب نے میری عام لیاقت اور اُردو انگریزی کی عبارت آرائی کی از حد تعریف کی اور اب دربار میں بھی نواب صاحب میری طرف زیادہ مخاطب ہونے لگے اور اس قدر مہربان ہوئے کہ میری خاطر سے ایک قدیم درباری کا دربار بند کر دیا۔ وجہ یہ تھی اس بدقسمت درباری نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک لڑکی خوبصورت خوش طبع نوجوان مجھ کو لکھنؤ سے منگوا دو اگر پسند آئے گی تو رکھونگا ورنہ واپس کردونگا۔ اس کا ذکر سید حسین صاحب نے نواب صاحب سے کر دیا۔ الغرض میں نے دو تین ماہ اس دفتر میں کام کیا ہی تھا کہ ایک روز ایک رُوبکار دفتر مالگذاری سے آیا کہ تم فلاں تاریخ نئے مکان میں حاضر ہو کر مسٹر اوکانر (O.conner) کے ساتھ کام کرو۔ یہ صاحب تازہ ولایت وزارت پناہ کے فرزندان با اقبال کی تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے تھے اور ان کی مدد کے واسطے ایک بنگالی مسلمان سن رسیدہ ملازم تھے وہ اپنی خانگی مصیبت میں مبتلا ہو گئے لہذا ان ہونہار بچوں کی تعلیم میرے سپرد ہو گئی اور یہاں پر میری مدرسہ و کالج کی پڑھائی کچھ کام نہ آئی[1]۔ بلکہ میری عام کتاب بینی نے میری پوری مدد دی۔ اوکانر اول تو اُردو سے ناواقف دوم تمام وقت اپنی جمیلہ بی بی کی خاطرداری میں گذارتے تھے۔ کل تعلیم مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ اس وقت معدودے چند طلبہ مدرسہ میں تھے۔ لائق علی خاں اور ان کے چھوٹے بھائی سعادت علی خاں ہر دو فرزندان نواب صاحب و سرفراز حسین خاں برادر نسبتی وزارت پناہ و میر داور علی خواہرزادہ نواب صاحب و برادر خرد حکیم باقر علی خاں و فرزندان داروغہ عبدالوہاب یہ دونوں سن رسیدہ شاید پچیس[۲۵] تیس[۳۰] برس

---

[1] اس وقت تک کہ قریب اسی برس کی میری عمر ہے کالج کی تعلیم ادبیات و ریاضیات وغیرہ کوئی کام نہیں آئی صرف شوق کتاب بینی کی وجہ ہے کہ کچھ کچھ عربی فارسی انگریزی لکھ پڑھ سکتا ہوں اور یہی بڑے بڑے امور پیش ہونے کے وقت میرا مشکل کشا رہا۔

کی عمر کے تھے اور فرزند مقدم جنگ بنام محمد سلیمان یار جنگ شاید عمر بست سال اور ایک پٹھانوں کے جمعدار کا فرزند شاید سبحان خاں نامی اور دو برادر جو بڑے آغا اور چھوٹے آغا مشہور تھے اور شاید راجہ کشن پرشاد وغیرہم ایک یا دو طالب علم دیگر جن کا نام یاد نہیں رہا فقط یہی چند طلبہ اس مدرسہ میں شریک تھے لایق علی خاں و سعادت علی خاں بڑے و چھوٹے صاحب کہلاتے تھے لمبے لمبے بالوں کی چوٹیاں گندھی ہوئیں تا بہ کمر۔ زرّیں ٹوپیاں برسر۔ دکھنی انگرکھے دربر۔ بڑے صاحب گندم رنگ بحیم شحیم۔ چھوٹے صاحب اسی قدر دُبلے سوکھے سیاہ رنگ۔ اسی طرح جسقدر بڑے صاحب ذکی اور قوی الذہن اور بلند ہمت تھے اُسی قدر چھوٹے صاحب غبی اور ضعیف الذہن اور کم ہمت تھے۔ میر داور علی ذہن و یادداشت میں بڑے صاحب سے کم مگر اور سب سے زیادہ۔ باقی دیگر طلبہ معمولی ذہن اور معمولی شوق کے تھے۔ مسٹر اوکانر صرف برادر باقر علی خاں و فرزند عبد الوہاب کو پڑھاتے تھے۔ دیگر طلبہ میری سپرد تھے۔ ایک روز مسٹر اوکانر اپنے شاگردوں کو میرے سپرد کر کے خود چلے گئے۔ چونکہ یہ دونوں صاحب پختہ فہم اور سن رسیدہ تھے اور مسٹر اوکانر کی فہمائش سے ان کی تشفّی نہ ہوتی تھی اس دن کے سبق میں کچھ ذکر پیغمبران بنی اسرائیل کا تھا۔ میں نے ان کے عربی نام ان کو بتائے اور مختصر حالات ان کے بیان کئے اور اندلس کے ابتدائی حالات بھی سنائے۔ وہ مجھ کو نہایت ہی ذی علم اور وسیع المعلومات سمجھے اور میرے تبحر کی بڑی تعریف نواب صاحب سے کرتے رہے۔ ادھر ہر دو فرزندان وزارت پناہ اور میر سرفراز حسین و میر داور علی اور آغا وغیرہم کو میں نے سخت پکڑا اور باقاعدہ صرف نحو و جغرافیہ و ابتدائی حساب کی تعلیم شروع کردی اور روزانہ رپورٹ انگریزی میں نواب صاحب کے ملاحظہ میں بھیجتا رہا۔ جب

اس میں میری سفارش لکھی ہوئی تھی کہ میں مترجم اچھا ہوں۔ سید حسین صاحب نے میری عام لیاقت اور اردو و انگریزی کی عبارت آرائی کی از حد تعریف کی اور اب دربار میں بھی نواب صاحب میری طرف زیادہ مخاطب ہونے لگے اور اس قدر مہربان ہوئے کہ میری خاطر سے ایک قدیم درباری کا دربار بند کر دیا۔ وجہ یہ تھی اس بدقسمت درباری نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک لڑکی خوبصورت خوش طبع نوجوان مجھ کو لکھنؤ سے منگوا دو اگر پسند آئے گی تو رکھونگا ورنہ واپس کر دونگا۔ اس کا ذکر سید حسین صاحب نے نواب صاحب سے کر دیا۔ الغرض میں نے دو تین ماہ اس دفتر میں کام کیا ہی تھا کہ ایک روز ایک رُوبکار دفتر مالگذاری سے آیا کہ تم فلاں تاریخ نئے مکان میں حاضر ہو کر مسٹر اوکانز (Oconner) کے ساتھ کام کرو۔ یہ صاحب تازہ ولایت وزارت پناہ کے فرزندان با اقبال کی تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے تھے اور ان کی مدد کے واسطے ایک بنگالی مسلمان سن رسیدہ ملازم تھے وہ اپنی خانگی مصیبت میں مبتلا ہو گئے لہذا ان ہونہار بچوں کی تعلیم میرے سپرد ہو گئی اور یہاں پر میری مدرسہ و کالج کی پڑھائی کچھ کام نہ آئی[1]۔ بلکہ میری عام کتاب بینی نے میری پوری مدد دی۔ اوکانر اول تو اردو سے ناواقف دوم تمام وقت اپنی جمیلہ بی بی کی خاطرداری میں گذارتے تھے۔ کل تعلیم مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ اس وقت معدودے چند طلبہ مدرسہ میں تھے۔ لائق علی خاں اور ان کے چھوٹے بھائی سعادت علی خاں ہر دو فرزندان نواب صاحب و سرفراز حسین خاں برادر نسبتی وزارت پناہ و میر داور علی خواہرزادہ نواب صاحب و برادر خرد حکیم باقر علی خاں و فرزندان داروغہ عبدالوہاب یہ دونوں سن رسیدہ شاید ۲۵ پچیس ۳۰ تیس برس

[1] اس وقت تک کہ قریب اسی برس کی میری عمر ہے کالج کی تعلیم ادبیات و ریاضیات وغیرہ کوئی کام نہیں آئی صرف شوق کتاب بینی کی وجہ ہے کہ کچھ کج مج عربی فارسی انگریزی لکھ پڑھ سکتا ہوں اور یہی بڑے بڑے امور پیش ہونے کے وقت میرا مشکل کشا رہا۔

کی عمر کے تھے اور فرزند مقدم جنگ بنام محمدؐ و سلیمان یار جنگ شاید عمر بست سال اور ایک پٹھانوں کے جمعدار کا فرزند شاید سبحان خاں نامی اور دو برادر چھوٹے آغا اور چھوٹے آغا مشہور تھے اور شاید راجہ کشن پرشاد وغیرہم ایک یا دو طالب علم دیگر جن کا نام یاد نہیں رہا فقط یہی چند طلبہ اس مدرسہ میں شریک تھے لایق علی خاں و سعادت علی خاں بڑے و چھوٹے صاحب کہلاتے تھے لمبے لمبے بالوں کی چوٹیاں گندھی ہوئیں تا بہ کمر۔ زرّیں ٹوپیاں برسر۔ دکھنی انگرکھے دربر۔ بڑے صاحب گندم رنگ بجسم شحیم۔ چھوٹے صاحب اسی قدر دُبلے سوکھے سیاہ رنگ۔ اسی طرح جسقدر بڑے صاحب ذکی اور قوی الذہن اور بلند ہمت تھے اُسی قدر چھوٹے صاحب غبی اور ضعیف الذہن اور کم ہمت تھے۔ میر داور علی ذہن و یادداشت میں بڑے صاحب سے کم مگر اور سب سے زیادہ۔ باقی دیگر طلبہ معمولی ذہن اور معمولی شوق کے تھے۔ مسٹر اوکانر صرف برادر باقر علی خاں و فرزند عبدالوہاب کو پڑھاتے تھے۔ دیگر طلبہ میری سپرد تھے۔ ایک روز مسٹر اوکانر اپنے شاگردوں کو میرے سپرد کر کے خود چلے گئے۔ چونکہ یہ دونوں صاحب پختہ فہم اور سن رسیدہ تھے اور مسٹر اوکانر کی فہمائش سے ان کی تشفی نہ ہوتی تھی اس دن کے سبق میں کچھ ذکر پیغمبران بنی اسرائیل کا تھا۔ میں نے ان کے عربی نام ان کو بتائے اور مختصر حالات ان کے بیان کئے اور اندلس کے ابتدائی حالات بھی سنائے۔ وہ مجھ کو نہایت ہی ذی علم اور وسیع المعلومات سمجھے اور میرے تبحر کی بڑی تعریف نواب صاحب سے کرتے رہے۔ اور ہر دو فرزندان وزارت پناہ اور میر سرفراز حسین و میر داور علی اور آغا وغیرہم کو میں نے سخت پکڑا اور باقاعدہ صرف نحو و جغرافیہ و ابتدائی حساب کی تعلیم شروع کر دی اور روزانہ رپورٹ انگریزی میں نواب صاحب کے ملاحظہ میں بھیجتا رہا۔ جب

لارڈ نیپیر آف میگڈالا[۵۱] وزیر اعظم سے ملنے آئے تو وہ مدرسہ میں بھی آئے اور نقشہ میں چند مقامات جغرافیہ کے پوچھے اور طلبہ کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اب میری بہتری خوب جم گئی۔ ایک واقعہ اور یہ ہوا کہ ایک روز فرزندانِ نواب صاحب وغیرہ آپس میں مشورہ کرکے سبق کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور باوجود میری تاکید کے وقتِ درس بیکار ختم کردیا۔ اس عرصہ میں ماما محل سے آئی کہ سرکار خاصہ پر ہیں صاحبزادوں کو جلد بھیجو۔ میں نے صاف انکار کردیا۔ اور اس نے وہی میرے الفاظ نواب صاحب سے عرض کردئے اس کا اثر سب سے زیادہ نواب صاحب پر ہوا۔ خلاصہ اینکہ میں اپنی لیاقت میں بے نظیر قرار پاگیا۔ مسٹر اوکانر چلے گئے اور مسٹر کرون نے آکر اوقات بازی بھی مقرر کئے۔ بچپن میں میں بڑا کھلنڈرا سب دیسی انگریزی کھیلوں میں مشّاق تھا۔ اس وجہ سے مسٹر کرون سے بھی میری گہری چھننے لگی۔ باورچی خانہ وزارت سے میرے واسطے بالخصوص خوان نعمت مقرر ہوگیا۔ صبح کو چائے پانی دوپہر کا کھانا سہ پہر کی میوہ خوری معہ چائے پانی کا حکم جاری ہوگیا وزارت پناہ بھی مجھ کو قدردانی ولطف مہربانی سے دیکھنے لگے۔ اور طلبہ کی یہ حالت تھی کہ باوجود میری سخت گیری کے حضرت حضرت کہکر لپٹے رہتے تھے۔ اس وقت حضرت بندگان عالی میر محبوب[۵۲] علی خاں جنت آرام گاہ کی بسم اللہ[۵۳] خوانی اور درس قرآن[۵۴] مجید شروع ہوگیا۔ مولوی محمد زمان خاں ایک نہایت ذی علم تارک الدنیا آزاد منش صوفی صافی مشرب

---

۵۱ یہ واقعہ ۱۸۶۴ء کا ہے۔

۵۲ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بتاریخ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ تولد ہوئے۔ اعلیٰ حضرت افضل الدولہ کا انتقال ۱۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ کو ہوا اس وقت حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں کی عمر دو سال چھ ماہ کی تھی لیکن حضرت افضل الدولہ کے انتقال کے چوتھے روز امرا سلطنت اور مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ نے حضور پرنور کو بتاریخ ۱۶ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مسند حکومت پر بٹھایا۔

۵۳ ۱۰ شعبان ۱۲۸۶ھ۔ ۵۴ ۷ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ

درس پر مقرر ہوئے۔ بہت متّقی اور پرہیز گار متواضع منکسر مزاج عالی ہمت اور مرد میدان تھے۔ وزارت پناہ اور نواب امیر کبیر سے درویشانہ آزادی سے ملتے تھے۔ الغرض چند ماہ میں یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ اس ہی عرصہ میں میں رخصت لیکر دلّی گیا اور متاہل ہو کر جب واپس آیا تو سُنا کہ حضرت بندگان عالی جنت آرام گاہ کا انگریزی درس بھی شروع ہونے والا ہے[1] اور سید حسین صاحب بلگرامی اس خدمت پر مقرر کئے گئے ہیں۔ سید صاحب نے بھی جامہ وغیرہ وغیرہ لباس درباری طیار کر لیا اور حکم آخر کے منتظر رہے۔ مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ نے وزارت پناہ کو اطلاع دی کہ گورنمنٹ ایک انگریز کو اس خدمت پر مقرر کرے گی۔ اس کو ہر دو امرائے نامدار نواب وزارت پناہ اور نواب امیر کبیر نے نامنظور کیا اور کپتان جان کلارک[2] کو کہ ملکہ معظمہ کے دربار میں کسی معزز عہدہ پر تھے طلب کر لیا۔ محرم سے چند روز قبل کپتان صاحب حیدرآباد میں داخل ہوگئے بڑی ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ اور باد شاہی گھوڑے ران سواری کے اور گاڑیاں اور جوڑیاں ان کو دی گئیں۔ میں ایک روز کوئی نو دس بجے صبح کو مدرسہ میں طلبہ کو درس دے رہا تھا کہ ایک شاگرد پیشہ میرے پاس آیا اور کہا کہ چلئے وزارت پناہ نے یاد فرمایا ہے۔ میں معمولی لباس پہنے ہوئے صرف دستار پہنے درس میں مشغول تھا۔ شاگرد پیشہ کو جواب دیا کہ میری طرف سے تسلیم عرض کرو اور کہو کہ میں معمولی لباس پہنے ہوئے ہوں۔ اگر مہلت عطا ہو تو بعد ختم درس کمربستہ حاضر ہونگا۔ وہ شاگرد پیشہ حیرت سے میری

---

[1] ۲۶ جولائی ۱۸۷۴ء۔ [2] حضرت غفران مکان کی باقاعدہ تعلیم ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی۔ مگر تعلیم کا کل انتظام حضرت کی والدہ ماجدہ واحد النسا بیگم صاحبہ اور دادی صاحبہ کی منظوری پر منحصر تھا۔ نگرانی کپتان جان کلارک اور ان کی علیحدگی کے بعد ان کے بھائی کپتان کلاڈ کلارک کے سپرد تھی۔ دیگر تمام اساتذہ ان کے ماتحت تھے۔ جان کلارک رائفل بریگیڈ میں کپتان تھے بعدازاں بعہدہ کرنل ڈیوک آف اڈنبرا کے اکوری مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۵ء میں حیدرآباد آئے مگر اپنی بیوی کی انتقال کی وجہ سے انگلستان واپس گئے اور کلاڈ کلارک جن کے ایک پاؤں میں لنگ تھا ۱۸۷۶ء میں ان کی جگہ مامور ہوئے۔

طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے اس کی خاموشی اور حیرت کا سبب پوچھا۔ وہ بولا آپ کو کیا معلوم کس ضرورت کی وجہ سے یاد ہوئی ہے۔ حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ میں درس کو چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اُس نے مجھ کو گلیہاری میں بٹھا کر اطلاع کی۔ فوراً بلا لیا گیا۔ وزارت پناہ ایک کوچ سے تکیہ لگائے ہوئے بہت سے کاغذ چھاتی پر پنسل ہاتھ میں لیے رونق افروز تھے اور بستے کاغذات کے نیچے کوچ کے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کرسی پر مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ ہوا اور کاغذات الگ رکھکر میری طرف مخاطب ہوئے۔ پہلے اپنے صاحبزادوں کی بابت گفتگو شروع کی اس کے بعد ارشاد ہوا کہ کپتان جان کلارک آپ سے اُردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے ملئے اور اپنا وقت نکال کر ان کے پاس جاتے رہئے۔ مسٹر کروون[1] کو بھی کوئی عذر نہیں ہے میں نے حماقت سے دو عذر پیش کئے۔ ایک یہ کہ صاحبزادگان کے درس میں بہت خلل پڑے گا۔ دوم اینکہ بڈھوں کے پڑھانے کی میں لیاقت نہیں رکھتا۔ یہ سنکر نواب صاحب ہنس پڑے اور روئے سخن بدل کر فرمایا کہ آپ کا مذہب سنّی ہے اور آپ کے چچا شیعہ ہیں یہ کیا بات ہے۔ میں نے جواب دیا تمام خاندان میں صرف وہ ایک خواب کی وجہ سے شیعہ ہو گئے کہ ایک کٹا ہوا سر چھینکے پر رکھا ہوا یہ کہتا ہے کہ تم کو اہلِ بیت علیہم السّلام سے محبت رکھنی چاہئے۔ سالہا دراز کے بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو دیکھا کہ وہ سر ہم شکل مرزا دبیر تھا۔ پھر فرمایا کہ مرزا غالب بھی تو شیعہ تھے میں نے عرض کیا کہ نیم شیعہ تھے، محب اہلِ بیت تھے۔ مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ایک بند لفافہ مجھکو عطا کیا اور فرمایا کہ آپ سہ پہر کو مدرسہ میں نہ آئیے کپتان صاحب کو یہ خط پہونچا دیجئے۔ میں وہ لفافہ لیکر کھڑا ہوا تو پھر فرمایا کہ ذرا بیٹھ جاؤ کیا آپ کو کچھ شاہانِ دہلی سے بھی تعلق ہے میں نے عرض کیا کہ میری

---

[1] نواب صاحب کے صاحبزادوں کی تعلیم میں میرے شریک تھے۔

والدہ ماجدہ شاہ[51] عالم کی نواسی ہیں ورنہ ہم لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔ چنانچہ میرے پردادا مرزا جیون بیگ خاں اور ان کے بھائی اشرف الدولہ مرزا اشرف بیگ خاں فوج شاہی کے سردار تھے۔ پھر فرمایا کہ آپ کے چچا مرزا عباس[52] بیگ بھی تو اودھ میں جاگیردار ہیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ ہیں۔ الغرض میں ان باتوں کا اور سوالاتِ بے محل کا کچھ مطلب نہ سمجھا اور نہ میں نے اپنے خیال کو ادھر مصروف کیا وہاں سے پژمردہ خاطر اس سوچ میں اٹھ کر چلا آیا کہ میں بڈھے طوطے کو کیا پڑھاؤں گا۔ بہرحال تعمیل حکم میں کپتان صاحب کی خدمت میں پہونچا وہ باہر ہواخوری کو جانے کی طیاری کر رہے تھے اس ہی کمرہ میں مجھ کو فوراً بلا لیا۔ اور نواب صاحب کا خط پڑھکر بڑے جوش سے ہاتھ ملایا اور کہا میں اس وقت باہر جاتا ہوں آپ کل صبح کو میرے پاس آئیے اور کوئی اردو کتاب ساتھ لیتے آئیے۔ میں نے کہا صبح کو مجھے مدرسہ سے فرصت نہیں ہے اس ہی وقت بیٹھ گئے! ور کرون صاحب کے نام خط لکھ کر مجھ کو دیا۔ میں جانے لگا تو مجھ کو روک دیا۔ چند منٹ اور مجھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرکے رخصت کر دیا۔ چلتے وقت میں نے کہا کہ اگر دوپہر کو آپ مجھے بلائیں تو میں اطمینان سے آسکتا ہوں۔ خلاصہ اینکہ یہ قرار پایا کہ جب مجھ کو فرصت ہو آیا کروں دوسرے روز مدرسہ سے کھانا وغیرہ کھا کر پھر میں گیا۔ بڑی خاطر داری سے مجھ سے ملے اور کہا کہ میں حضور میں جانے والا ہوں دو تین جملے مجھ کو رُومن میں لکھ دو میں یاد کر لوں گا! ور الف لیلہ اردو میرے واسطے لیتے آؤ۔ وہ میں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اپنی بی بی سے میری

---

[51] والدہ ماجدہ نواب منور زمانی علویہ بیگم بنت نواب قریشیہ سلطان بیگم (زوجہ نواب خلیل اللہ خاں) بنت نواب شہزادہ بیگم زوجہ شہزادہ مرزا الجتا ورجنت نبیرہ شاہ عالم گیر ثانی ابن شاہ عالم وغیرہ تا حضرت صاحب قران امیر تیمور گورگان۔

[52] تعلقہ دار بڑا گاؤں ضلع سیتاپور ملک اودھ۔ بصلہ خدمات زمانہ غدر بعہد لارڈ لارنس۔

ملاقات کرائی معلوم ہوا کہ وہ مسٹر براؤننگ کی بیوہ ہیں اور ان سے نکاح ثانی ہوا ہے۔ نہایت
ذی علم اور شاعرہ ہیں۔ غرض ہر روز وہ مجھ سے اُردو کے جملے لکھواتے تھے۔ الف لیلہ
کا صرف ترجمہ مجھ سے سنا کرتے تھے ایک سطر اُردو پڑھتا تھا اور ان کو سناتا تھا۔ روز عاشورہ
محرم الحرام میں سہ پہر کو ان کے پاس گیا تو مجھ سے محرم کے حالات لکھنے کی فرمائش کی میں
نے کہا یہ تاریخی واقعہ ہے کہا کہ کتابیں کون پڑھے۔ تم مختصر حالات لکھ کر لا دو اور کل علی الصباح
میرے پاس لے آؤ۔ میں گھر واپس آیا اور کوئی آدھی رات تک قلم فرسائی کرتے کرتے
وہیں سو گیا۔ صبح کو وہ غیر مکمل اوراق گھسیٹم خط لیکر ان کے پاس گیا۔ اور وہ بدخط اوراق
دکھا کر نظر ثانی اور خط صاف لکھنے کے عذر سے واپس لینے چاہے۔ انہوں نے وہ اوراق
مجھ سے لے لئے اور کہا کچھ مضائقہ نہیں میں پڑھ لوں گا۔ اور کل صبح کو آپ پھر میرے پاس
آئیے۔ میں خالی الذہن بے فکر وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے روز صبح کو میں گیا تو وہ ہوا خوری
کو گئے ہوئے تھے اور وہ کاغذ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نظر ثانی کے خیال سے وہ کاغذ
اُٹھا لئے۔ اس کے ایک گوشہ پر کپتان صاحب کی تحریر تھی کہ میں نے تقریراً و تحریراً خوب
امتحان کر لیا آدمی لائق اور میرے کام کے ہیں۔ اس ہی کے نیچے نواب صاحب کی تحریر
تھی کہ میں نے بھی خاص اس ہی وجہ سے ان کا انتخاب کر کے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ تحریریں
پڑھکر میں نے وہ کاغذات میز پر رکھ دئے۔ اتنے میں کپتان صاحب ہوا خوری سے واپس آئے
اور بڑے تپاک سے "ہو ڈو یو ڈو" (How do you do) ہوئی۔ بیٹھتے
ہی مجھ سے یہ کہا کہ آپ نواب صاحب سے ملے تھے یا نہیں اور انہوں نے آپ سے کچھ
کہا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں اب تک ملا اور نہ کوئی گفتگو ہوئی یہ سن کر انہوں نے
چند سطریں لکھ دیں اور کہا کہ آپ ابھی نواب صاحب سے ملئے۔ میں وہ خط لیکر گو خلاف وقت

وروز مقررہ تھا۔ سید ھا در دولت وزارت پر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے اس ہی وقت مجھ کو طلب کر لیا۔ اول ادھر اُدھر کی دو تین باتیں کر کے مجھ سے ارشاد کیا کہ کپتان صاحب آپ سے بہت خوش ہیں میں نے دست بستہ عرض کیا کہ مجھ کو سرکار کی خوشی مطلوب ہی ان سے کیا غرض۔ علاوہ اس کے نہ وہ کچھ پڑھتے ہیں نہ لکھتے ہیں باتوں میں وقت خراب جاتا ہی معلوم نہیں انہوں نے میرا جواب سُنا یا نہیں چند منٹ خاموش رہ کر فرمایا آپ سے کچھ ضروری امور کہنے ہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ پانچ بجے آپ آیئے۔ میں سلام کر کے گھر چلا آیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ والدہ ماجدہ دو تین تھان کپڑوں کے لئے ہوئے بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور شجاعت بیگ آپ کی انّا کا فرزند فن خیاطی میں بے مثل کتر بیونت کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا کپڑے ہیں فرمایا کہ تم ہی نے تو کہلا بھیجا تھا کہ جلد جامہ نیمہ طیار کراؤ کل حضور میں جاتا ہوں۔ میں نے حیرت سے انکار کیا تو ساجد بیگ اور واجد بیگ جن کی عمر اس وقت پانچ پانچ چھ چھ برس کی تھی بول اُٹھے واہ بھائی انّا ابھی تو ایک شخص ہاتھی پر سوار ادہر سے نکلا اور کہا کہ جاؤ تمہارے بھائی کل حضور میں جاتے ہیں۔ جامہ۔ نیمہ سلواؤ۔ الغرض میں پانچ بجے پھر ڈیوڑھی پر حاضر ہوا گھٹنوں تک اونچی اچکن پہنے ہوئے تھا۔ پگڑی سر پر کمر بندھی ہوئی تھی۔ نواب صاحب مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ کپتان صاحب نے آپ کو اپنی مددگاری کے واسطے پسند کیا ہے آپ ان کے ساتھ ڈیوڑھی مبارک میں جایا کیجئے۔ میں یہ سنکر سنّاٹے میں رہ گیا اور دست بستہ عرض کیا کہ مجھ سے ایسی خطا کیا ہوئی ہے کہ اس اعلیٰ خدمت سے علیحدہ کر کے ایک انگریزی کی منشی گری اور ترجمہ نگاری پر بھیجا جاتا ہوں بہت انگریزی اس سرکار میں موجود ہیں ان میں سے کوئی کپتان صاحب کے پاس متعین کر دیا جائے میں نے جو صاحبزادگان کے ساتھ محنت کی وہ برباد نہ فرمایئے۔ نواب صاحب نے یہ سنکر حیرت سے

فرمایا کہ آپ کی عقل جاتی رہی ہے۔ یہ وہ خدمت ہے کہ کسی وقت آپ خود میری سفارش حضور پُرنور سے کریں گے ہرحال آپ ابھی نواب امیرکبیر بہادر سے ملنے جائیے اور وہاں سے پھر میرے پاس واپس آئیے۔ اس کے بعد ہنس کر فرمایا کہ آپ کے پاس کیا سواری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس صرف ایک یابو سمند سیاہ زانو ہے۔ فرمایا یہ کچھ نہیں۔ اور ایک شاگرد پیشہ کو یاد فرماکر حکم دیا کہ خانساماں سے کہو کہ آپ کے واسطے ایک پالکی ابھی طیار رکھے۔ اور دو ہرکارے بھی ساتھ جائیں۔ اور نرسنگھ راؤ کو طلب فرماکر حکم دیا کہ تم پہلے جاکر نواب صاحب کو اطلاع کردو۔ ان احکام کے بعد پھر میری طرف مخاطب ہوئے۔ اور فرمایا کہ کپتان صاحب بھی پہلی ہی بار ڈیوڑھی مبارک میں جائیں گے آپ کو بھی وہاں حاضر رہنا چاہئے۔ مگر اس لباس میں نہیں بلکہ درباری لباس میں۔ ایک دن میں طیار ہوسکتا ہے۔ کل آپ پہن کر میرے پاس آئیے۔ چونکہ میں خالی الذہن آیا تھا لہٰذا خود پانچ روپیہ بھی برائے نذر نواب امیرکبیر عطا فرمائے۔ اور اس کو قرض کے نام سے نامزد فرمایا۔

ملاقات نواب امیرکبیر الغرض میں پر تکلف پینس میں بیٹھا ہوا دو ہرکارے جلو میں دوڑتے ہوئے۔ خدمت گار پینس کا کنارا پکڑے ہوئے اس شان و شوکت سے اُن بازاروں میں سے گذرا جہاں میں تنہا پاؤں پیدل بہ تلاش روزگار پڑا پھرتا تھا۔ عصر کا وقت تنگ تھا کہ میں ان کی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ جلوخانہ میں پہنچکر جونہی میں نے پالکی سے قدم باہر نکالا۔ ایک مرد آدمی لنبا قد۔ دوہرا جسم ریش سفید و دراز۔ دستار شاگرد پیشگان برسر۔ کمر پر کوئی دس بارہ گز کا کپڑا لپیٹے ہوئے اس میں پیش قبض اُڑسے ہوئے تلوار ہاتھ میں سامنے آکھڑے ہوئے۔ اور سخت آواز سے مجھ سے کہا کہ یہ کیا انسانیت ہے کہ نواب[۱] صاحب کو تم نے اتنا منتظر رکھا۔ میں نے دل میں کہا کہ ع

سالیکہ نکوست از بہارش پیدا

---

[۱] نواب عمدۃ الملک امیرکبیر شمس الامرا شریک نائب السلطنۃ۔

میں نے بلا وجہ چند الفاظ عذر کے کہدئے وہ مجھ کو ایک سہ دری کی طرف لے گئے۔ دو دروں میں پردے پڑے ہوئے تھے۔ تیسرے در میں جو میں نے قدم رکھا ایک پیر کہنہ سال نہایت ضعیف شکل مریض دستار بر سر جامہ در بر نہایت نورانی چہرہ جس پر رعب و داب امارت درخشاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ بخندہ پیشانی ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا اور مسکراتے ہوئے نذر قبول فرما کر مسند کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سہ دری نہایت مختصر تھی۔ صرف دری چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ اور ایک چھوٹی سی الماری مسند کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ وہ صاحب جو میرے ساتھ آئے تھے وہ بھی سلام کر کے بیٹھ گئے۔ اور نرسنگھ راؤ بھی حسب الطلب حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد میرا نام دریافت فرمایا میں نے کہا احقر کو آغا مرزا کہتے ہیں۔ یہ سن کر نرسنگھ راؤ سے فرمایا کہ آغا اور مرزا دونوں لفظ بڑے خاندان کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد میری تعلیم و تربیت کا حال پوچھ کر فرمایا کہ آپ لاطینی بھی جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا لاطینی کا رواج کسی مدرسہ میں نہیں ہے۔ پھر پوچھا ریاضی بھی جانتے ہو میں نے کہا بقدر ضرورت کہا اس کے کیا معنی، میں نے عرض کیا کہ جس قدر امتحان کے واسطے ضرورت پڑی۔ یہ سنکر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر میرا مذہب دریافت فرما کر کہا کہ آپ کو تو یہاں لوگ جانتے بھی ہونگے۔ میں نے عرض کیا سوائے مولوی امین الدین خاں اور کوئی مجھ سے واقف نہیں وہ ہی میرا مذہب بھی جانتے ہیں۔ فرمایا گواہی شاہدی کی ضرورت نہیں آپ کا بیان کافی ہے۔ یہ کہہ کر نرسنگھ راؤ سے ارشاد فرمایا کہ مختار الملک سے کہدو کہ میں ان صاحب کو پسند کرتا ہوں۔ اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ تبارک تعالیٰ آپ کو یہ خدمت مبارک فرمائے۔ نرسنگھ راؤ نے میری طرف نذر دینے کا اشارہ کیا، میری جیب خالی تھی۔ اُس نے اپنا رومال معہ رقم میری طرف کھسکا دیا۔ یہ نذر بھی میری مسکرا کر قبول فرمائی اور کہا کہ ذرہ بیٹھ جاؤ۔ اور وہ خود بھی سیدھے بیٹھ گئے۔ پھر خوب غور سے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم سمجھے کہ تم کس ذمہ داری کی خدمت پر مقرر ہوئے ہو۔ میں روز حشر تم کو پکڑوں گا۔ اگر

کچھ بھی بندگانِ عالی کے خیالات مذہبی یا معاشرتی میں فرق آیا۔ میں نے دست بستہ جواب دیا کہ یہ ذمہ داری اس احقر و کمترین کی طرف عائد نہیں ہو سکتی ہے۔ میں ایک ادنیٰ ملازم مجبور و محکوم سرکار اور نواب وزارت پناہ کا ہوں اور صرف تعمیل حکم میرا فرض ہے۔ ورنہ اختیار بدست مختار ہے۔ میرے اس جواب پر ایک دو آنسو ان مبارک و محترم آنکھوں سے ٹپک پڑے اور فرمایا کہ "میں ابھی سے دیکھتا ہوں کہ ایک انقلاب عظیم ہونے والا ہے۔ میں چند روز کا مہمان ہوں۔ میں کہاں اور حضور پرنور کی عہد حکومت و مختاری دیکھنی کہاں۔ علاوہ اس کے حاضر باشان در دولت کو جو موقع عرض معروض کا ہے وہ ہم کو نصیب نہیں۔ صرف تم لوگ نگراں حال رہو گے۔ معلوم نہیں کہ انگریز کا تقرر تعلیم پر اور انگریزی تعلیم کیا اپنا اثر دکھلائے۔ مختار الملک بہت دانا اور دور اندیش آدمی ہیں اور بقول ناصر الدولہ کے ایک جواہر پارہ اور ہیرے کا ٹکڑا ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ مگر انگریزیت کا ریلا مثل سیلاب کون روک سکتا ہے! اور نئی امت جو ہمارے بعد آنی والی ہے۔ ہماری وضع ہمارے مراسم سے بے خبر، نہیں معلوم کیا شطرنج بچھائے۔ بہرحال اس قدر تو ضرور ہے کہ مذہبی خیالات قائم رہیں اور آداب شاہی میں فرق نہ آنے پائے اور مثل تقویم پارینہ یا اساطیر الاولین چشم دوربیں سے نظر انداز نہ کئے جائیں"۔ یہ فرما کر عطر کا حکم دیا۔ اور پہلو کے تکیہ بدل دئے یہ اشارہ تھا کہ برخاست، میں بھی سلام کر کے رخصت ہو کر سیدھا وزارت پناہ کی خدمت میں پہنچا۔ اول نماز مغرب ادا کی بعدہ حسب الطلب روبرو گیا۔ دونوں باپ بیٹے یعنی تہنیت یاور الدولہ اور مستحکم جنگ بھی حاضر تھے۔

میری پہلی باریابی

دوسرے روز سہ پہر کو حسب الطلب بہن ملبوس خاص یعنی جامہ ونیمہ ودستار وکمراول وزارت پناہ کی خدمت میں پہونچا۔ مجھ کو اس لباس میں دیکھ کر بہت خندہ زن ہوئے مگر جامے کی قطع و برید اور اس کے بندوں کو ناپسند فرمایا بعدہٗ وہاں سے سیدھا دردولت شاہی پر حاضر ہوا۔ باہر کے جلوخانہ پر میانہ چھوڑا اور پاپیادہ جامے کو سنبھالے ہوئے کئی جلوخانے طے کر کے خلوت میں پہنچا۔ وہاں ہر دو صاحب یعنی تہنیت یارالدولہ و مستحکم جنگ میرے منتظر تھے۔ اول ہم سب نے نماز عصر پڑھی۔ بعدہٗ تہنیت یارالدولہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا نام روشن بنگلہ تھا وہاں چلے گئے کچھ عرصے کے بعد جب حضور پُرنور برآمد ہوئے تو اُنھوں نے مجھ کو طلب کیا۔ چھوٹا سا دالان چھوٹی سی انگنائی دالان میں مسند بچھی ہوئی اس پر حضور کلاہ زرنگار بر سر، انگرکھا دکھنی در بر، لمبی لمبی چوٹیاں تا بہ کمر عمر شریف کوئی آٹھ برس کی جلوہ افروز تھے۔ دو تین مامائیں سفید مثل برف ڈوپٹوں میں لپٹی ہوئیں پس پشت استادہ، بڑے میاں اور اُن کے بیٹے دست بستہ روبروئے مسند بیٹھے ہوئے، اوّل لفظ جو حضور پرنور نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ "انگریزی بولی کیسی ہوتی ہے سناؤ" میں نے انگریزی میں عرض کیا کہ I pray for your Highness' long life and prosperity اس کے بعد فوراً برخاست فرما گئے۔ وہاں سے اول وزارت پناہ کی خدمت میں برائے نذر حاضر ہوا اور وہاں سے حسب الحکم کپتان صاحب کی خدمت میں گیا۔

لہ تاریخ باریابی ۲۲ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق سنہ ۱۸۷۵ء۔ اس باریابی کے تین سال بعد سالگرہ مبارک کی تقریب میں میرے بچوں کو سرپیچ مرصع اور سو روپیہ منصب رکاب بسعادت عطا ہوا۔

دو تین روز سے ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی بہت تپاک سے ملے اور تمام حالات سُن کر وہ اور
ان کی بی بی دونوں ہنستے رہے۔ بالخصوص میرے جامہ ونیمہ پہنے ہوئی شکل پر بہت قہقہے لگائے۔

روز اوّل درس مبارک و ملاقات کپتان صاحب[1]

علی الصباح میں حسب قرارداد در دولت فلک رفعت شاہی پر
حاضر ہوا اور بگھی خانہ سے اتر کر چو محلہ مبارک میں پہونچا۔ آفتاب محل میں تہنیت یار الدولہ،
مستحکم جنگ۔ اکرام جنگ۔ عرض بیگی معز الدین و فصیح الدین صاحب حاضر تھے۔ نیچے کے
دالانوں میں حکیم باقر علی خاں و مسیح الدوراں خاں و ڈاکٹر محمد اشرف و غلام دستگیر جا بجا جامے
پہنائے ہوئے بیٹھے تھے ان سب سے مصافحہ وغیرہ ہوا۔ اتنے میں ایک کم سن گورے چٹے
امیرزادے، دوہرا بدن جامہ ونیمہ در بر دستار[2] طرہ دار آصف جاہی بر سر چند مصاحبین کے
ہمراہ حاضر ہوئے معلوم ہوا کہ یہ **ظفر جنگ** فرزند خورشید جاہ شریک درس حضور پُر نور ہوئے
ہیں۔ اُسی وقت ہرکارہ نے خبر دی کہ کپتان صاحب چار مینار تک آپہونچے۔ مستحکم جنگ
استقبال کے واسطے دروازہ پر جا کھڑے ہوئے تہنیت یار الدولہ[3] نے چوبدار کو حکم دیا کہ محل
میں اطلاع کر دو جلد حضور پُر نور برآمد کئے جائیں۔ اس عرصہ میں کلارک صاحب بھی آگئے
مجھ سے ہاتھ ملایا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ حضور پُر نور پہلی بار انگریز سے ملتے ہیں مبادا مرعوب
ہوجائیں۔ مگر میں نے نواب وزارت پناہ کا اطمینان کر دیا تھا اور اب حضور پُر نور بھی سواری

ف۱ شاید ۱۵ر محرم مگر سنہ یاد نہیں رہا

ف۲ مشہور یہ ہے کہ بادشاہ اورنگ زیب حضرت آصف جاہ کو نواب چین قلیچ خاں پکارا کرتے تھے اور بکمال مہربانی کے باعث خاص اپنی پگڑی عنایت فرمائی تھی چنانچہ یہ پگڑی اس وقت سے ہر رئیس کے زیب سر مبارک رہی مگر آخر عہد سلطنت میں میر محبوب علی خاں جنت آرام گاہ نے یہ پگڑی ترک فرما کر ایک بلند بنی پگڑی زیب سر فرمائی شاید یہ پگڑی اقبال الدولہ وقار الامرا نے ایجاد کی تھی جو اب عام طور پر باندھی جاتی ہے گو قدیم خاندانوں میں اب تک اپنی اپنی خاندانی پگڑیاں باندھی جاتی ہیں۔

ف۳ ۱۳ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۱ھ کو انتقال کیا۔

ہوا دار رونق افروز ہوئے چند ماما ئیں پیچھے پیچھے تھیں کپتان صاحب نے استقبال کرنا چاہا میں نے ان کو روک دیا
خلاصہ این کہ داہنی جانب کے درجہ میں گول میز اور کرسیاں پہلے سے رکھ دی گئی تھیں میں اور کلارک صاحب
ظفر جنگ اور مستحکم جنگ کرسیوں پر بیٹھے باقی کل حاضر باشان و ماما ئیں وغیرہ ملازمین سامنے
سے ہٹ گئے ۔ حضور پر نور کے چہرہ مبارک سے خوف تو ظاہر نہ تھا مگر متحیر تھے کہ میں نے
جیبوں میں سے دو تین تصاویر خوش رنگ نکالیں اور وہ سامنے رکھ کر اُن کی نسبت باتیں
بنانے لگا ۔ یہاں تک کہ ظفر جنگ اور حضور پُر نور ہنس پڑے ۔ اُس وقت باجازت کپتان
صاحب میں نے کہا کہ اب حضور تشریف لے جائیں ۔ کلارک صاحب مجھ سے بہت خوش ہوئے
اور مجھ کو ساتھ لے کر چو محلہ کے پس پشت کل پھیروں کے وسیع میدان کو دیکھ کر کہا کہ یہاں
لان ٹینس بنوانا چاہیے ۔ کپتان صاحب انگریزی میں کہتے گئے میں اُردو میں مستحکم جنگ کو سمجھاتا
گیا ۔ دوسرے دن میں ایک کتاب نفیس جلد کی جانوروں کی تصویر والی اور ان کی نسبت
حکایات والی لے کر گیا ۔ جب ہم سب پھر میز پر بیٹھے ، میں نے وہ کتاب کھولی ۔ شیر کی تصویر
نکلی ۔ انگریزی پڑھتا گیا اور اپنی زبان میں بیان کرتا گیا کوئی پندرہ منٹ بعد حسب اشارہ کپتان
صاحب میں نے کہا لو چھٹی ہے اب تشریف لے جائیے ۔ خوش خوش صحبت برخاست
ہوئی ۔ دوسرے روز میں سلیٹ پنسل وغیرہ بھی لیتا گیا ۔ اوّل حکایات خوانی ہوئی
بعد اس کے میں نے سلیٹ سامنے رکھ کر شیر کی تصویر دانستہ خراب کھینچی ۔ ظفر جنگ
نے اعتراض کیا ۔ مستحکم جنگ اور کپتان صاحب ہنسنے لگے ۔ حضور پر نور نے میرے ہاتھ سے
پنسل چھین لی اور خود اس کی اصلاح میں مشغول ہوئے ۔ الغرض تین چار روز میں ہم سب ایسے بے تکلف
ہو گئے کہ گویا مدت العمر سے ساتھ رہے تھے ۔ وزارت پناہ مجھ سے ایسے خوش ہوئے کہ ایک
گھڑی مع زنجیر بذریعہ مستحکم جنگ حضور کے پاس بھیجی کہ مجھ کو عطا فرمائیں اور کپتان کلارک صاحب

نے خاص ڈنر کی دعوت کی جس میں نواب وزیر مع چند ملازمین مثل سید حسین صاحب بلگرامی میر ریاست علی اور امرائیں نظام یار جنگ وغیرہ مدعو ہوئے۔ میں نے اس شب کو عمامہ فرخ آبادی سر پر رکھا تھا۔ جس پر سید حسین صاحب نے مجھ کو کاکنی[1] خطاب دیا اور واقعی سچ خطاب دیا۔ اس واسطے کہ اتنی بڑی کامیابی کے بعد میں اپنی ہستی بھول گیا تھا اور اتراتا پڑا پھرتا تھا۔ سید صاحب کے اس خطاب نے چونکا دیا۔ اور عمامہ اتار کر پگڑی سر پر رکھ لی۔

خلاصہ یہ کہ دوسرے روز میں نے حروف انگریزی کا درس شروع کر دیا اور ظفر بیگ کو دھمکا دھمکا کر میں نے حضور پر نور کی نظروں میں اپنا وقار بھی قائم کر لیا۔ اب درس کا دستور یہ تھا کہ میں اور کپتان صاحب اور حضور پر نور و ظفر جنگ ساتھ بیٹھے تھے۔ اور مستحکم جنگ وغیرہ کل حاضر باش نیچے کے بیوتات میں اپنے اپنے چار جامے بچھا کر حاضر رہتے تھے۔ دس بجے سے قبل درس برخاست ہو جاتا تھا۔ اور میں وہاں سے اٹھ کر مدرسہ وزارت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ بہت دن نہ گزرے تھے کہ نواب وزارت پناہ نے اس عذر سے کہ حاضر باشان در دولت شاہی سے میں خانگی کام نہیں لیتا۔ میری حاضری معاف فرمائی میں نے اپنے برادر عزیز و افر تمیز مرزا رفیع الدین[2] بیگ سلمہ کو وہاں ملازم رکھا دیا۔ یہ امر ایک شخص اکبر علی نامی کو جو دست گرفتہ سید حسین صاحب تھا اور ابتدائی تعلیم میں چند روز میرا ہم درس بھی کیننگ کالج میں رہا تھا ناگوار گذرا اور اب اس کی بدولت وہ پریشانی

---

[1] لندن کے نوجوان رنگیلوں کا لقب کاکنی (Cockney) ہے

[2] مرزا رفیع الدین بیگ بہ وحشی چچا مرزا عاشور بیگ کے منجھلے بیٹے۔ انتقال بمقام علی گڑھ بتاریخ ۱۲ رمضان ۱۳۴۹ھ

دامن گیر ہوئی کہ تادم تحریر ہذا اس میں گرفتار ہوں۔ یعنی اس ہی مرحوم نے مجھ میں اور
سید حسین صاحب میں نااتفاقی کی بنا ڈالی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ کئی بار یہ
نوبت پہونچی کہ میں ڈیوڑھی مبارک سے نکالا جاؤں مگر ہر بار پروردگار عالم رحیم و
کریم جل جلالہٗ و عم نوالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھ کو بلا میری جستجو و کوشش
کے بچا لیا۔ اور ایک میں ہی استاد حضور پرنور کا ہوں کہ درس کی ابتدا میرے ہاتھ
پر ہوئی اور ختم بھی میرے ہاتھ پر ہوا۔ دوسرے استاد بیچ میں شریک ہوئے یا قبل
ختم غائب ہو گئے اور ایک میں ہی خوش قسمت ہوں کہ برابر مورد الطاف شاہی رہا
اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے ایک قدیم انگریزی تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ جس کو
"وہپنگ بوائے" کہتے ہیں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں ہر وقت ظفر جنگ کو دھمکاتا رہتا
اس واسطے کہ بعد ذات بابرکات حضور پرنور جملہ امرا میں ان کا مرتبہ اعلیٰ تھا اور
سزا دینی تو دھمکی سے زیادہ ناممکن تھی۔ پس تجویز یہ قرار پائی کہ چند منصب داران
رکاب سعادت کے بچے بھی حاضر رہیں۔ اور ان کو علیحدہ درس دیا جائے گویا ایک
مکتب مختصر میری نگرانی میں قائم کیا جائے۔ اور ان کی درس دہی کے واسطے
میں نے مرزا رفیع الدین بیگ کو اپنی پیش دستی میں لے لیا۔ اُن میں سے صرف ممتاز علی
کا نام یاد رہ گیا جو اب بخطاب ممتاز یار جنگ افسر الملک بہادر کی دامادی سے ممتاز ہیں
ان بچوں کو میں روزانہ دھمکاتا اور اکثر دو تین بید بھی لگا دیا کرتا تھا۔ کسی وقت میں یہ عام
دستور یورپ میں تھا کہ شاہزادوں کی ادب آموزی کے واسطے *a whipping boy*
تجویز کئے جاتے تھے۔ اگرچہ شاہان دہلی میں اس کے خلاف دستور تھا۔ چنانچہ
ملا جیون عالمگیر کی خوب گوشمالی کرتے تھے۔ الغرض صبح سے دوپہر تک درس انگریزی

اور بعد دوپہر درس مولوی محمد زماں خاں صاحب شہید یہ اوقات درس کے مقرر ہوگئے
سہ پہر کو منشی مظفر الدین خوشنویس تختی لکھوایا کرتے تھے۔

مولانا محمد زماں[1] خاں شہید نہایت احباب پرست آدمی تھے اکثر اہل حاجت اُن کے ذریعہ سے کامیاب ہوتے رہتے تھے۔ ایک روز ایک غریب الوطن امیدوار کو اپنے ساتھ وزیر باتدبیر کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ آپ تو مختار الملک لفظاً و معنیً ہیں۔ میں محتاج الملک کو آپ کی ملاقات کے واسطے لایا ہوں۔ نواب صاحب نے فوراً معقول منصب سررشتہ دیوانی سے جاری فرمادیا۔ میں بھی اُن کی ملاقات سے مشرف ہوا۔ رائے یہ قرار پائی کہ میرے مشورہ سے علاوہ درس قرآن مجید کچھ درس فارسی بھی شروع کردیا جائے اور وقتاً فوقتاً بقدر فرصت میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں۔
ایسے باخدا تھے کہ اُن کا فقیرانہ رعب تمام اہل بلدہ پر حاوی تھا۔

اُن کی شہادت کا بھی عجیب قصہ ہے۔ طلبہ ہر طرف سے اُن کے پاس معقولات و منقولات پڑھنے کو آتے تھے۔ منجملہ ان کے ایک مہدوی پٹھان نوجوان سید نصرت صاحب کا مرید بھی ان کا شاگرد تھا۔ مولوی صاحب نے ایک مجلد کتاب تردید مذہب مہدوی میں تصنیف فرمائی تھی جس سے مہدوی پٹھانوں کو غصہ آیا۔ سید نصرت صاحب بھی مولانا کے شاگرد رشید بہت ذی علم اور مہدوی پٹھانوں کے امام اور پیش نماز تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے جواب کے واسطے اپنے مریدین سے چندہ طلب کرکے

---

[1] مرزا شاہ علی بندہ اندرون بلدہ۔ برادر کلاں مولوی مسیح الزماں خاں مولٰنا محمد زماں خاں بتاریخ ۶ ذیحجہ ۱۲۹۲ھ شہید ہوئے ۱۲

ایک عربی کتاب خانہ بمبئی اور مصر وغیرہ مقامات سے جمع کیا تھا۔ مگر یکایک اُس نوجوان مہدوی کو ایسی حمیت مذہبی آئی کہ اپنی جان نثار کرنے کو مستعد ہو گیا۔ اس کی والدہ نے اس دن اس کو نہلایا بالوں میں تیل ڈالا، سرمہ آنکھوں میں لگایا۔ پھول کے ہار گلے میں ڈالے اور ایک چھرا دے کر کہا کہ بیٹا شہید ہو اور ہم کو بخشواؤ۔ وہ اُس وقت پہونچا کہ مولوی صاحب مسجد میں بعد ظہر قرآن پڑھ رہے تھے۔ اس نے اول دو رکعت نماز ادا کی اور پھر آہستہ آ کر اس قوت سے چھرا مارا کہ مولوی صاحب کا دل و جگر سب کٹ گیا۔ نواب وزارت پناہ ان ایام میں کلکتہ برائے ملاقات صدر صوبہ دار ممالک ہند گئے ہوئے تھے اور نواب مکرم الدولہ ان کے بھانجے مسند وزارت پر نیابتہً متمکن تھے کہ یکایک بلدہ فرخندہ بنیاد میں ایک شور و غل مچ گیا۔ مگر وہ لڑکا کسی حکمت سے نکل کر چنچل گوڑہ میں سید نصرت صاحب کی خدمت میں پہونچ گیا۔ اہل بلدہ اور بالخصوص ہندوستانی پٹھانوں اور عربوں نے بدلا لینے کے واسطے کمریں باندھ لیں۔ بلدہ کے دروازے بند ہو گئے۔ چارمینار پر توپیں پہونچ گئیں۔ مکرم الدولہ مرحوم نے کمال استقلال سے اس مرحلہ کو طے کیا اور اہل بلدہ سے وعدہ کر لیا کہ نواب وزارت پناہ کی واپسی پر پورا بدلا لیا جائے گا۔ چنانچہ نواب وزارت پناہ نے آ کر کل مہدوی پٹھانوں کو داخل بلدہ ہونے کی ممانعت کلّی کر دی اور سید نصرت صاحب کو ان کے مکان میں قید کر دیا۔ مجرم کو سزائے قتل دی گئی وہ ہنستا کھیلتا گورکھ املی[1]

---

[1] یہ مقام موسیٰ ندی کے شمالی کنارے پر پل افضل گنج اور پرانے پل کے درمیان واقع تھا۔ اس مقام پر مجرمین قابل قصاص سے قصاص لیا جاتا تھا۔

کے نیچے اپنے مذہب پر تصدق ہوگیا۔ نہیں معلوم حوروں کی گود میں گیا یا اژدہائے آتش فشاں کے پیٹ میں گیا۔ بہرحال میرا نقصان کر گیا کہ میرا ایک زبردست قدرداں میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اُن کی جگہہ ان کے برادر خورد مولوی مسیح الزماں خاں مرحوم جو پہلے آستانۂ وزارت میں میرے خواجہ تاش تھے یہاں بھی میرے خواجہ تاش بنائے گئے۔ مولوی صاحب نے آتے ہی اپنے بھائی شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر اعتراض شروع کئے اور بہت جلد مستحکم جنگ کو انتظام ڈیوڑھی مبارک سے معطل کرکے کل کارخانجات کو سوائے اصطبل و بگھی خانہ اپنے قبضہ میں کرلیا اور اس قدر اپنا رعب و داب گرد واطراف میں جمایا کہ نواب وزارت پناہ بھی اُن سے کنیانے لگے۔ اور مجھ سے تو اس قدر مخالفت کرتے رہے کہ ڈیوڑھی مبارک میں بھی دور کی علیک سلیک رہ گئی۔

دعوتِ عام بطریق قدیم

چہار شنبہ آخر صفر[1] کے مہینے میں سات چھلّے چاندی اور سونے کے راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ نے مجھکو اور گیارہ چھلّے استحکام الدولہ مستقل جنگ جان کلارک خان بہادر بمنصب ہفت ہزاری پنج ہزار سوار کو ملے۔ یہ دستور قدیم بھی شاہانِ دہلی کا تھا۔ ماہ رجب میں کونڈوں کی دعوت بھی بذریعہ بنسی راجہ مذکور میرے پاس آئی۔ بعد مغرب میں خلوت مبارک میں حاضر ہوا۔ تمام خلوت اندر باہر اور پس و پیش تمام وسیع صحن اس کے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سوائے امرائے عظام باقی شرفا و خوش باش لوگوں میں سے کوئی ایسا ہی بدقسمت ہوگا۔ جو اس عزت سے محروم رہ گیا ہو۔ خلوت کے اندر قناتیں گھیری گئی تھیں۔ بالا منزل شہ نشین پہ حضور پرنور مع چند مصاحبین مسند شاہی پر جلوہ افروز تھے۔ نیچے دالانوں میں دسترخوان بچھے ہوئے اور اس پر بڑی بڑی نانڈیں رکھی ہوئیں اور دسترخوان پر خالی صحنکیں چنی ہوئیں۔ غول کے غول مہمان باہر سے آتے اور بریانی کھا کر پائیں زینہ شاہ نشین کے پاس آکر آداب بجالا کر چلے جاتے۔ بنسی راجہ جامہ و نیمہ دربر دستار خانذانی برسر کمر بستہ مہمان داری میں مصروف تھے۔ میانہ قد دہرا جسم داڑھی منڈی ہوئی گورا رنگ

---

[1] اس روز اہل بلدہ چہ امیر وچہ غریب اپنے باغوں میں یا سبزہ زار میدانوں میں چلے جاتے تھے اور اس رسم کو سبزہ روندنا کہتے تھے یہ بھی قدیم دہلی کا رسم تھا قدیم دہلی کے اکثر مراسم و محاورات زبانی اس وقت تک جاری تھے مثلاً میں نے ایک ماما کو اپنے لڑکے کی بابت کہتے ہوئے سنا کہ اخوند جی تم بچّے کو شوہ نہیں کرتے شوخ ہوتا جاتا ہے۔ شوہ کرنا خاص محاورہ اہل دہلی کا تھا یا مثلاً قؔ کی جگہ خؔ اور خؔ کی جگہ قؔ بولنا جیسے خاجی جی آپ کے خلمدان پر کوا بیٹھا خائیں خائیں کر رہا ہے۔ اس پر قاضی جی نے کہا ارے کم بخت کہیں تو قؔ بول اُس نے کہا بہت قوب۔ بلکہ ایک معزز ملازم نے اپنے آقا و ولی نعمت کو دعا دی کہ قدا آپ کو قوش و قرم رکھے۔ اہل ایران و فارس اب تک غؔ کو بجائے قؔ استعمال کرتے ہیں ساقی کو ساغی و قلم کو غلم کہیں گے۔ اسی طرح اہل عرب قؔ کی جگہ گؔ کہتے قال کو گال وقل کو گل زبان زد عوام ہے ان کی اولاد ہندی مچھلیوں در لبوں کی بھی یہی بول چال ہے۔

نہایت چست وچالاک۔ فارسی زبان کے فصیح وبلیغ شاعر ڈیوڑھی مبارک کے کل انتظام میں بلا بار ذمّہ دار۔ مشیر وپیش دستِ خاصِ نواب وزارت پناہ تھے۔ تقسیم حصّہ ہائے نیاز ونذر وکل دیگر تقریبات اندرونی وبیرونی یعنی مردانہ وزنانہ وانتظام دربارہائے مغلئی وانگریزی وسررشتہ داری فوج وکارخانجات آہنگری وغیرہ بڑے بڑے کام ان کے سپرد تھے۔ مجھ ناچیز سے ربطِ خاص رکھتے تھے اور بوقتِ فرصت شعر اشعار کی صحبت گرم رہتی تھی۔ فارسی شعر اور فارسی عبارت لکھتے اُردو کی دو سطریں بھی نہ لکھ سکتے تھے۔ بلکہ عیب سمجھتے تھے۔ دہلی میں بھی زمانۂ غدر تک یہی رسم تھی۔ ان کی بھی بڑی کوشش یہی تھی کہ جو مراسم وقواعد وضوابط شاہانِ دہلی حضرت آصف جاہ[ل] کے وقت سے چلے آتے ہیں ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور اسی وجہ سے راجہ صاحب اور مولوی مسیح الزماں خاں صاحب میں ہمیشہ کھٹ پٹ رہی۔ شب برات میں تین چار طرف سے آتشبازیاں پہونچیں، ڈیوڑھی مبارک سے بذریعہ مستحکم جنگ تقسیم خاص اور وزارت پناہ اور نواب امیر کبیر ونواب خورشید جاہ سے عنایات خاص۔ اسی طرح عید الضحٰی میں اونٹ کا گوشت نوروز میں انڈے، آموں کے موسم میں انبہ وغیرہ ہر موقع ومحل کی تقسیم راجہ موصوف سے متعلق تھی اور حسب ضوابط قدیم شاہانِ دہلی بعض تقسیم خاص الخاص صرف بنام وزیر وامرائے

ل حضرت آصف جاہ اوّل ۱۷۱۳ءمیں صوبہ دار دکن مامور ہوئے اور ۱۷۴۸ءمیں انتقال کیا۔ چوتھے فرزند حضرت نظام علی خاں ملقب آصف جاہ ثانی ۱۷۶۱ءمیں سریر آرائے حکومت ہوئے۔ ۱۸۰۳ءمیں انتقال ہوا اور حضرت سکندر جاہ آصف جاہ ثالث مسند نشین ہوئے۔ حضرت کا انتقال ۱۸۲۹ءمیں ہوا اور آصف جاہ رابع حضرت ناصر الدولہ مسند نشین ہوئے اور ۱۸۵۷ء عین زمانۂ غدر میں انتقال کیا۔ حضرت افضل الدولہ آصف جاہ خامس مسند نشین ہوئے۔ ۱۸۶۹ءمیں انتقال کیا اور حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس فرمان روائے دکن ہوئے۔ عمر دو سال چھ ماہ تھی۔ حضرت کا انتقال ۱۹۱۱ءمیں ہوا۔

پائیگاہ وپیشکار اور بعض تقسیم خاص صرف بنام حاضر باشان ڈیوڑھی مبارک اور بعض تقسیم عام بنام کل ملازمین ڈیوڑھی مبارک ومنصب داران رکاب سعادت بلاامتیاز ہوا کرتی تھی۔ بالخصوص موسم ابنہ میں کھانچی آموں سے بھری ہوئی سب کو تقسیم ہوا کرتی تھی۔

میرا پہلا تجربہ دربار مغلئی

رمضان شریف کا مہینا ختم ہونے کو آیا۔ بلدہ میں عید کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شاہانِ دہلی کے عہد میں ایک محکمۂ احتساب قائم تھا۔ تول ناپ، نرخ بازار، اوزان اور صوم صلوٰۃ کی عدم پابندی۔ سربازار امور بدعت جیسے قماربازی، نشہ بازی اور دوسری بداخلاقیوں کی اصلاح محتسب صاحب کے سپرد تھی۔ عید کے روز قاضی صاحب کی سواری نکلی۔ اہلِ بلدہ زرق برق مع جلوس وشان وشوکت علیٰ قدر استطاعت ومراتب ہاتیوں، گھوڑوں، ہوا داروں، میانوں میں سوار۔ نقارہ نوازان نشان چمکان جوق جوق گروہ گروہ عیدگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اسلامی شان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ محرم الحرام کی ناسزا بدعتوں کا رنج دل سے دھل گیا۔ امرا کے ہاں دربار کی تیاریاں شرفا ومترفین کے ہاں فرش وفروش اور مکان کی صفائیاں خوشبوئیوں سے تمام بلدہ ایک طبلۂ عطار بن گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان جواہر نگار زیور اور رنگ برنگ کا لباس پہنے ہوئے دستار ہائے مختلف الالوان برسر کمربستہ ہر طرف اہلے گہلے پھرنے لگے۔ توپیں دغیں۔ نماز ختم ہوئی۔ لوگ گھروں کو واپس آئے۔ امرا نے دربار شاہی میں حاضر ہونے کی تیاریاں کیں۔ اہل بلدہ اپنے اپنے علاقہ کے امیر کے دربار کے واسطے مستعد ہوئے۔ ہر کوچہ وبازار میں بندوقیں دغ رہی تھیں۔ مرزا نوشہ کا قصیدہ یاد آگیا ع

عیدست ونشاط وطرب و زمزمہ عامست

اللہ تبارک تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بعد دہلی کی تباہی کے یہ شان و شوکت اسلامی اس نے مجھکو یہاں دکھائی۔ میں بھی سادہ لباس جامہ و نیمہ و دستار و کمر میانہ ہیں۔ ڈیوڑھی کی طرف روانہ ہوا۔ سواریاں با جلوس و خدم کا وہ ہجوم تھا کہ دس منٹ کا راستہ ایک گھنٹہ میں ختم ہوا افتان و خیزاں بگھی خانہ میں اترا۔ چو محلہ ہوتا ہوا راگ مانے نکل کر خلوت میں داخل ہوا۔ العظمت للہ تمام میدان وسیع خلوت کا اندر و باہر منصبداروں و جمعداروں امرائے ریزہ و شرفاء خوش باشان بلدہ سے بھرا ہوا۔ خلوت مبارک فرش و فروش شیشہ آلات سے بطرز قدیم آراستہ باہر کے دالان میں لب زہ مسند شاہی بچھی ہوئی، مسند پوش پڑا ہوا اس پر میر فرش رکھے ہوئے۔ اس کے نزدیک کے دالان دوم میں شامیانہ اطلسی کھنچا ہوا، نیچے چند قوال سازہائے موسیقی لیے بیٹھے تھے۔ الغرض یہ سیر کرتا ہوا میں روشن بنگلہ میں پہونچا۔ حضور پر نور برائے تبدیل لباس بر آمد تھے تہنیت یاور الدولہ وکیل ریاست مستحکم جنگ اتالیق اکرام جنگ مہتمم خزانہ صرف خاص عرض بیگی و معز الدین صاحب و فصیح الدین صاحب من جانب نواب شمس الامراء امیر کبیر بہادر دست بستہ حاضر تھے۔ مجھ کو حیرت سے دیکھ کر کہا کہ بحفظ مراتب کوئی استاد دربار میں حاضر نہیں ہوتا۔ میں نے جواب دیا میں دو وجہ سے حاضر ہوا۔ اول اینکہ میں معمولی استاد ہوں، دوم مجھکو مراسم دربار شاہی کے دیکھنے کا اشتیاق دامنگیر ہوا۔ اسی وقت ہرکاروں نے عرض کیا کہ دیوان بسواری فیل و عماری آپہونچے۔ اس کے بعد دوسرے ہرکاروں نے اطلاع دی کہ امیر کبیر بہادر بسواری بوچہ دریہ دولت تک پہونچ گئے اسی طرح پیشکار اور وقار الامراء وغیرہ امرائے عظام کے آمد کی اطلاع ہوتی رہی۔ مستحکم جنگ و معز الدین صاحب نے ملبوس خاص پہنایا اور براہ راگ مالا خلوت میں لائے۔ ایک شور برآمد کا شروع ہوا۔ دور دور تک جہاں جہاں لوگ بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضور پر نور مسند شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ میں دربار سے الگ ایک کونے میں کھڑا سیر دیکھنے لگا۔

سب سے پہلے نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر آداب گاہ پر حاضر ہوئے۔ چوبداروں نے آواز دی نگاہ روبرو ادب سے، لحاظ سے، نواب امیر کبیر مع محتشم الدولہ و بشیر الدولہ خمیدہ ہو کر سات تسلیمات و کورنشات بجا لائے۔ نذر گزرانی۔ اس کے بعد چوبداران دربار دست بدست نواب صاحب کو خلوت کے اوپر لائے اور وہ آداب بجا لا کر روبرو بیٹھ گئے۔ محتشم الدولہ مورچھال لے کر بیٹھے۔ اس کے بعد دیوان آداب گاہ پر حاضر ہوئے اور اسی طرح تسلیمات و کورنشات بجا لائے۔ نذر گزرانی اور بالائے دالان روبرو بیٹھ گئے۔

ہر امیر کا سلام اسی طرح ہوا کہ چوبدار اوّل آداب گاہ سے تا لبِ خلوت لاتے اور دست گرفتہ نذر دلواتے اور بعدہ حسب الحکم خلوت پر لا کر روبروے مسندِ شاہی بٹھا دیتے۔ آداب گاہ سے تا لبِ خلوت ایسا ہجوم درباریوں کا تھا کہ چوبدار لکڑیاں مار مار کر لوگوں کو ہٹاتے تھے۔ ایک دو لکڑیاں امرائے عظام کو بھی لگ جاتی تھیں[۱]۔ چنانچہ اس دربار میں جامہ و نیمہ مکرم الدولہ کا پھٹ گیا تھا اور بڑے صاحب یعنی لائق علی خاں فرزندِ وزارت پناہ کے بھی چوٹ آئی۔ اس کے بعد اب تھیلیاں ہر علاقے کی نذروں کی پیش کی گئیں۔ وزارت پناہ کی طرف سے تمام ملازمین ریاست عدالت و مال و کوتوالی و فوج کی نذروں کی بڑی بڑی تھیلیاں پیش ہوئیں۔ اسی طرح ہر امیر کے علاقہ کی تھیلیاں پیش ہوئیں۔ پھر ہر طرف سے کل اہلِ دربار نذر دینے کو دوڑ پڑے اور چوبداروں کی لکڑیاں شراشر چلنے لگیں۔ اس کے بعد تہنیت یاور الدولہ نے مسند کے تکیہ بدل دیئے سب امرائے عظام اُٹھ کر آداب گاہ پر جا کر رخصتانہ تسلیمات بجا لا کر گھروں کو روانہ ہوئے حضور پر نور روشن بنگلہ

---

[۱] میں نے موقع پا کر وزارت پناہ سے عرض کیا کہ چوبدارانِ شاہی نہایت بیباک اور گستاخ ہیں کہ اس طرح امرائے عظام پر بھی لکڑیاں چلاتے ہیں چنانچہ بڑے صاحبزادہ کو ضرب شدید لگی اس کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا ارشاد ہوا کہ ہماری بڑی قسمت ہے کہ شاہی چوبداروں کی لکڑیاں ہم پر پڑیں۔ اس میں عین ہماری عزت اور ہمارا فخر ہے۔ کس کی مجال ہے کہ شاہی چوبداروں کو ہوں بھی کر سکے۔

میں تشریف لائے اور وہاں حاضرباشوں نے نذریں گزرانیں۔عید کا دربار ختم ہوا۔میں یہ تماشا دیکھکر خوش خوش واپس آیا۔

میرا پہلا تجربہ دربار انگریزی

تا عہد حضرت افضل الدولہ جنت آرام گاہ یہ رسم تھی کہ رزیڈنٹ بذریعۂ وزارت پناہ درخواست باریابی کرتا تھا۔مسند پر حضور پرنور رونق افروز ہوتے تھے۔رزیڈنٹ مع ہمراہیاں برہنہ سر جوتے اُتار کر سیدھے جانب فرش پر بیٹھتا تھا۔بائیں جانب دیوان پیشکار اور امرائے عظام بیٹھتے تھے۔حضرت افضل الدولہ کے انتقال کے وقت قبل از اینکہ رزیڈنٹ کو اطلاع ہو مقدم جنگ جمعدار عرب نے دروازہ ہائے بلدہ پر قبضہ کرلیا تاکہ کوئی انگریز یا کوئی انگریزی ملازم بلدہ میں نہ آنے پائے۔شاید یہ اشارہ دیوان اور امیر کبیر دونوں کا تھا۔یہ امرا اور دیگر امرائے عظام درِ دولت پر حاضر ہوئے اور **میر محبوب علی خاں** کو مسند پر بٹھا کر نذریں گزران دیں۔اس وقت دروازے شہر کے کھولے گئے۔رزیڈنٹ نے بہت غل مچایا۔مگر یہاں تو معاملہ ختم ہوچکا تھا۔اب رزیڈنٹ نے یہ ضد اور ہٹ نکالی کہ میں کرسیوں پر بلا جوتا اُتارے ملوں گا۔ورنہ چوں کہ تم نے سب کام بغیر میری حاضری کرلیا۔لہٰذا اب میں نہ آؤں گا۔امیر کبیر اور دیوان نے بمجبوری یہ شرط قبول کرلی۔اس وقت سے کرسیوں کا دربار شروع ہوا۔

اس بار ایک خریطہ صدر صوبہ دار ممالک ہند بنام شاہ دکن اس مضمون کا آیا کہ شاہزادۂ ولی عہد ملکہ معظمہ ہند برائے سیر و سیاحت ممالک مقبوضہ آرہے ہیں۔کل رؤسا باقتدار ہند فلاں روز و تاریخ معمورۂ بمبئی میں برائے استقبال شاہزادہ موصوف آئیں گے۔

آپ بھی اس مہمانِ عزیز کے استقبال کے واسطے بمبئی آیئے اور ضرور آیئے۔ اس کی بابت چند روز قبل اس دربار سے سرکار میں مراسلت ریج خیز الفاظ و عبارت میں ہو رہی تھی لفظ "سوزرین"[1] پر بحث آ کر پڑی، اِدھر مسٹر الیفانٹ جو نامہ نگار اخبار ٹائمز آف انڈیا رہ چکے تھے۔ ادیب لاجواب اور سید حسین صاحب اخبار نویسی کے مشّاق لیاقت میں ان کے ہمسر اُدھر فارین آفس میں معمولی لیاقت کے لوگ اونچی دوکان پھیکا پکوان ان دوا دیبوں سے دب کر تحکمانہ دھمکی پر آ گرے یعنی لکھنا شروع کیا کہ "ہم بجائے شاہان دہلی ہیں۔ پُرانے عہدنامہ جات موجودہ حالت سے مطابقت نہیں کرتے۔ لہذا ہمارے واسطے حجت نہیں ہیں۔" گویا باصطلاح حال (سکریپس آف پیپر Scraps of paper) ردی کاغذ ہیں۔ آخری مراسلہ اس مضمون سے ملتا جلتا آیا۔ اور بنام وکیل باشی یعنی رزیڈنٹ (مسٹر سانڈرس) حکم ہوا کہ سرِ دربارِ اعلیٰ حضرت بمبئی آنے کے واسطے مدعو کئے جائیں۔ اس غرض سے یہ دربار

---

[1] سوزرین وہ صاحب الامر تھا جس کی ماتحت چند ڈیوک و پرنس اپنے اپنے علاقوں پر مع فوج و لشکر خود مختارانہ قابض و متصرف تھے اور اپنے سوزرین کو وقتِ ضرورت پر ہر قسم کی مدد دیا کرتے تھے اور جب وہ باغی ہو جاتے تھے تو صاحب الامر اُن کی سرکوبی کرتا تھا۔ ایسے صاحب الامر کو اصطلاح میں کنگ (بادشاہ) کہتے تھے۔ امپرر و قیصر وہ تھا جس کے تحت میں چند بادشاہتیں ہوں۔ کنگ کے واسطے گزشتہ زمانے میں یور ہائنس آپ کا عالی مرتبہ یا ہز ہائنس اُس کا عالی مرتبہ لقب مقرر تھا بلکہ بسا اوقات ہز گریس اُس کی مکرمت بھی تعظیمی القاب تھا اور چند بادشاہتوں پر حکمراں کو امپرر یا امپریٹر کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ پس کنگ وہ تھا جو صرف اپنی قوم و ملک پر اس دعوے سے حکمراں تھا کہ میرا حق بادشاہت من جانب خدا تھا اور اس الٰہی عطیہ حق موروثی سے مجھکو کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اس کو اصطلاحاً (By Divine right) کہتے تھے۔ تاریخ یونان قدیم میں اس کو ٹائرنٹ (Tyrant) اور عربی میں جبار کہتے تھے اس زمانہ حال میں کنگ کو بھی ہز مجسٹی خطاب کرنے لگے اور اس سے کمتر مرتبہ والے کو مختلف القاب مثل رائل ہائنس یا سیرین ہائی نس محض بلا دلیل گھڑے اور گھڑتے جاتے ہیں چنانچہ رؤسائے ہند کو از کشمیر تا کماری بلا فرق مراتب سب ہائنس

منعقد ہوا۔ میں اور کپتان صاحب علی الصباح ڈیوڑھی مبارک میں پہونچے۔ مستحکم جنگ، تہنیت یار الدولہ وغیرہ بھی حاضر تھے آفتاب محل کے صدر دالان میں تخت بچھایا گیا۔ اس پر ایک سنہری کرسی رکھی گئی۔ تخت کے نیچے سیدھی طرف ایک کرسی کپتان کلارک صاحب کے واسطے اور دو کرسیاں پس پشت میرے اور مولوی صاحب کے واسطے رکھی گئیں۔ پائین تر سیدھی جانب رزیڈنٹ اور ان کے ہمراہیوں کے واسطے کرسیاں ڈالی گئیں۔ بائیں طرف امیر کبیر دیوان پیشکار و دیگر امرائے عظام کے واسطے بچھائی گئیں۔ راجہ گردھاری پرشاد پھولوں کے ہار و عطر دان و پان وغیرہ کی کشتیاں لئے ہوئے آفتاب محل کے پائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور پر نور آفتاب محل کے ایک حجرے میں بغرض تبدیل لباس رونق افروز تھے کہ اتنے میں آمد آمد امرا کی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے نواب امیر کبیر مرض الموت میں مبتلا چند مصاحبین کے سہارے سے بمشکل تمام آفتاب محل میں آکر دالان کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ حضور پر نور بار بار کنار حجرہ سے باہر آتے جاتے تھے۔ اور ہر بار مصاحبین نواب صاحب کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھاتے بٹھاتے تھے۔ میری جو شامت آئی میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ "حضور کھیلتے پھرتے ہیں آپ کیوں نشست و برخاست کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں؟" میری طرف کمال ترش روئی سے دیکھ کر جواب دیا "سبحان اللہ تم مجھکو بے ادب بنایا چاہتے ہو؟" نواب وزیر و دیگر امرا روبرو کے محل میں جمع ہو گئے۔ الغرض ہرکاروں نے خبر دی کہ بڑے صاحب کوٹھی سے سوار ہو گئے[1]۔ مستحکم جنگ اور معز الدین صاحب نے بہلا پھسلا کر حضور پر نور کو جلدی جلدی لباس پہنایا۔ پھر خبر آئی کہ تیھر گھٹی پر پہونچے اور پھر ہرکاروں نے اطلاع دی کہ چار منار پہونچ گئے۔ حضور پر نور کو بالائے تخت کرسی پر بٹھا دیا۔ ما مائیں پس پشت استادہ ہیں اور مولوی صاحب

---

[1] یہ دستور قدیم تھا کہ امرائے عظام جب درباروں میں یا برائے سلام یا حسب الطلب حاضر ہوتے تھے تو عرض بیگی ہرکاروں (دوندگان) کو سر راہ جستہ جستہ بٹھا دیا کرتا تھا اور یہ ہرکارے آکر اطلاع کرتے تھے کہ فلاں اب سوار ہوا اب چار منارہ یا فلاں جگہ پہونچا یہی دستور رزیڈنٹ کے واسطے بھی تھا۔

پیچھے کرسیوں پر کپتان صاحب بازو کی کرسی پر۔ بائیں طرف اوّل نواب امیر کبیر ایک کرسی پر اس کے بعد نواب وزیر اعظم۔ اس کے بعد نواب وقار الامرا۔ ان کے بعد مہاراجہ پیشکار۔ اسی طرح علی قدر مراتب امرائے عظام بیٹھ گئے۔ وزارت پناہ مع عرض بیگی وغیرہ عہدہ داران ڈیوڑھی مبارک رزیڈنٹ کے استقبال کے واسطے تا دروازہ گئے اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے آفتاب محل میں آئے۔ یہاں نواب وقار الامرا اور پیشکار صاحب تالبِ زینہ کھڑے ہوئے تھے۔ اول نواب وقار الامرا اور پھر مہاراجہ پیشکار رزیڈنٹ کے گلے ملے (یہ رسم گلے ملنے کی عہد اکبر شاہ میں ایجاد ابوالفضل کی تھی کہ اہل دربار ہندو مسلمان باہم گلے ملتے تھے تاکہ برادرانہ محبت میں ترقی ہو) اور دست گرفتہ تخت کے پاس لائے۔ یہاں اول رزیڈنٹ گڈ مارننگ Good morning حضور پُر نور سے کر کے نواب امیر کبیر سے گلے ملے۔ پھر کپتان صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد وہ اس کے ہمراہی یعنی ڈاکٹر اور افسران فوج وردیاں پہنے ہوئے علی قدر مراتب سیدھی جانب کرسیوں پر بیٹھے۔ مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ نے اول حضور پر نور کی مزاج پرسی کی۔ پھر خط پیش کر دیا۔ نواب وزیر نے اٹھ کر خریطہ لے لیا منشی دربار حاضر تھے آداب گاہ پر جا کر خریطہ بآواز بلند پڑھا۔ اس کے بعد رزیڈنٹ کی جو شامت آئی اس نے اوّل کپتان صاحب سے بامید تائید کہا کہ حضور کی ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔ اور سیر و تماشا بھی ہوگا۔ کپتان صاحب نے دونوں پاؤں ملنے کر کے کرسی پر پشت جما کر کمال بے پروائی جواب دیا کہ ”ہوا خوری سیر تماشا اپنی مرضی اور خوشی سے ہوا کرتا ہے نہ جبر اور قہر سے“ مسٹر سانڈرس یہ جواب سن کر بہت چکرائے اور اس امید سے کہ طفلگی میں عام شوق سیر و سفر کا ہوتا ہے۔ حضور پر نور سے بھی عرض کیا کہ ”حضور بمبئی کی سیر کرنی چاہیئے“ حضور پر نور صرف اس کا منھ تکتے رہے۔ امیر کبیر نے کہا کہ ”اگر جبر ہی ہے تو ہم لوگ تیار ہیں ورنہ بیگمات اور بالخصوص

جدۂ ماجدہ حضورِ پرنور کی جدائی ایک روز کی بھی نامنظور فرماتی ہیں چہ جائے کہ بمبئی کی اجازت دیں۔" رزیڈنٹ نے جواب دیا کہ بیگمات ساتھ چل سکتی ہیں۔ اس پر پیشکار صاحب نے جرأت کرکے جواب دیا کہ "جدۂ ماجدہ اس کبرسن میں اتنا دور دراز سفر نہیں برداشت کرسکتی ہیں۔" اس تمام گفتگو میں وزیر باتدبیر خاموش رہے۔ مگر راجہ گردھاری پرشاد کو اشارہ کیا وہ فوراً پاندان وہار وغیرہ سامنے لائے۔ نواب وزارت پناہ نے رزیڈنٹ کے گلے میں ہار ڈالا اور پاندان آگے کیا پیچھے چپراسی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پاندان لے لیا۔ مہاراجہ پیشکار نے ہمراہیوں کے گلے میں ہار ڈالا اور پاندان ہاتھ میں دے دیئے دربار برخاست ہوا۔ مگر قصّہ قائم رہا۔ رزیڈنٹ کی طرف سے سفر کا تقاضا ہوا۔ وزارت پناہ کی طرف سے تیاری سفر کی دھوم دھام ہونے لگی۔ مگر وزیر باتدبیر اور نواب امیر کبیر میں مشورے ہوتے رہے۔ بالآخر رزیڈنٹ کو اطلاع دی گئی کہ بیگم صاحبہ جدہ ماجدہ کا فرمان صادر ہوا کہ بندگانِ عالی حضورِ پرنور کو مرضِ گلو زمانہ شیرخوارگی سے لاحق ہے اور اطباء حاضر باش مرطوب ہوائے بمبئی میں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر ونڈو رزیڈنسی سرجن برائے دریافتِ چگونگیِ مرض وعام صحت حضورِ پرنور بھیجے گئے اور سفرِ بمبئی مثلِ جانورِ مذبوح تھرتھرا کر ٹھنڈا ہوگیا اور اس طرح نواب وزارت پناہ کو لفظ "سوزرین" کی بحث میں فارن آفس پر فتح میسر ہوئی۔ سانڈرس صاحب بے قصور معتوب ہوکر بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ سر رچرڈ میڈ جو بڑودہ کا کام تمام کرچکے تھے اب ہدایاتِ خاص برائے سزادہیِ وزیر نمک حلال بھیجے گئے۔

(۱) قدیر جنگ (۲) تہنیت جنگ (۳) مستحکم جنگ (۵) معز یار الدولہ

(۶) قوت یار الدولہ (۷) شہسوار جنگ (۱۰) بخشی سجان خاں (۱۲) اقبال یار جنگ

حضرت غفران مکاں میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس

مولوی مسیح الزماں خاں نواب شمس الملک ظفر جنگ نواب آغا مرزا بیگ سرور الملک

ابتدائی حالاتِ درس

کپتان جان کلارک ایک امیرزادہ اور امیرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ ہر انگریز یہ حتیٰ کہ خود رزیڈنٹ کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتے تھے کہ یہ بازاری لوگ امتحان میں اسناد حاصل کر کے ہند میں آتے ہیں۔ امیروں اور رئیسوں کی نشست و برخاست، رفتار گفتار، طریق معاشرت سے ناواقف خود بین و خود کام ہوتے ہیں۔ یہی حال کرنل نیول اور مسٹر لیفانٹ کا تھا۔ انگریزوں سے بہت کم ملتے تھے اور ملتے تھے تو بہ تکلف ملتے تھے اور اپنا ہاتھ بالا رکھتے تھے۔ کپتان صاحب مجھ پر اس قدر عنایت رکھتے تھے کہ بغیر میرے مشورہ کے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ یہی حال ان کی میم صاحبہ کا تھا۔ درس کے وقت خود خاموش بیٹھے رہتے تھے اور کسی کام میں دخل نہ دیتے تھے۔ میں ہر روز چند جملے ضروری حضور پر نور اور ظفر جنگ[1] کو سکھایا کرتا تھا۔ علاوہ اس کے معمولی ریڈر اور گرامر اور جغرافیہ اور حساب بہ پابندی اوقات و ایام شروع کر دیا تھا۔ صبح کو جاتا اور قریب دوپہر مکان واپس آجاتا۔ جب کبھی حضور پر نور یا ظفر جنگ درس میں کوتاہی کرتے تو منصب داروں کے بچوں پر غصہ آتا رہتا تھا۔ الغرض اپنے کام کا مختار اور ڈیوڑھی میں ہر دل عزیز بنا ہوا تھا کہ یکایک زمانے کا رنگ بدلنے لگا۔ سب سے پہلے شہادت مولوی محمد زماں خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی واقع ہوئی اور ان کی سچی دوستی سے میں محروم ہو گیا۔ اب اس کے بعد نواب شمس الامرا امیر کبیر عمدۃ الملک کا انتقال ہو گیا۔ اور ایک قدردان کم ہو گیا۔ اس کے بعد کپتان صاحب کی شکیلہ و جمیلہ پاک دامن اور ذی علم میم نے ایک اپنا

---

[1] نواب امیر کبیر خورشید جاہ کے فرزند حضرت افضل الدولہ کی شہزادی حسین الزمان بیگم کے بطن سے تھے۔ ظفر جنگ شمس الملک بتاریخ ۲۹ صفر ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۳ سال کی عمر میں ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۲۴ھ کو انتقال کیا۔

یادگار شیر خوار چھوڑ کر انتقال کیا۔ کپتان صاحب شکستہ دل اس شیر خوار کو لے کر ترک ملازمت کر کے انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ اب صرف وزارت پناہ سے اُمید قدر دانی و دستگیری رہ گئی۔ یہ زمانہ آرام و سکون و لطف کا نہ فقط میرے واسطے بلکہ تمام اہلِ بلدہ کے واسطے گم ہو گیا۔ اور اب وہ تشویش و غم و غصّہ کا زمانہ آیا اور وہ خود غرضوں کا ہنگامہ شروع ہوا کہ ہر کہ ومہ اپنی حفاظت کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ ڈیوڑھی مبارک کا حال مختصر یہ ہوا کہ جس قدر مولوی شہید دنیا و کار ہائے دنیا سے متنفّر تھے اسی قدر ان کے جانشین بھائی[1] دنیا و کاروبار دنیا کے حریص تھے۔ علاوہ درس کے جو اُن کا حقیقۃً فرضِ منصبی تھا، دیگر ہر قسم کے فرائض اپنے پاس جمع کر لئے۔ بغیر مولوی صاحب کے حکم تنکا ڈیوڑھی مبارک میں اِدھر سے اُدھر نہ ہونے پاتا تھا۔ کل اتالیق و مصاحبین حاضر باش و ملازمین ڈیوڑھی مبارک مولوی صاحب کے تیوروں کو تکتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو بھی اس قدر اپنی قوّت و اقتدار کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ نواب وزارت پناہ کو بھی رقیب سمجھنے لگے تھے۔ ایک میں بد دماغ نا عاقبت اندیش کوتاہ بیں ایسا تھا کہ ان کے دائرۂ حکومت و جبّاری سے باہر اور ان سے گریزاں رہا۔ اور وہ بھی میری چھوٹی سی قدر و منزلت گھٹانے میں اور ہر قدم پر تہتک کرنے میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ اور ہر وقت یہ کہتے تھے کہ "میں ان مرشد کے حالات سن چکا ہوں۔ یہ اگر شاہجہان آباد کے رہنے والے ہیں تو میں بھی شاہجہان پور سے آیا ہوں"۔ اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ نواب رشید الدین خاں[2] وقار الامرا اور بشیر الدولہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور بالآخر جنرل میڈ کی وجہ سے نواب وقار الامرا کامیاب ہوئے اور کل اعزاز و خدمات متعلقہ ڈیوڑھی مبارک اور خطابات شمس الامرا امیر کبیر پر قابض ہو کر

---

[1] مولوی مسیح الزماں خاں ۱۲

[2] بجائے اپنے بھائی نواب عمدۃ الملک شریک نائب ریاست بتاریخ ۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۲۹۴ھ میں مقرر ہوئے تھے ۱۲

نواب وزارت پناہ کے ساتھ شریکِ انتظامِ ریاست یعنی (Co-regent)
بنائے گئے اور یہ کل احکام فارن آفس سے حسب درخواست جنرل سر رچرڈ میڈ جاری ہوئے اور
نواب وزارت پناہ کو تسلیم کرنے پڑے اور اب وہ ہنگامہ آرائی شروع ہوئی جس کا اثر عام و
خاص خلق اللہ پر پڑا۔

سر رچرڈ میڈ ایک سپاہی منش جہاں دیدہ اور اپنی سرکار میں پورا مقتدر اور
قوی الاثر، معزز و معتبر آدمی تھا، اس نے نواب وزارت پناہ کی سزا دہی کے واسطے یہ طریقہ
اختیار کیا کہ ان کے دشمن قدیم امیر کو اُن کا شریک الخدمت بنا دیا۔ اس امیر بلند حوصلہ کے
پاس ایک کارگزار سچا خیر خواہ معاملات دنیا میں صاحب دستگاہ، انگریزی تحریر و تقریر میں
حسب لیاقت مستعد و چالاک پارسی بنام شاہ پورجی بقد میانہ گندم گوں گویا اس حصۂ پائگاہ کا
مدار کل مہام تھا۔ اس کے مقابلہ کا کوئی آدمی نواب وزارت پناہ کے پاس بھی نہ تھا۔ اس نے
بہت جلد نواب امیر کبیر اور رزیڈنٹ کو یک جان و دو قالب کر دیا اور نواب وزارت پناہ کی
سزا دہی کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ سب سے پہلے راجہ گردھاری پرشاد کے کارخانہ
آہنگران پر حملہ کیا گیا۔ چند بندوقیں اس کارخانہ میں تیار کی گئی تھیں۔ اس بنا پر نواب
وزارت پناہ پر فساد و نیت کی تہمت لگانے کی کوشش کی گئی۔ نواب امیر کبیر جنرل میڈ کے
ممنون و ساختہ و پرداختہ تھے۔ ہر امر میں ان کے معین و مددگار ہوئے۔ قدیم قاعدۂ ریاست کہ
"کوئی اہل بلدہ ملازم یا غیر ملازم بلا اجازت خاص سکندر آباد تو ایک طرف چادر گھاٹ
نہ جانے پائے"۔ بجد و کد توڑ ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ مجھ کو بھی حکم ہوا کہ ہر ہفتہ سر رچرڈ کی ملاقات
کو جا کر ہفتہ وار اعلیٰ حضرت کی تعلیمی حالت بیان کیا کروں۔ افسران فوج
بے قاعدہ یعنی جمعداران جمعیت و عرب رزیڈنسی میں طلب کئے گئے اور

تعلیم خاص ان کو دی گئی لیکن ملازمین وعہدہ داران وافسران محکمہ عدالت ومال ومتفرق صیغہ ہائے انتظامی پر پورا قابو نواب وزارت پناہ کا تھا اس واسطے کہ ان کی امید وبیم صرف ذاتِ واحد وزارت پناہ سے متعلق تھی پس وہ خواہ مخواہ پابندِ قواعدِ قدیمہ رہے۔ اور کپتان کلارک، ومسٹر الیفانٹ وکرنل نیول علانیہ طرف دار نواب وزارت پناہ کے اور مخالف رزیڈنٹ کے رہے۔ مسٹر الیفانٹ کے گریبان تک تو ہاتھ رزیڈنٹ کا پہونچ گیا۔ اور وہ شباشب حیدرآباد سے جانب بمبئی۔ پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے روانہ کردئیے گئے۔ باقی دوسرے یورپین صاحبان جواب ترکی بہ ترکی رزیڈنٹ کو دیتے رہے۔ اس وقت فقط شاہ پورجی صاحب کا طوطی بول رہا تھا اور ایک عام خیال بلدہ میں یہ تھا کہ اب وزارت کا قائم رہنا دشوار ہے ع

اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمی ماند

سر رچرڈ نے جب کامل انتظام اپنی دانست میں کرلیا اس وقت اس نے نواب وزارت پناہ کو اطلاع دی کہ "ایک مراسلہ خاص من جانب صدر صوبہ دار ممالک ہند آیا ہے آؤ اور سن جاؤ" نواب وزارت پناہ نے بعذرِ علالتِ مزاج رزیڈنٹ کو طلب کیا اور افسرانِ فوج یعنی جمعداران وغیرہ صاحبانِ جمعیت کو طلب کرکے ہدایاتِ مناسب ان کو دیں۔ روزِ ملاقاتِ عام جلوخانہ بیرونی عربوں پٹھانوں کی جمعیت سے بھر گیا اور جمعداران فوج مسلح آئینہ خانہ میں آبیٹھے۔ سر رچرڈ کی گاڑی جب جلو خانہ میں پہونچی۔ یہ مجمع خلاف توقع دیکھ کر متردد ہوا۔ جب آئینہ خانہ

۱؎ تعلیم خاص یہ تھی کہ یہ وزیر نمک حرام ہی ہز ہائی نس کو نا خواندہ رکھکر خود مالک ومختار بنا چاہتا ہے۔ لہذا تم سب لوگ کہ قدیم نمک خوار اس ریاست کے ہو ہرگز اس کی خود مختاری قبول نہ کرو سرکار ہند کہ سچی دوست اس ریاست و رئیس کی ہے اس کو معزول کرنا چاہتی ہے تم سب سرانِ فوج ہرگز اس کی طرف داری نہ کرو اور امیدوار قدر ومنزلت سرکار ہند کے رہو وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان سرانِ فوج نے وہاں سے واپس آکر کلی حال وزارت پناہ سے کہدیا اور جاں نثاری پر مستعد ہوگئے۔

میں پہونچا تو وزارت پناہ کو خلافِ دستورِ قدیم برائے استقبالِ رزیڈنٹ موجود نہ پایا۔ میر تہور علی کوکا آگے بڑھے اور کہا کہ نواب صاحب کا مزاج نصیبِ دشمناں علیل ہے۔ اب وہ جمعداروں کو وہاں ہتیار بند دیکھ کر زیادہ متردد ہوا اور تاڑ گیا کہ اس کی تعلیم کا اثر مطلقاً جمعداروں پر نہیں پڑا۔ اسی حالت ترددمیں وہ گلہیاری پر پہونچا۔ نواب وزارت پناہ تا دروازۂ کمرہ تشریف لائے اور رزیڈنٹ کا ہاتھ پکڑ کر خود کوچ پر بیٹھے اور اس کو روبرو کرسی پر بٹھایا۔ بعد معمول مزاج پرسی وغیرہ نواب صاحب نے اُس مراسلۂ خاص کے دیکھنے کی فرمائش کی۔ رزیڈنٹ نے عرض کیا کہ "اس وقت مزاج آپ کا ناساز ہے۔ بعد صحت آپ میرے ہاں تشریف لائیے۔ کل حالات عرض کروں گا۔" یہ سن کر وزیر روشن ضمیر مسکرائے اور کہا کہ "سر رچرڈ مجکو کل حالات معلوم ہیں" اور یہ کہہ کر جیب میں سے رومالِ دستی نکال کر فرش پر پھینک دیا اور کہا کہ "میری نگاہ میں اس خدمت کی اتنی بھی قدر نہیں ہے۔ جیسا یہ رومال ہے۔ میرے آقائے ولی نعمت نے مجھکو بغیر اس خدمت کے بھی حوائج دنیا سے مستغنی کر دیا ہے۔ مگر تم مجھ سے یہ خدمت نہیں چھین سکتے میرے مالک اور بادشاہ نے بوقتِ انتقال اپنے یتیم فرزند یا اقبال کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر یہ وصیت فرمائی کہ میں اس ہونہار ظل اللہ کی خدمت گزاری میں سر تک اپنا نثار کردوں، نہ میں گورنمنٹ کا محکوم اور نہ میں گورنمنٹ کی طرف سے اس خدمت پر سرافراز، البتہ تم زبردست ہو مجھکو گرفتار کر لے جاؤ۔ مگر اس کے نتائج خون خرابہ اور بربادی ریاست کی عند اللہ و عند الناس گورنمنٹ ذمہ دار ہے۔" دوران گفتگو میں یکایک دروازۂ کمرہ کو دھکا دے کر مقدم جنگ و غالب جنگ وغیرہما جمعداران اندر گھس آئے اور پکار کر کہا کہ نواب صاحب ہم اپنا سر نثار کرنے کو موجود ہیں ہم کو کیا حکم ہوتا ہے۔ اب جنرل صاحب کے ہوش باختہ ہوگئے مگر نواب صاحب نے نہایت ترش روئی سے جمعداران کو دھمکا دیا اور رزیڈنٹ سے معذرتاً

کہا کہ ”یہ وحشی جنگلی لوگ ہیں، بدتمیزی کے ساتھ اپنی خیر خواہی جتاتے ہیں۔ آپ وہ مراسلہ مجھکو دکھائیے اور جو جواب میں نے دیا ہے وہ گورنمنٹ کو لکھ بھیجئے۔ اور ان جمعداروں کی بدتمیزی پر کچھ خیال نہ کیجئے۔ میرے آقائے نامدار کی کل رعایا مجھ سے ایسی ہی محبت رکھتی ہے۔“ جنرل صاحب شاید یہ سمجھے کہ گورنمنٹ کو جو کرنا ہے، وہ تو آئندہ کرے گی مگر تمھارا تو ابھی فیصلہ ہے۔ کسی طرح اس مخمصہ سے نکل چلو۔ الغرض کچھ ایسا ہی سوچ کر جواب دیا کہ ”نواب صاحب آپ کا مزاج ناساز ہے اور رنج و غصہ بھی بہت ہے۔ دوسری ملاقات پر ملتوی رکھنا چاہیئے۔“ اور یہ کہکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر بیٹھ گیا۔ نواب صاحب سمجھ گئے اور خود اُٹھ کر تا درِ کمرہ اس کو پہونچا کر ارشاد فرمایا کہ ”میں تو مریض ہوں، میر تہور علی آپ کو سوار کرائیں گے۔ اور آپ کے ساتھ جائیں گے۔ کسی کی مجال نہیں کہ بلا میرے حکم کوئی انگلی بھی ہلا سکے۔“ یہ صحبت تو یوں ختم ہوئی۔

لیکن یہ زمانہ ایسا گزرا کہ نواب وزیر کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ گو اس جوان مرد کے پاس کوئی شاہ پور جی کا ہمسر خوش فکر اور چالاک نہ تھا مگر اس نے کمال مردانگی اور استقلال و صبر کے ساتھ یہ زمانہ گزارا منجملہ دیگر امور کے جس میں شدید خرابی کا اندیشہ پیدا ہوا درس تدریس حضرت بندگان عالی کا معاملہ بھی تھا۔ مولوی مسیح الزماں خاں کو ماتحتی نواب وزارت پناہ کی گراں گزرنے لگی تھی اور تمام ڈیوڑھی مبارک بلکہ ذاتِ بابرکاتِ حضور پُرنور پر قبضہ خود مختارانہ کرنے کی فکر پیدا ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں ان کو پورا موقع مل گیا یعنی نواب امیر کبیر نے یہ دعویٰ کیا کہ کل حاضر باشان ڈیوڑھی مبارک خاص دیوان کے لوگ ہیں جو ہر وقت حضور پرنور کے کان میں اس کی تعریف و توصیف پھونکتے رہتے ہیں۔ لہذا میرے منصبداروں اور مصاحبین میں سے بھی دو تین لوگ شب و روز ڈیوڑھی مبارک پر حاضر رہا کریں گے

(امر واقعی یہ تھا کہ سوائے میرے اور مولوی مسیح الزماں خاں کے اور سب اباعن جدٍ وابستگانِ خاص ڈیوڑھی مبارک تھے) پس ادھر نواب وزارت پناہ و کلارک صاحب ایک دل ہوئے۔ اُدھر رزیڈنٹ و امیر کبیر ہم زبان ہوئے۔ بالآخر ایک ڈاکٹر شاید محمد اشرف اور دو مصاحبین عبد المجید و معین الدین من جانب نواب امیر کبیر داخل کئے گئے۔ عبد المجید نہایت سیدھے سادے مسلمان تھے مگر معین الدین صاحب خاندان مشائخ اورنگ آباد کے رکن نہایت ہوشیار مع آرزو ہائے گوناگوں شاہ پورجی کا عمدہ آلہ تھے۔ بہت جلد مشیرِ خاص و معتمد دوست مولوی صاحب کے بن گئے۔ ایسے کہ یک جان دو قالب ہو گئے اور مولوی صاحب کو سبز باغ دکھا کر صفِ کارگزارانِ نواب امیر کبیر میں بھرتی کر دیا۔ نواب وزارت پناہ نے بھی تین آدمی اپنی جانب سے متعین کر دیئے۔ ایک میر ریاست علی فرزند میر تہور علی[1] اور دوسرے آغا ناصر شاہ شاید برادر زادہ آغا خاں اور تیسرے ایک فوجی ملازم گورنمنٹ ہند موسوم بہ مرزا محمد علی بیگ حسب سفارش آغائے مذکور۔ ان میں آغا ناصر شاہ تو ایک امیرانہ مزاج کے آدمی ہم نوالہ و ہم پیالہ مولوی سید حسین صاحب کے تھے اور میر ریاست علی مثل دیگر کل اہل بلدہ سیدھے سادے بھولے بھالے دنیا کی چالاکیوں سے ناواقف تھے۔ تیسرے صاحب انگریزی فوج کے رسائی دار نہایت دور اندیش و خوش فکر انگریزوں سے ربط پیدا کرنے میں مشتاق خوش لباس جامہ زیب اور معین الدین صاحب سے زیادہ امیدہائے فراواں دل میں رکھتے تھے، نیزہ بازی، تلوار بازی میں چالاک سواری اسپ میں شہسوار جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ یہ دونوں صاحب یعنی آغا ناصر شاہ بے پروا اور

---

[1] محبوب یار جنگ ناظم الدولہ ایڈیکانگ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں ان کے والد تہور علی کو کا نواب لائق جنگ اوّل کے تھے۔ انتقال بتاریخ ۲ شوال ۱۳۲۵ھ ہوا۔

محمد علی بیگ اپنی بہبودی کی فکر میں مبتلا۔ اب صرف میر ریاست علی مرد مقابل معین الدین صاحب و مولوی مسیح الزمان رہ گئے ؎

سینے کو مرے چاکِ جگر خیر سے وہ آئے
ناکے میں سوئی کے جنھیں تاگہ نہ پرو آئے

رہ گیا میں سو اوّل تو بخدمتِ شاگردی حضور پرنور مجھکو صرف درس تدریس سے سروکار، دوم جنرل میڈ کے درشت الفاظ کان میں گونج رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ سب حضرات ہر وقت کے حاضر باش، اور میں صرف چند ساعت کا ذمہ دار۔ باقی تمام اوقات اپنے مکان پر بے کار۔ کپتان صاحب یوروپین ہماری معاشرت سے ناواقف کار، سر رچرڈ میڈ کا یہ قول علانیہ کہ نواب وزارت پناہ کو حکمرانی کا یہ شوق ہے کہ حضور پرنور کو ناخواندہ اور جاہل رکھنا چاہتے ہیں تاکہ خود مزے اُڑائیں، ایک غریب مستحکم جنگ نہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، عقل و فراست میں صفر، مگر نہایت ایمان دار باوضع سچے خیر خواہِ شاہ و وزیر ہمیشہ اپنا دُکھڑا میرے اور کپتان صاحب کے سامنے رویا کرتے تھے۔ اس عرصہ میں نواب وزارت پناہ دورہ بین و خوش تدبیر جانب انگلینڈ[1] روانہ ہوئے اور مکرم الدولہ وپیشکار صاحب کو اپنی نیابت میں چھوڑ گئے۔ کپتان صاحب ان سے پہلے اپنے یتیم فرزند شیر خوار کو لے کر وطن روانہ ہو چکے تھے اب میں اکیلا رہ گیا۔[2] بے یار و مددگار ہر طرح کے اندیشوں میں گرفتار، سستی اور

---

[1] ۱۶ اراپریل ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ

[2] مجھ پر یہ زمانہ نہایت گراں گزرا۔ ایک بادشاہ جم جاہ اور ایک امیر زادہ ذی مرتبت جن پر رعب و داب ناممکن۔ صرف تدبیر سے کار برآری۔ مولوی صاحب اور کل اُن کے مددگار برسر مخالفت میری کم وقعتی کے درپے، نواب امیر کبیر وقار الامرا رشید الدین خاں کو ریذیڈنٹ ناآشنا اور اُن کے دربار میں نارسا مہاراجہ نریندر پیشکار مجھ سے ناواقف، صرف اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری شرم رکھی اور یہ زمانہ بکمال کامیابی ختم ہوا۔ ۱۲

کاہلی ایسی کہ اہلکاران ریاست اور امرائے عظام تک سے راہ ورسم نہ رکھتا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔ معلوم نہیں کہ میں نے کیوں کر وہ زمانہ بخیر و عافیت گزارا۔ جب وزارت پناہ سفرِ یورپ سے واپس آئے تو اپنے ساتھ کپتان کلاڈ کلارک برادر بزرگ کپتان جان کلارک کو ان کی جگہ پر مقرر کر کے لیتے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں کپتان صاحب مجھ سے کبیدگی کے ساتھ ملے[1] اور تا قیامِ حیدر آباد مجھ سے کشیدہ خاطر رہے۔ خود فوجی آدمی تھے اور کسی وجہ سے ایک ٹانگ ان کی از کار رفتہ تھی اور مثانہ کے مرض میں دائم المرض تھے۔ نہ طریق تعلیم سے واقف نہ عدمِ صحت کی وجہ سے کسی کام کے لائق، ہر وقت یہ وہم کہ مبادا مجھ سے لوگ زبان درازی کریں۔ سید حسین صاحب کی لیاقت کے سامنے میری کم لیاقتی کا خیال بلا تجربہ ولایت ہی میں بجائے خود قائم کر کے آتے ہی لفظ اُستادی سے انکار کیا اور اپنے تئیں لفظ سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) یعنی منتظم تعلیم سے مخاطب کیا۔ اور نواب وزارت پناہ سے باصرار فرمائش کی کوئی انگریز فن تعلیم کا تجربہ کار ان کی مددگاری میں مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ایک مسٹر ڈیوڈسن[2] نامی جوان عمر اس خدمت پر مقرر کر دئیے گئے۔ وہ ایک کھیل کود کا آدمی تھا۔ اس نے بھی تمام کام مجھ پر چھوڑ دیا اور محض خوش قسمتی سے میرا یار بن گیا۔ مگر اس کی بھی عمر نے وفا نہ کی اور چند ہی ماہ کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس کے بعد مولوی نذیر احمد نے کپتان صاحب سے راہ ورسم پیدا کی۔ یہ صاحب دہلی کے قریب کے قصبہ کے رہنے والے انگریزی سرکار میں سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ دار، صاحبِ تصانیف کثیر، پنشن لے کر حیدر آباد میں بعہدۂ صدر تعلقداری سرفراز تھے۔ سن رسیدہ نہایت

---

[1] کپتان صاحب کے کان میری کم وقعتی اور کم لیاقتی کے بابت پہلے ہی سے انگلینڈ میں بھر دیئے گئے تھے ۱۲

[2] ان کا بتاریخ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں تقرر ہوا اور ۴ شوال ۱۲۹۷ھ کو انتقال کر گئے ۱۲

چست وچالاک کپتان صاحب کو بہت جلد گونڈے پر لگا لیا اور خوش خط قلمی رسالے اصطلاحات
صیغۂ مال وضوابطِ مال گزاری صاف سیدھے اُردو زبان میں خود تالیف کرکے کپتان صاحب کو
دیئے اور یہ قرار پایا کہ درس انگریزی کے ساتھ ملکی انتظام کی بھی تعلیم دی جائے۔ اُدھر رزیڈنٹ
کو خود وزارت پناہ پر اعتراضات تھے اور مولوی صاحب علامۂ دہر سرکار انگریزی کے پنشن یافتہ
قابلِ اعتماد، وہ بھی ہم رائے کپتان کلاڈ کلارک ہو۔ اور خواہ مخواہ امیر کبیر کو بھی ہم رائے
رزیڈنٹ ہونا پڑا اگرحق بات یہ ہے کہ شاہ پور جی نے نہایت کوشش کی کہ رزیڈنٹ کی رائے
کو بدلے۔

الغرض اب وزارت پناہ کو بمجبوری یہ تقرر منظور کرنا پڑا اور میں جب حسب معمول
ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بکمالِ شفقت میرے آنسو پوچھنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ مولوی
کا تقرر تو ہوگیا مگر آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کلارک صاحب اوقات درس تقسیم کردیں گے۔
میں نے جواب دیا کہ مجھکو سرکار کی خدمت گزاری سے غرض ہے جو کام مجھکو سپرد کیا جائے
بسروچشم حاضر ہوں۔ ادھر کپتان صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل مولوی صاحب اپنا کام
شروع کردیں گے آپ اور وہ مل کر تقسیم اوقات کرلیں۔ مولوی صاحب کے ہاں یہ
حال تھا کہ تقرر سے ایک روز قبل ہی تمام خدماتِ ڈیوڑھی مبارک کو نام بنام اپنے رشتہ داروں
اور ہوا خواہوں میں بانٹ چکے تھے۔ اور سوائے مولوی امین الدین خاں و عنایت الرحمٰن خاں
کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی خوشامد اور مبارکبادی کے واسطے
نہ گیا۔ ایک دربارِ عظیم الشان ان کے ہاں قائم ہوگیا۔

اب حکایتِ عجیب یہ سنئے کہ ایک بزرگ نہایت سن رسیدہ کسی طرف سے حیدرآباد
میں وارد ہوئے۔ اور میرے مکان میں چند ماہ سے مقیم تھے۔ باوجود کبر سن راست قامت

نواب شمس الملک ظفر جنگ بہادر

چست و چالاک گندم رنگ، اکھرا جسم میانہ قد، لباس ترکی در بر، گیسو دراز، ریش سفید نہ کوتاہ نہ دراز، اُردو زبان سے ناواقف، فارسی زبان میں کمال درجہ فصیح، مسائل صوفیہ جس وقت بیان کرتے تو گویا مُنھ سے پھول جھڑتے۔ بعد عصر اکثر اوقات وعظ فرماتے اور سامعین کو اپنا شیدا کر لیتے۔ میں اس دن نواب صاحب کے پاس سے آکر ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور چاء خوری ہو رہی تھی کہ ایک شخص دہلی کے میر رحمت علی نامی مجھ سے ملنے آئے اور بآواز بلند مجھ سے کہا کہ "مرگِ نو مبارک ہو۔ اب تمھارا ڈیوڑھی مبارک میں ٹکنا محال ہے۔ وہاں تو کارخانجات تقسیم ہو گئے"۔ شاہ صاحب نے فقط "مرگ نو" سن کر حیرت سے مجھ سے پوچھا کہ "ایں چہ می گوید۔ میر رحمت علی نے تمام حال ان سے بیان کر دیا۔ شاہ صاحب کو کمال صدمہ ہوا اور کچھ دیر خاموش و ساکت رہ کر اپنی ڈارھی پکڑی اور مجھ سے کہا کہ "مرزا تم خاطر جمع رکھو وہ ڈیوڑھی میں نہ آنے پائے گا"۔ اس پر میر رحمت علی ہنس پڑے۔ شاہ صاحب نے حالتِ غضب میں یہ کہا کہ "واللہ اگر نذیر احمق کل ڈیوڑھی میں آیا تو میں یہ ڈارھی منڈوا ڈالونگا"۔ شاہ صاحب کو غصے میں دیکھ کر میر رحمت علی بھی چپ ہو گئے۔ نو دس بجے رات تک شاہ صاحب کے تیور بدلے رہے اور ایک حالتِ سکوت میں رہے۔ خلاصہ ایں کہ علی الصباح میں سب سے پہلے ڈیوڑھی مبارک میں پہونچا۔ اور مستحکم جنگ کو حضور پر نور کے برآمد کرنے کے واسطے بھیجا۔ کپتان کلارک اور مولوی نذیر احمد کا انتظار کرتا رہا۔ اب درس کا وقت بھی آگیا۔ حضور پر نور بھی برآمد ہوئے۔ ظفر جنگ بہادر بھی آگئے۔ مگر وہ دونوں صاحب نہ آئے۔ میں نے اس خیال سے کہ وقت بے کار نہ جائے درس شروع کر دیا۔ عرصۂ دراز کے بعد کپتان صاحب کا خط آیا کہ آپ درس ختم کر کے جلد میرے پاس آیئے۔ درس کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ خانساماں نے دوپہر کے خاصے کے واسطے میز بھی تیار کر لی تھی حضور پر نور

اور ظفر جنگ بہادر میز پر تشریف لائے۔ میں اور مستحکم جنگ شریک خاصہ ہوئے۔ بعد تناول خاصہ مستحکم جنگ نے مجھ سے کہا کہ "مولوی مسیح الزماں خاں تو دنیا کی اماّ تھے اب دنیا کا باپ آتا ہی۔ مگر تعجب ہی کہ اب تک نہیں آیا" میں بھی دریائے حیرت میں غرق کپتان صاحب کے پاس پہونچا وہ غیظ و غضب کی حالت میں پریشان حال مجھ سے ملتے ہی بولے کہ "امیر کبیر نے مجھ کو بڑا دھوکا دیا۔ اور عامہ خلائق میں مجھکو رسوا کیا۔ یہ خط وزیر اعظم کا پڑھو" اس میں لکھا تھا کہ "نواب امیر کبیر بہادر نے تقرر مولوی نذیر احمد کا نامنظور فرمایا آپ ان کو ڈیوڑھی مبارک میں نہ نے جایئے" اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "میں رزیڈنٹ کے پاس بھی گیا تھا۔ کل تک تو وہ میرے ممد و معاون تھے آج مجھی پر پلٹ پڑے اور کہا کہ تم لوگ آپس میں لڑکر مجھکو ستاتے ہو کیا ضرورت ہی کہ ایک پردیسی آدمی خلاف مرضی نواب امیر کبیر بہادر ڈیوڑھی مبارک میں مقرر کیا جائے۔ لہذا یہ میرا استعفا نواب صاحب کو لے جاکر دے دو اور کہدو کہ اگر نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ آئے گا تو میں بھی خدمت سے دست بردار ہوں" میں نے کہا کہ "مجھکو اس جھگڑے میں نہ ڈالئے ناحق بدنام ہوجاؤں گا" مگر ان کے اصرار سے مجبوراً نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت" مگر نواب امیر کبیر بہادر کو یہ حرکت زیبا نہ تھی اور کلارک صاحب کی بھی یہ ہٹ اور ضد ناحق ہے۔ کل شب کو عبد المجید اُن کا وکیل میرے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر نذیر احمد صبح کو ڈیوڑھی میں گیا تو میں شہر چھوڑ کر باہر نکل جاؤں گا" اس کے بعد سر رچرڈ میڈ کا خط آیا کہ نذیر احمد ڈیوڑھی نہ جانے پائے۔ وہاں سے میں مکان پر آیا۔ شاہ صاحب سراسیمہ پریشان ادھر سے اُدھر جلدی جلدی ٹہل رہے تھے۔ مجھکو دیکھتے ہی بولے کہ میری ڈارسی بچی یا منڈھی۔ میں نے

تمام حال ان سے بیان کیا۔ وہ اُس ہی وقت سجدۂ شکر بجالائے اور مجھ سے کہا۔ "مرزا خوش باش حافظِ حقیقی تمہارا نگہبان ست"

یہ آفت بھی اس طرح ٹل گئی مگر چونکہ مشہور تھا کہ کپتان کلاڈ کلارک مجھکو ناپسند کرتے ہیں۔ ایک اور شخص کو ہوس میری خدمت کی پیدا ہوئی۔ یہ شخص دوست محمد خاں نامی ایک معمولی آدمی دہلی کا رہنے والا سررشتۂ تعلیمات عامّہ میں ملازم تھا۔ کچھ اردو فارسی جانتا تھا۔ کچھ انگریزی گھر میں پڑھ لی تھی۔ ایک مختصر گرامر انگریزی کی اردو میں لکھ کر کپتان صاحب کے پاس لے گیا اور سید حسین صاحب نے اس کی تعریف بھی کردی۔ اب کلارک صاحب نے وزارت پناہ سے دوست محمد خاں کے تقرر کی بابت فرمائش بلکہ تقاضا شروع کردیا۔ مگر اتفاقاً وہ غریب کسی مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ یہ بلا اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس طرح دفع فرمائی۔ اب ایک نیا شوشہ کھڑا ہوا کہ ادھر کپتان صاحب کے دل میں گویا ولایت ہی میں میری نسبت برے خیالات دل نشیں کردیئے گئے تھے اور ہر وقت جستجو ایک جدید آدمی کی تھی اور ادھر سر رچرڈ میڈ کو شکست ہوئی تو وہ حسب ہدایت فارن آفس نواب وزارت پناہ کی ہتک کے اور بھی درپے ہوگئے اور شاہ پور جی اور نواب امیر کبیر کو پوری اُمید اپنی کامیابی کی ہوگئی۔ اسی سلسلہ میں قرار پایا کہ جو تعلیم حضور پُرنور کی ہوئی ہے اس کا امتحان لیا جائے اور اس میں خود کلارک صاحب بھی باصرار شریک رائے ہوگئے۔ نواب وزارت پناہ بہت متردد ہوئے مگر میں نے ان کا پورا اطمینان کردیا۔ البتہ یہ شرط لگائی کہ ایماندار ممتحن مقرر کیئے جائیں چنانچہ انگریزی ادب وغیرہ کے واسطے مسٹر کرونؔ[1] پرنسپل

---

[1] تاریخ تقرر ۲۲ شوال ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء

مدرسۂ عالیہ اور ایک ہندو عہدہ دار محکمہ تعمیرات عامہ جو عالی خاندان سن رسیدہ دیانت دار آدمی تھے اور مخاطب بخطاب رائے صاحب تھے ارتھ میٹک یعنی حساب کے واسطے بھیجے گئے اوّل ہی روز امتحان میں حضور پر نور نے بکمال استقلال گرامر اور ریڈر کے ہر سوال کا جواب عطا فرمایا اور بلہجۂ مناسب عبارت بھی پڑھی ظفر جنگ شاید مرعوب ہو گئے کہ کئی جگہ اٹک اٹک کر رہ گئے جغرافیہ میں نقشہ پر کل مقامات دونوں صاحبوں نے بتا دیئے۔ تاریخ میں بھی اچھے رہے مسٹر کرون کو بہت تعجب ہوا۔ دوسرے روز رائے صاحب جامہ و نیمہ سے آراستہ جامہ کے بندوں کے گچھے کے گچھے سینہ پر لٹکتے ہوئے، باوجود کبرسن راست قد چہرہ سے وجاہت عیاں، حاضر ہوئے۔ اور جمع، تفریق تقسیم و ضرب کے سوالات کئے۔ بفضلہ تعالیٰ حضور پر نور نے سب سوالات کا جواب صحیح عطا فرمایا۔ کلارک صاحب حیرت میں رہ گئے اور وزیر با تدبیر کے بدخواہوں کو ایک اور زک نصیب ہوئی۔ اس پر بھی کلارک صاحب نے اپنی جستجو کو موقوف نہیں کیا۔ اب میں نے خود درخواست کی کہ میرے ساتھ کوئی لائق شخص شریک کر دیا جائے اور مرزا نثار علی بیگ جو صیغہ تعلیمات صوبہ آگرہ میں ڈپٹی کلکٹر اور اب پنشن یافتہ تھے اور گورنمنٹ کی طرف سے مصر و قسطنطنیہ وغیرہ ممالک میں بغرض دریافت قواعد و ضوابط و اصول تعلیمات عامّہ بھیجے گئے تھے انگریزی فارسی اور بالخصوص عربی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ قدیم زمانہ کے مراسم دربار خاندانِ مغلیہ سے واقف تھے اور صوفی صافی پاک طینت تھے۔ ان کو حیدر آباد میں طلب کر کے وزارت پناہ کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب وزارت پناہ ان کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔ مگر کپتان صاحب نے ان کی کبرسن اور خمیدہ قامت پر اعتراض کیا اور بالآخر مسٹر کرون کو اس امید پر مقرر کرایا کہ بہت جلد مجھ میں اور مسٹر مذکور میں نااتفاقی ہو جائے گی۔ مگر مسٹر کرون اور میں پہلے بھی

شریک خدمت اور خواجہ تاش رہ چکے تھے۔ اور وہ میرے معرف تھے لہذا ان میں تاختم تعلیم نہایت اخلاص واتفاق رہا۔ اور میری طرزِ تعلیم کو پسند کرکے کل کام انھوں نے میرے سپرد کردیا۔ جس کی وجہ سے خود ان میں اور کپتان صاحب میں نااتفاقی ہوگئی اور تاختم تعلیم قائم رہی۔

مگر مولوی مسیح الزماں خاں کے حملے مجھ پر جاری رہے اور چوں کہ نواب امیر کبیر کو انھوں نے پشت پناہ بنالیا تھا یا بحسن کارگزاری معین الدین وشاہ پور جی نواب امیر کبیر نے ان کو درگھسیٹا تھا۔ بہرحال وہ نواب وزارت پناہ کے مقابلہ پر علانیہ آگئے۔ اب انھوں نے درخواست کی کہ ان کو انتظامات ڈیوڑھی مبارک سے فرصت نہیں لہذا دو مددگار ان کو دیئے جائیں۔ چنانچہ ایک صاحب سن رسیدہ شاید مولوی اشرف علی چڑیا کوٹی اور دوسرے مولوی انوار اللہ ایک نوجوان ذی علم و ذی وجاہت پاک طینت سیدھے سادے سچے مسلمان مددگار مقرر کئے گئے۔ میں نے دیکھا کہ حضور پر نور کا وقت تعلیم فارسی میں مفت رائیگاں جارہا ہے۔ ہفتہ میں شاید دو تین مرتبہ نشست کی نوبت آتی ہوگی اور وہ بھی نہایت مختصر۔ یہ دونوں مددگار مولوی صاحب کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضور پر نور درس میں رونق افروز ہوئے اور جیب سے کوئی چیز مثل انگشتری وغیرہ گراں قیمت نکال کر ارشاد ہوتا کہ یہ میں آپ کے واسطے لایا ہوں اور مولوی صاحب کے انکار پر باصرار عطا فرما دیتے۔ میں نے بمشورہ مسٹر کرون اپنے وقت میں اُردو درس شروع کردیا۔ اور بعدۂ سہ پہر کو منشی مظفر الدین صاحب کے وقت پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس وقت تک سوائے مشق الف۔ بے اور کچھ زائد منشی صاحب قدم نہ بڑھا سکے تھے اور حضور پر نور صرف دو چار حروف کے کٹ کہنیوں پر قلم پھیر کر تختی رکھدیا کرتے تھے۔ منشی صاحب فن خوش خطی میں اپنا جواب نہ فقط حیدرآباد میں بلکہ دُور دُور ممالک ہند میں نہ رکھتے تھے۔ اس وقت کی

شرکت میں خود مجھکو بھی بڑا فائدہ ہوا کہ حروف کی نشست و کرسی وغیرہ خوشنویسی کے کچھ قاعدے مجھکو بھی آ گئے۔ الغرض اس طرح میں نے حضور پر نور کی نوشت و خواند اُردو کو درست کر دیا۔ میری یہ مداخلت مولوی صاحب کی نگاہ میں بے جا قرار پائی اور چوں کہ بے باک ہو گئے تھے ایک روز صبح کے ناشتہ کے وقت بر سر میز مجھکو اور کلارک صاحب کو او مسٹر گرون کو الفاظ شدید سے علانیہ سرفراز فرمایا۔ کلارک صاحب بگڑ کھڑے ہوئے لیکن رزیڈنٹ نے بوجہ سفارش امیر کبیر مولوی صاحب کی تائید کی۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ نواب وزارت پناہ اور نواب امیر کبیر اور مہاراجہ پیشکار ڈیوڑھی مبارک میں حاضر ہو کر بعد تحقیقات کیفیت پیش کریں۔ کل حاضر باش مولوی صاحب اور نواب امیر کبیر سے مرعوب ہو کر الگ ہو گئے اور اپنی لاعلمی اور اس وقت پر غیر موجودگی ظاہر کی۔ اب میں اور ریاست علی رہ گئے۔ کمیٹی سے پہلے رزیڈنٹ نے مجھکو طلب کیا۔ میں نے کل واقعات صاف صاف بیان کر دیئے اس پر رزیڈنٹ نے کہا کہ "تم یہ کہتے ہو اور میں نے یہ سنا ہے۔ یہ لڑائی کلارک صاحب کے واسطے نہایت نازیبا ہے۔" اس کے بعد مجھکو نواب امیر کبیر نے یاد فرمایا وہاں بھی میں نے صاف صاف حالات بیان کر دیئے۔ نواب صاحب یہ سن کر نہایت برہم ہوئے اور فرمایا کہ "تم کو ایسی باتوں سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب کیوں کلارک صاحب کو لنگڑا تیمور کہنے لگے۔ کیا تم کمیٹی میں بھی یہی کہو گے۔" میں نے عرض کیا "سوائے اس کے اور میں کیا کہہ سکتا ہوں" اس پر شاہ پور جی نے کہا کہ "تم بر وقت طلب حاضر ہی نہ ہو اور کوئی عذر کر دو" بالآخر یہ قرار پایا کہ "ہم تم کو طلب ہی نہ کریں گے" اور آپس میں مشورہ کر کے اس قصہ کو رفع دفع کر دیں گے۔ اس کے بعد نواب وزارت پناہ نے مجھکو یاد فرمایا۔ میں نے کل حالات مع گفتگو رزیڈنٹ و نواب امیر کبیر عرض کر دیئے۔ نواب صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور فرمایا کہ "تم کس طرح بچ سکتے ہو۔" میں نے عرض کیا "میر ریاست علی

موجود ہیں میری کیا ضرورت ہے"۔ فرمایا " ریاست علی کو خود امیر کبیر نے میرا طرف دار قرار دے کرنا منظور کر دیا"۔ خلاصہ این کہ روز مقررہ صبح کے وقت تینوں امرائے ذی شان راگ مالا میں جمع ہوئے حضور پر نور درس کے واسطے برآمد ہوئے میں جلدی جلدی ابر کی ترشح میں بھیگتا ہوا راگ مالا کی طرف نکلا۔ نواب وزارت پناہ نے مجھکو دیکھ کر اخباری کو حکم دیا کہ آغا مرزا بیگ سے کہو کہ پہلے یہاں حاضر ہوں۔ نواب امیر کبیر نے فرمایا " ان کے حاضر ہونے کی کچھ ضرورت نہیں"۔ باہم تکرار ہو رہی تھی کہ میں وہاں پہونچا اور ان تینوں صاحبوں کو سلام کر کے بیٹھ گیا۔ مہاراجہ پیشکار نے نواب امیر کبیر سے کہا کہ " ان کا بیان لینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ فیصلہ تو ہم لوگ کریں گے"۔ اس پر نواب امیر کبیر نے فرمایا کہ " یہ بھی تو لاعلمی ظاہر کرتے ہیں"۔ اس پر نواب وزارت پناہ نے مجھ سے پوچھا کہ " کیا آپ کو اس معاملہ کا کچھ علم نہیں ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ " جب میں صاحب عالی شان بہادر کے روبرو اور آپ کے روبرو کل حالات بیان کر چکا ہوں تو اب کس طرح انکار کر سکتا ہوں"۔ یہ سن کر نواب امیر کبیر نے غضبناک ہو کر نواب وزارت پناہ سے کہا کہ " یہ سب تمھاری سازش ہے۔ اور مجھکو شرمندہ کرنے کے واسطے انہیں یہاں بلایا ہے"۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی غصہ میں دالان کے باہر بارش شدید میں چلے گئے۔ نواب وزارت پناہ نے اپنے اخباری کو بارانی دے کر پیچھے دوڑایا وہ بارانی بھی نواب صاحب نے پھینک دی اور مینھ میں بھیگتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر دولت خانہ روانہ ہو گئے۔ میں نے دست بستہ نواب وزارت پناہ سے کہا کہ " کیا یہ خفگی مجھ غریب پر ہوئی ہے"۔ مہاراجہ ہنس پڑے اور کہا کہ " تم کس گنتی میں ہو ہم معتوب ہوئے ہیں"۔ بہرحال یہاں بھی مخالفین نے شکست پائی۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے ایک نئی شطرنج بچھائی یعنی یہ مشہور کیا کہ حضور پر نور کو

سوزاک ہوگیا ہے۔ اور یہ خطا نواب وزارت پناہ کی ہے کہ حضور پرنور کو محلات میں رکھا۔ جہاں میری نگرانی ناممکن ہے۔ اب رزیڈنٹ نے بڑے زور شور سے نواب وزارت پناہ کو پوچھا اور حکیم باقر علی خاں کی کہ صدر حکیم باشی تھے پوری شامت آگئی۔ اُدھر محلات مبارک نے غل مچایا کہ یہ کیا بے حیائی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ادھر کلارک صاحب بھڑ گئے کہ ان جھگڑوں میں کیوں کر تعلیم حضور پرنور کی ہوسکتی ہے۔ الغرض ڈاکٹر لا (Doctor Law) رزیڈنسی سرجن دیکھنے کے لئے بھیجے گئے۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا انتقال ہوگیا تھا حکیم باقر علی خاں اور ڈاکٹر غلام دستگیر و محمد وزیر علی حاضر تھے۔ ڈاکٹر لا نے مجبوراً رپورٹ کی کہ حضور پرنور کو کوئی مرض نہیں مگر نہایت کمزور اور لاغر ہیں۔ یہ غفلت حکیم باشی کی ہے یہاں بھی نواب وزارت پناہ فتح یاب ہوئے۔ مگر مولوی صاحب کا مطلب حاصل ہوگیا یعنی مہتاب محل میں شب و روز قیام حضور کا قرار پاگیا۔ کبھی کبھی محلات میں جانے کی اجازت ملتی تھی۔ مولوی صاحب مع اپنے ہوا خواہوں کے شب و روز مہتاب محل میں مقیم رہتے اور پورا قبضہ ذاتِ بابرکات حضور پرنور پر کرلیا۔ صرف درس کے اوقات میں سلیمان جاہ کی حویلی میں میرے پاس رونق افروز ہوتے باقی شب و روز مولوی صاحب اور ان کے ہوا خواہوں کی صحبت رہتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر نواب وزارت پناہ نے مجھ کو بھی نشست میں حاضر رہنے کا حکم دیا اور میرے بال بچوں کی نگرانی کے واسطے میرے خسر نواب مرزا غلام فخر الدین خاں کو دو سو روپیہ منصب سررشتہ دیوانی سے عطا فرماکر میرے پاس متعین فرما دیا۔[1] چند روز بعد حضور پرنور کا قیام چوک محلہ میں بھی

---

[1] اس کی بہت ضرورت تھی محلہ چنچل گڑھ خاص بستی مہدوی پٹھانوں کی تھی اور بوجہ شہادت مولوی محمد زماں خاں اور نیز اس وجہ سے کہ بلدہ میں اس کی آمد و رفت کی ممانعت تھی۔ لہذا اہل سنت و جماعت میں اور ان میں دلی رنجش پیدا ہوگئی تھی ۱۲

نامناسب قرار پایا۔ اب نواب وزارت پناہ کو موقع چھیڑ کا مل گیا۔ رزیڈنٹ کو لکھا کہ اصل رزیڈنسی کا مقام بلارم میں ہے۔ چادر گھاٹ میں کوٹھی صرف بوقت ضرورت برائے قیام مستعار دی گئی تھی لہذا کوٹھی خالی کیجیے۔ تاکہ وہ حضور پرنور کی تعلیم گاہ قرار پائے۔ سر رچرڈ نے اس کو منظور کر لیا مگر افسوس کہ محلات مبارک اور بالخصوص حضرت جدۂ ماجدہ نے محض بہ تحریک نواب امیر کبیر حضور پرنور کا وہاں رہنا نامنظور کر دیا۔ لہذا پُرانی حویلی[1] میں قیام گاہ و مدرسہ کا انتظام کیا گیا اور محلات کو وزیر با تدبیر کی طرف سے مشکوک کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ یقین دلایا گیا کہ نواب وزارت کا منشا یہ تھا کہ حضور پرنور کو انگریزوں کے سپرد کرکے خود حکومت کے مزے اُڑائیں۔

چند روز جو حضور پرنور مہتاب محل میں زیر نگرانی مولوی صاحب و حاضر باشان نواب امیر کبیر رہے تھے تو ماماؤں کو بھی انعام و اکرام سے خوب ہموار کر لیا تھا۔ اب اندر باہر وزیر کی بُرائی اور امیر کبیر کی بھلائی ہر وقت سمع مبارک میں پہنچنے لگی۔ حتیٰ کہ اس کا اثر بھی ظاہر ہونے لگا۔ رات کے خاصہ مبارک پر بادشاہ پورجی کی ہونے لگی۔ میر ریاست علی بچارے معین الدین صاحب کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ آغا ناصر شاہ امیرزادہ امیرانہ خیال کے آدمی ملانے جلانے سازش وغیرہ کے رستوں سے ناواقف تھے۔ مرزا محمد علی بیگ کی یہ حالت تھی کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ اپنی آیندہ زندگی سنبھالنے کی فکر میں ہمہ تن مصروف تھے

---

[1] پُرانی حویلی یا حویلی قدیم شہر کے شرقی دروازہ دبیر پورہ اور محلہ دارالشفاء کے قریب واقع ہے۔ حضرت غفران مکان زیادہ تر اسی محل میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ تحریک یہ تھی کہ حضرت غفران مکان کو وزیر سے دُور بلارم میں رکھا جائے۔ نواب صاحب نے جو مراسلت رزیڈنسی سے ہوئی تھی وہ مولوی مسیح الزماں خاں کو بھیج کر لکھا تھا کہ مولوی صاحب اپنے اثر سے محلات کو راضی کریں حضور پرنور بلارم میں نہ رہیں۔ نواب صاحب کا یہ خط بنام مولوی مسیح الزماں خاں مورخہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ ہجری "حیات مسیح" مصنفہ سید مظفر حسین صاحب میں نقل ہے ۱۲

رہ گیا میں اور کلارک صاحب و مسٹر کرون وہ دونوں صاحب یوروپین تھے نہ ان کو موقع اور نہ ان میں صلاحیت کارہ میری یہ حالت کہ متواتر بدسلوکی کی برداشت نہ ہو سکی اور اپنی نشست موقوف کر کے صرف درس کے وقت یا صبح کو میز اور شب کو دسترخوان کی حاضری پر قناعت کر لی ذیل کے واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کہاں تک مخالفین کو کامیابی ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز بریک فاسٹ کی میز پر کلارک صاحب تصاویر کی کتاب یعنی البم لے کر بیٹھے اور مختلف اشخاص کی تصویریں دکھا کر نواب وزارت پناہ کی تصویر بالفاظ تعریف و مدح پیش کی۔ مگر حضور پرنور نے وہ البم اٹھا کر پھینک دی۔ کلارک صاحب کی غیر حاضری میں برائے چند روز میجر ولسن اول مددگار رزیڈنٹ اس خدمت پر مصرمانہ یعنی بطور قائم مقام بھیجے گئے۔ نواب امیر کبیر نے ان کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ آغا مرزا بیگ کو میں ناپسند کرتا ہوں لہٰذا ان کی جگہ پر دوسرا آدمی تلاش کیا جائے۔ میجر ولسن نے مجھ سے اس کا ذکر کیا میں نے اس خیال سے کہ ع ازاں پیش بس کن کہ گویند بس

خود استعفا لکھ کر نواب وزارت پناہ کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب صاحب نے بعد کلمات عنایت مہربانی استعفا نامنظور فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ اس سے زائد مشکلات آنے والی ہیں۔ مرد میدان رہنا چاہیئے۔ اور یہ فرمایا کہ استعفا نواب امیر کبیر ہی کو بھیجا کر دو۔ میں مجبوراً نواب امیر کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب بیمار تھے اور ابتدا مرض الموت کی تھی[1] پشا پورجی سے ملاقات ہوئی اس شریف آدمی نے خود جا کر میری اطلاع کی اور مجھ کو اوپر بالاخانہ پر بلا لیا۔ نواب صاحب دستار سر انگرکھا دکھنی در بر ضعف بیماری کی وجہ سے تکیوں کے سہارے سے سیدھے تنے ہوئے مونچھیں چڑھی ہوئی بیٹھے تھے۔ مسند کے پاس ڈھال تلوار بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا بے رخی سے

---

[1] ۱۰ رجادی الثانی ۱۲۹۸ھ

سلام لے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا "کیوں آئے ہو؟" میں نے استعفا جیب سے نکال کر پیش کیا وہ استعفا پھینک دیا۔ اور فرمایا کہ "جس نے تم کو ملازم رکھا ہے اس کو استعفا دو؟" شاپورجی نے میری مدد کی اور عرض کیا کہ "مختار الملک نے ان کو بھیجا ہے؟" یہ سن کر اور بھی چین بجبیں ہوئے اور کہا کہ "اس رافضی کی عادت ہے اپنی بلا دوسروں پر ڈالتا ہے؟" یہ کہکر میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ "میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں تم شوق سے جا کر کہدینا؟" میں نے کہا کہ "میری کیا مجال کہ بڑے معاملوں میں دخل دوں؟" فرمایا "اگر میں ثابت کردوں کہ تم دخل دیا کرتے ہو؟" میں نے عرض کیا "اس وقت میرا استعفا نامنظور اور ملازمت سے نکال دینے کا حکم جاری فرمادیا جائے بشرطیکہ جس نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہو وہ میرے سامنے طلب کیا جائے؟" فرمایا "سنو صاحب تمہارے خاندان سے اور ہم سے قدیم راہ و ربط ہے۔ تمہارے یہاں کی عورتوں تک کے نام مجھکو معلوم ہیں اس کا حال تمہارے خسر غلام فخر الدین کو معلوم ہے۔ پھر تم کیوں مختار الملک کی طرفداری اور میری مخالفت کرتے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ "یہ جو ارشاد ہوا ہے اس سے تو مجھکو بالکل انکار ہے میں ادنیٰ ملازم، میں کہاں اور مختار الملک کی طرفداری کہاں۔ اور کہاں آپ کی مخالفت۔ رہ گیا یہ امر کہ میرا قدیم تعلق آپکے خاندان ذی شان سے ہے یہ میری خوش قسمتی ہے مجھکو اس کا علم قبل ازیں نہ تھا اور اب میں زائد تر مستحق عنایات خاص کا ہوں۔ مختار الملک نے بے شک مجھکو اس خدمت پر مقرر کیا۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ میں اپنے قدیم تعلقات کو نقصان پہونچاؤں؟" فرمایا "مولوی صاحب کی مثال موجود ہے۔ جو میں سلوک کر سکتا ہوں وہ مختار الملک نہیں کر سکتے ہیں؟" پھر فرمایا "تم خورشید جاہ سے ملتے ہو؟" میں نے کہا کہ "ان کا صاحبزادہ میرا شاگرد ہے وہ بلاتے ہیں میں چلا جاتا ہوں اور وہ بھی تو آپکے صاحبزادہ ہیں؟" فرمایا جی ہاں ایسے صاحبزادہ ہیں کہ اپنے چھوٹے بھائی

سلہ اقبال الدولہ ۱۲

کو زہر دینے کی کوشش کی" یہ سن کر میں بہت گھبرایا۔ خلاصہ یہ کہ دو اقرار مجھ سے لئے گئے :-

اوّل ایں کہ موقع و محل پر ان کی تعریف سمع ہمایوں حضور پُر نور میں کیا کروں۔

دوم ایں کہ خورشید جاہ بہادر کے مقابلہ میں اقبال الدولہ کی تعریف کیا کروں۔

خطا میری معاف ہوئی استعفا خود چاک فرما دیا اور شاہ پور جی کو حکم دیا کہ مجھکو اقبال الدولہ کے پاس لے جائیں۔ اس زمانہ میں اقبال الدولہ کم سن اور نہایت کم گو تھے۔ یہ سب قصہ میں نے نواب وزارت پناہ سے بھی عرض کیا وہ خوب ہنسے اور فرمایا کہ میری طرف سے اجازت ہے کہ تم خوب تعریف امیر کبیر بہادر کی کیا کرو۔ دوسرے دن ایک عمدہ فٹن گاڑی اور ایک نہایت عمدہ دراز قد عربی گھوڑا امیر کبیر کا اخباری میرے پاس لایا کہ یہ آپ کو عطا ہوا ہے۔ اور ایک فرد دانہ چارہ اور تنخواہ سائیس و کوچوان کی مجھکو دی کہ ماہ بماہ یہ رقم سرکار امیر کبیر بہادر سے ملا کرے گی۔ میرے ہوش بجا نہ رہے کہ انکار میں بھی خرابی اور اقبال میں نہیں معلوم کیا نتیجہ نکلے۔ میں نے عرضی فوراً وزارت پناہ کو لکھی اور خود میجر ولسن کے پاس گیا اور گاڑی اور گھوڑا اپنے ہاں بندھوا لیا۔ بارے، دونوں صاحبوں نے قبول کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ خطا معاف اور انعام سے سرفرازی یہ طریقہ ان قدیم امرا کا تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً اپنا نام نکلوا کر اپنے خسر نواب فخر الدین کا درج فرد کرا لیا۔ اسی احتیاط کی وجہ سے جب نواب شمس الامرا امیر کبیر خورشید جاہ بہادر نے مجھکو چند دیہات بطور جاگیر دوامی عطا فرمائے تو میں نے اپنے خسر موصوف نواب فخر الدین خاں کے نام جاری کرا دی اور جب بوجہ مخالفت مدار المہام وقت نواب سالار جنگ میر لائق علی خاں میرے خسر نے حیدر آباد میں رہنا ترک کیا تو میں نے اپنی بی بی کا نام پیش کیا مگر چوں کہ پائگاہ میں قاعدہ نہیں ہے کہ اناث کے نام جاگیر عطا کی جائے لہذا میرے فرزند اکبر ذوالقدر جنگ کے نام جاری کرا دی گئی۔

اب میں اطمینان سے حضور پُر نور کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور بہت جلد حضور پُر نور کو اُردو لکھنے پڑھنے کی قوت اور حساب میں کافی واقفیت ہوگئی۔ ہمیشہ حضور پُر نور فرمایا کرتے تھے کہ "اگر حضرت نہ ہوتے تو ہم جاہل رہ جاتے"۔ مگر مولوی صاحب کی چھیڑ چھاڑ میرے ساتھ جاری رہی اور کپتان صاحب بھی کبھی کبھی رنگ لے آیا کرتے تھے۔ اس واسطے کہ ایک بار از راہِ حماقت میرے منھ سے یہ الفاظ نکلے کہ "بعد ختمِ تعلیم حضور پُر نور کی قلم برداری میرا حق ہے"۔ ان ہی دنوں پُرانی حویلی میں ایک بار مزاج حضور پُر نور کا ناساز ہوا۔ اطبّا جمع ہوئے۔ رزیڈنسی سرجن طلب کیا گیا۔ وہ نبض وغیرہ دیکھ کر بجائے مولوی صاحب کے میری طرف مخاطب ہوا۔ اور کل ہدایت غذا و دوا وغیرہ سمجھانے لگا۔ اور میں نے حماقت سے حاضر باشوں کو اس کے مطابق فہمائش کی اور باقر علی خاں سے کہا کہ جلد نسخہ طیار کر کے لائیں اور باری باری سے ایک طبیب حاضر رہے۔ اس پر مولوی صاحب بہت بگڑے اور صاف صاف مجھ سے بالفاظ سخت گفتگو شروع کی۔ میں نے بھی مجبوراً جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ وہ یہ کہہ کر کہ اب آپ ڈیوڑھی مبارک کا انتظام کیجئے مکان کو چلے گئے اور حاضر باشوں کو بھی برخاست کا حکم دے دیا۔ نواب امیر کبیر نے ان سب کو پھر واپس آنے کا حکم دیا۔ مولوی صاحب تو نہیں آئے۔ حاضر باش چلے آئے۔ میں وہاں سے وزارت پناہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مجھ پر نہایت خفا ہوئے اور فرمایا عُمدہ موقع تم نے کھو دیا۔ فوراً انتظام ہاتھ میں لینا چاہیئے تھا اور حاضر باشوں کو ہرگز نہ جانے دینا چاہیئے تھا" ابھی واپس جاؤ میں سمجھ لوں گا"۔ میں پھر ڈیوڑھی مبارک واپس گیا۔ اور تمام شب ڈیوڑھی میں حاضر رہا۔ پلنگ مبارک کے منصب داروں کو طلب کیا۔ اہلِ نشست کو احکام جاری کیے

دوسرے روز مولوی صاحب بغیر بلائے خود چلے آئے اور کلارک صاحب کو اپنا ہم رائے کرکے کام شروع کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک حضور پُر نور نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے ہر روز حوض میں مع مصاحبین و مولوی صاحب تیرنا سیکھتے تھے۔ سوائے ازیں کہ انگریزی درس کے وقت میز پر خاصہ تناول فرماتے تھے۔ انگریزی نشست و برخاست و لباس و رفتار و گفتار و دستار کی مطلق عادت نہ تھی۔ وہی زر نگار کلاہ سمرقندی، قدیم انگرکھا دکھنی یا شیروانی۔ دربار کے وقت دستار طرّہ دار[1] حسب دستور قدیم پہنتے تھے اور نواب امیر کبیر اور شاپور جی اس امر خاص میں نواب وزارت پناہ سے متفق رہے۔ چنانچہ ایک واقعہ یہ ہے کہ سر رچرڈ نے اصرار اس امر پر کیا کہ سوائے دربار معینہ میرا جس وقت جی چاہے بطور خانگی چلا آؤں اور تنہا حضور پُر نور سے ملتا رہوں۔ یہ امر امرائے عظام میں سے کسی کو منظور نہ ہوا۔ مگر انکار بھی مناسب نہ جانا۔ نواب وزارت پناہ نے چند ہرکارے روزانہ پل پر متعین کر رکھے اور راجہ گردھاری پرشاد عوض بیگ وغیرہ عہدہ داران ڈیوڑھی مبارک کو ہدایت خاص کر دی۔ ایک روز رزیڈنٹ بسواری اسپ تنہا پل پر آئے۔ ہرکارے ہر طرف دوڑ پڑے ہیں اور کلارک صاحب باتیں کر رہے تھے کہ رزیڈنٹ صاحب اسپ دواں آ پہونچے۔ یہاں حسب ہدایت جمعیت آ پہونچی تھی جب معمول سلامی آتاری گئی۔ رزیڈنٹ صاحب نہایت برہم ہوئے اور پوچھا کس کے حکم سے تم نے سلامی اُتاری۔ عوض بیگ نے جواب دیا کہ ہم

---

[1] یہ دستار آصف جاہ اول بانی خاندان کو حضرت شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے عطا کی تھی ۱۲

کسی کے حکم کے پابند نہیں ہیں۔ اپنے فرائض منصبی قدیم الایّام سے ادا کرتے آئے ہیں۔ اتنے میں نواب امیر کبیر، نواب وزارت پناہ مہاراجہ پیشکار وغیرہ امرائے عظام بھی آپہنچے۔ میں اور کلارک صاحب و صاحب عالی شان اور حضور پُرنور ظفر جنگ بہادر اندر کمرہ میں اور کل امراء و اہل دربار باہر برآمدہ میں آگئے۔ غرض عجب طرح کا دربار جمع ہوگیا۔ حضور پرنور کے چہرۂ مبارک پر بوجہ کم سنی گونہ حیرت و پریشانی ظاہر تھی۔ میں نے کلارک صاحب سے سرگوشی کی۔ رزیڈنٹ صاحب جو باتیں حضور پُرنور سے کرتے تھے۔ حضور پرنور خاموش اُن کی صورت دیکھتے تھے۔ کلارک صاحب رزیڈنٹ کا ہاتھ پکڑ کر چائے خوری کی میز پر لے گئے، میں نے بمشورہ کلارک صاحب باہر نکل کر امرائے عظام سے کہا کہ تشریف لائیے آپ کی یاد ہوئی ہے۔ وہ سب بھی میز پر آکر بیٹھے۔ چائے خوری کے بعد کلارک صاحب نے معافی مانگی کہ اب درس کا وقت ہے اور صاحب عالی شان بہادر شکست خوردہ نہایت برہم مزاج روانہ ہوگئے۔

اس کے بعد سر رچرڈ نے اصرار کیا کہ بندگان عالی حضور پُرنور میری دعوت شب یعنی ڈنر قبول کریں۔ امرائے عظام نے انکار مناسب نہ جانا۔ بشرائط چند قبول کر لیا۔ اس شب کو تمام رزیڈنسی؎ اندر سے باہر تک روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ احاطہ کے اشجار پر رنگ برنگ کی

؎ رزیڈنسی موسی ندی کے بائیں کنارہ پر اور شہر کی فصیل کے شرقی حصے کے محاذ میں واقع ہے۔ عمارت عالی شان اور ایک وسیع رقبہ میں ہے۔ باغ اور میدان آراستہ اور خوش منظر ہے۔ اس کا صدر کمرہ ساٹھ فیٹ لمبا ۳۲ فیٹ چوڑا اور ۵۰ فیٹ بلند ہے۔ تعمیر مدارس کے انجینیر مسٹر رسل کی نگرانی میں ۱۸۰۳ء میں شروع اور ۱۸۰۸ء میں ختم ہوئی۔ بیس لاکھ روپے عمارت پر خزانۂ ریاست سے صرف ہوئے۔ احاطہ میں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں رزیڈنٹ بھی دفن ہیں ۱۲

قندیلیں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ تمام رزیڈنسی کا وسیع احاطہ ہر قسم کی سواریوں اور افواج انگریزی سے بھرا ہوا تھا۔ اندر رزیڈنسی کے جتنے عہدہ داران انگریزیہ بلارم و سکندرآباد کے تھے۔ اپنی اپنی وردیاں پہنے ہوئے حاضر تھے۔ ادھر کل امرائے عظام رنگ برنگ کے لباس پہنے ہوئے گروہ گروہ جمع ہوئے۔ حضور پرنور مع کل حاضر باشان و مولوی صاحب و راقم لباس شاہی در بر و دستار طرّہ دار بر سر صدر مقام پر طلائی کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ تمام صدر کمرہ و گرد و نواح کے کمرے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ آمد و رفت میں شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ اتنے میں رزیڈنٹ نے آکر عرض کیا کہ خاصہ طیار ہے۔ اب ایک ہل چل پڑ گئی۔ سب مہمان کھانے کے کمرے میں دوڑ پڑے بعد فراغت طعام پھر سب لوگ صدر کمرہ میں جمع ہوئے۔ مستحکم جنگ نے مجھ سے کہا کہ "آغا صاحب ریاحین پیٹ میں دھوم مچا رہی ہیں۔ حقہ تو مل نہیں سکتا کسی انگریز سے سگار ہی مانگ دو۔ ایک فوجی انگریز میرے پاس کھڑا تھا میں نے اس سے کہا کہ یہ نواب صاحب آپ سے سگار مانگتے ہیں۔ اس نے حیرت سے مجھ کو دیکھا اور کہا کہ تم نے Notification نوٹی فکیشن یعنی اعلان نہیں دیکھا کہ اگر کسی عہدہ دار کی جیب میں سگار نکلے گا وہ دعوت میں سے نکال دیا جائے گا۔ اس نواب سے کہہ دو کہ میں یہاں سے نکالا جانا نہیں چاہتا۔ الغرض آتش بازی وغیرہ کے بعد دعوت ختم ہوئی اور سب مہمان اپنے اپنے گھر کو سدھارے۔

اس کے بعد صاحب عالی شان نے اپنی دوسری شان دکھائی یعنی حضور پرنور کو بلارم میں دعوت دی تاکہ انگریزی فوج کی ورزش اور کرتب ملاحظہ فرمائیں اس پر

بہت کچھ جانبین سے تکرار رہی۔ بالآخر نواب امیر کبیر راضی ہو گئے اور نواب وزارت پناہ مجبور ہو گئے۔ بلدہ سے نواب امیر کبیر باوجود ضعف مرض ہمرکاب دولت ہوئے۔ دونوں امرا یعنی نواب وزارت پناہ بھی زرد گاڑی میں روبرو حضرت بندگانِ عالی حضور پرنور بیٹھے۔ ہم لوگ الگ الگ گاڑیوں میں ہمرکاب سعادت ہوئے۔ میں اور مستحکم جنگ ایک گاڑی میں تھے۔ راستہ میں انھوں نے دنیا کی اما کی یعنی مولوی صاحب کی شکایت شروع کی حتیٰ کہ میں ہم زبانی کرتے کرتے تھک گیا۔ بالآخر تنگ ہو کر میں نے کہا کہ نواب صاحب اصل بات یہ ہے کہ "لوگ آپ کو بلا وجہ احمق سمجھتے ہیں"۔ یہ سُن کر اس وقت تو دو تین دفعہ ہوں ہوں کر کے چپ ہو گئے۔ بعدہٗ بڑی دردناک آواز سے میری شکایت حضور پرنور سے کی۔ حضور پرنور اور نواب ظفر جنگ کو ایک کھیل ہاتھ لگ گیا اور اکثر پوچھا کرتے تھے کہ "مستحکم جنگ! حضرت نے تم سے کیا کہا تھا"۔ یہ غریب شرمندہ ہوتے تھے اور حاضر باش قہقہے لگاتے تھے۔ الغرض بعد چاے خوری وغیرہ فوجی کرتب ملاحظہ فرمائے گئے اور رخصت کے وقت سر جرڈ نے کہا کہ میں بھی چادر گھاٹ آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں۔ اب دونوں امرا گھبرائے کہ خواہ مخواہ ریزیڈنٹ ہم پہلو حضور پرنور بیٹھے گا اور ہم کو روبرو دست بستہ بآداب شاہی بیٹھنا ہوگا۔ نواب امیر کبیر تو بعذر علالت مزاج اپنی گاڑی میں بیٹھ سکتے تھے نواب وزارت پناہ کو کوئی عذر نہ تھا۔ مولوی صاحب کی تجویز کہ "میں اور کپتان کلارک روبرو بیٹھ جائیں گے"۔ نواب وزارت پناہ کو پسند نہ آئی اور حق یہ ہے کہ خود شاپور جی متردد تھے۔ بالآخر نواب وزارت پناہ نے کچھ سرگوشی مستحکم جنگ بہادر سے کی۔ سوار ہوتے وقت ایک سوار اسپ دواں آیا اور

اور کہا کہ بیگم صاحبہ کا مزاج نصیب دشمناں ناساز ہوگیا ہے۔ حضور پرنور کو جلد بلایا ہے
یہ دونوں امرا مع حضور پرنور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ہم لوگ
افتاں و خیزاں پیچھے پیچھے گاڑیاں بھگلتے ہوئے ہمرکاب سعادت رہے۔ اب کلارک
صاحب اور مسٹر کرون نے تجویز پیش کی کہ حضور پرنور تھوڑا سا اپنا ملک بھی ملاحظہ
فرمائیں اور گلبرگہ اور اورنگ آباد تشریف لے چلیں۔

خلد آشیاں حضور نظام سابق شکار کیمپ میں

سفرِ گلبرگہ شریف

نواب[1] اکرام اللہ خاں رئیس کاکوری عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر ملک اودھ میں سرفراز تھے۔ آدمی نہایت زندہ دل خوش گفتار اور احباب پرست تھے۔ اثنائے گفتگو میں حکایات دلچسپ بیان کر کے سامعین کا دل لبھا لیا کرتے تھے۔ ایک حکایت اُن کی مجھ کو یاد ہے۔ ایک روز شام کے وقت وہ میرے چچا مرحوم مرزا عباس بیگ سے ملنے آئے تھے۔ ہم لوگ حسب دستور ہمراہ عم بزرگوار میز پر کھانا کھا رہے تھے اور ڈپٹی صاحب روبرو کرسی پر بیٹھے ہوئے سرگرم گفتار تھے۔ یکایک اُن کی رگِ تمسخر نے تحریک کی اور کہا کہ "فلاں شیخ صاحب کے ہمسایہ میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ شیخ صاحب نے اپنے خدمت گار سے کہا کہ مولوی صاحب کے پاس جا کر تھوڑی سی گھانس اپنے گھوڑے کے واسطے مانگ لاؤ۔ وہ خدمت گار مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "برادرم میرے مطبن میں اس قدر طبن کہاں ہے کہ کنجشک آشیانہ ساخت کرے" وہ خدمت گار واپس چلا آیا۔ شیخ صاحب نے جب دریافت کیا تو اُس نے عرض کیا کہ مولوی صاحب نے گھانس تو نہیں دی قرآن کی آیۃ پڑھ دی۔ الغرض ڈپٹی صاحب ملک اودھ سے پنشن پا کر حیدرآباد وارد ہوئے اور صدر تعلقہ داری سمت گلبرگہ شریف پر سرفراز ہوئے اور چوں کہ نہایت منتظم اور نفیس طبع تھے گلبرگہ کو چند ہی روز میں ایک پر رونق قصبہ بنا دیا اور بالخصوص مسجد جامع بہمن شاہیہ اور درگاہ شریف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ایسی درستی کی کہ قابل دید ہو گئی

---

[1] المخاطب بہ نواب یار جنگ ۱۲

نواب وزارت پناہ نے یہ ارادہ کیا کہ خود اعلیٰ حضرت بندگان عالی کو برائے ہواخوری و زیارت آستانۂ مبارک حضرت خواجہ رحمت اللہ تعالیٰ علیہ گلبرگہ شریف لے جائیں۔ چنانچہ سفر مبارک کی تیاری شروع کردی۔

یہ پہلا سفر حضور پُر نور کا تھا۔ تمام کارخانجات میں حکم صادر ہوا۔ میر منزل نواب قدیر جنگ اور مہتمم خیمہ و خرگاہ نواب جہاں[1] دار خاں گلبرگہ شریف پہونچ گئے۔ اسٹیشن ریلوے کے قریب فرودگاہ قائم ہوئی اور زیر ہدایت نواب اکرام اللہ خاں وہ تمام میدان سبزہ زار رشکِ باغ فردوس بنادیا گیا۔ ڈاک بنگلہ میں خود بدولت و اقبال حضرت ظل سبحانی فروکش ہوئے۔ امرائے نامدار اپنی اپنی مسل پر دوردانہ اور دو معلّیٰ اترے۔ دربار مبارک اوقات مقررہ پر جاری رہا۔ صبح کو پری نژاد گھوڑے پر مع مصاحبین و اتالیق ہواخوری کو تشریف لے جاتے، شب کو دسترخوان وسیع پر امرائے عظام حاضر رہتے۔ ایک دن قریب وقت مغرب امرائے عظام وزارت پناہ و امیر کبیر وغیرہ حاضر تھے کہ یکایک ابر غلیظ نمودار ہوا اور کچھ بوندا باندی بھی شروع ہوئی۔ حضرت ولی نعمت بنگلہ کے برآمدہ میں رونق افروز تھے۔ امرائے عظّام درختوں کے سائے میں استادہ تھے میں نے آگے بڑھ کر وزارت پناہ سے عرض کیا کہ بارش ہو رہی ہے برآمدہ میں تشریف لے آئیے امیر کبیر نے بہ نگاہ تیز مجھ کو گھورا۔ مگر وزارت پناہ نے بعد تبسم فرمایا کہ ”یہ مرتبہ تم حاضر باش لوگوں کا ہے۔ ہماری مجال نہیں کہ بغیر یاد فرمائے قدم آگے بڑھا سکیں“ اتنے میں مستحکم جنگ نے آواز دی کہ سب صاحبوں کو حکم ہے کہ برآمدہ میں چلے آئیں۔ یہ امراء تھے کہ ہر وقت مراتب شاہی پیش نظر رکھتے تھے۔

---

[1] ان کی پوتی جنت نواب محمد محبوب علی خاں جہاں دار نواز جنگ ذوالقدر جنگ سے منسوب ہوئی ۱۲

خلد آشیان حضور نظام سابق شکارگاہ میں

اس کے بعد پٹن چیرو کا سفر ہوا ہر سفر میں کل جلوس شاہی ہمرکاب سعادت رہا۔ علاوہ امرائے عظام مع قدم وحشم جمعداران نظم جمعیت دور و نزدیک علیٰ قدر مراتب خیمہ زن ہوتے، شب کو روشن چوکی حسب دستور نکلتی تھی۔ ہر سفر میں میں روزنامچہ لکھا کرتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ بوقت تحریر سطور ہذا وہ روزنامچے میرے پاس نہیں ہیں، یہاں کا ایک واقعہ مجھ کو یاد ہے۔ ان دنوں نواب خورشید جاہ اور بشیر الدولہ میں باہم خدمات مقررہ جیسے (داخل کردن چنگیر و ہار، وخوان طوطک، وخدمت مورچھل، بوقت سواری عماری و دربار عیدین وغیرہ کے بارے میں شدید تکرار تھی اور وزارت پناہ بشراکت رزیڈنٹ حکم مقرر ہوئے تھے ایک دن بوقت سہ پہر میں وزارت پناہ کے سلام کو گیا۔ اثنائے گفتگو میں اس تکرار کا بھی ذکر آیا میری جو شامت آئی میں نے کہا کہ نواب خورشید جاہ زیادہ تر ان خدمات کے مستحق معلوم ہوتے ہیں۔ نواب صاحب نے بغور مجھ کو دیکھ کر فرمایا کہ بس تو آپ ہی اس کا فیصلہ کیجئے آپ ان کے صاحبزادہ کے استاد بھی ہیں۔ یہ جرأت میں نے باشارہ نواب خورشید جاہ کی تھی جس کی گوشمالی بخوبی ہو گئی۔

سفر اورنگ آباد

اس سفر میں دو واقعہ قابل بیان ہیں۔ اوّل یہ کہ صاحب عالیشان بہادر بھی خلاف دستور قدیم ریاست ابد مدّت کا دورہ کرتے ہوئے اورنگ آباد آئے اور رائے یہ قرار پائی کہ ان کی دعوت کی جائے۔ مسٹر کرون نے صلاح دی کہ میز پر شراب بھی رکھی جائے اس امر پر کوئی امیر راضی نہ ہوا۔ مگر اب ضد بڑھ گئی اور دونوں یورپین صاحبوں نے کہا کہ یا تو دعوت نہ کی جائے یا شراب مہمانوں کو دی جائے۔ بالآخر میدان ان دونوں کے

ہاتھ رہا۔ اور معلوم نہیں شراب کہاں سے آئی اور میز پر دکھائی دی۔ کل امرار جو ہم کا سعادت تھے مدعو ہوئے۔ بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب یعنی فرزندان نواب وزیر و محمد علی بیگ و میر ریاست علی وغیرہ کالا کوٹ سفید کالر، سفید کف، اور دیگر اصحاب کالی شیروانی پہنے ہوئے حاضر تھے۔ میرے پاس کوئی کالا کپڑا نہ تھا اور نہ کف تھے اور نہ کالر، لہذا معمولی پوشاک پہنے نیا تماشا دیکھ رہا تھا اور عمدۃ الملک مرحوم کی تصویر گویا سامنے کھڑی ہوئی اپنی وصیت یاد دلا رہی تھی۔ خود حضور پرنور سادہ لباس میں رونق افروز تھے مولوی صاحب نے اتنا تکلف کیا کہ ایک کالا چوغہ اوپر سے پہن لیا۔ نواب وزارت پناہ و امرائے عظام اپنی معمولی پوشاک پہنے ہوئے تھے کہ اتنے میں یورپین مہمان بھی اپنی وردیوں میں آپہونچے اور اب سب میز پر بیٹھے، شراب کی بوتلوں کی ڈاٹ اُڑنے لگی عمدۃ الملک کی روح شاید میز کے گردش گردان کبوتر فریاد کناں پرواز کر رہی ہوگی۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مولوی مہدی علی[1] جو مع دیگر عہدہ داران علاقہ دیوانی وزارت پناہ کے ساتھ آئے تھے وہ کلارک صاحب کے پاس پہونچے اور ان کو سمجھایا کہ محض سفر سے کیا فائدہ، کچھ دفاتر مختلفہ کا ملاحظہ کرایا جائے تاکہ حضور پرنور کو انتظامی حالات سے

---

[1] مولانا موصوف کے متعلق ایک حکایت پُرلطف یہ سُنی گئی تھی کہ جب نواب وزیر ہندوستان کے سفر میں مصروف تھے تو سر سید احمد خاں مرحوم نے نواب صاحب کو ٹی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اثنائے صحبت میں سید صاحب نے مولوی مہدی علی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ جب کہ آپ نے (یعنی نواب وزیر) میری سفارش کو منظور اور مولانا کو نوکر رکھ لیا ہے تو میرا فرض ہے کہ ان کی تعریف کے ساتھ جو سقم ان میں ہے وہ بھی عرض کر دوں عرض کیا کہ مولانا کو ایک گھڑی تصور فرمائیے جو دنیا کے بہترین کاریگر نے بنائی ہے مگر گھڑی میں ایک نقص یہ رہ گیا ہے کہ اگر یہ گھڑی سامنے سے ذرا بھی ہٹی تو الٹی چلنے لگتی ہے۔ نواب صاحب نے ہنس کر کہا کہ سید صاحب آپ خاطر جمع رکھیں میں اس گھڑی کو الٹا چلنے نہیں دوں گا۔

فی الجملہ آگاہی ہو۔ کلارک صاحب کو یہ رائے ایسی پسند آئی کہ اس ہی وقت وزارت پناہ کو اس پر راضی کر لیا۔ دوسرے روز دفاتر کا ملاحظہ ہوا۔ یہاں تک مضائقہ نہ تھا مگر مولوی مہدی علی نے قدم آگے بڑھایا اور کلارک صاحب کو اس ضد پر لائے کہ مولوی مہدی علی روزانہ حاضر ہو کر حالات کارروائی عرض کیا کریں۔ اب مولوی مسیح الزماں خاں اور نواب وزارت پناہ چونک پڑے۔ کلارک صاحب اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے مولوی مسیح الزماں خاں نے حجت کی کہ مولوی مہدی علی پر کیا منحصر ہے کوئی بھی ماتحت عہدہ دار مثل تحصیل دار یا تعلق دار یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ یہ بحث دونوں صاحبوں میں درپیش تھی کہ میں اتفاقاً نواب وزارت پناہ کے مسل یعنی فرودگاہ کی طرف گیا شاید مجھ کو دیکھ لیا ہوگا کہ چوبدار نے مجھ سے کہا کہ وزارت پناہ تم کو یاد فرماتے ہیں میں خیمہ کے اندر گیا۔ اول ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں' اور فرمایا کہ یہ نئے طرز کا خیمہ دو منزلہ ہے اور خاص طور پر بن کر آیا ہے میں نے بھی اس کی بہت تعریف کی' اس کے بعد کلارک صاحب کی شکایت فرمائی کہ ہر بات پر ضد کر بیٹھتے ہیں اور مجھ پر پہلے ہی سے الزام ہے کہ میں اپنے آقائے ولی نعمت کو جاہل رکھنا چاہتا ہوں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل' میں نے عرض کیا کہ اگر سرکار کو یہ امر ناپسند ہے تو یہ ٹل سکتا ہے۔ فرمایا میری نسبت جو خیالات حضور پر نور کی ضمیر مبارک میں ڈالے گئے ہیں وہ تم کو بھی معلوم ہیں۔ اس پر میرے علاقہ کے لوگوں میں سے کوئی بھی حضور رس ہو جائے تو کیا وہ اپنا رنگ جمانے میں میری رعایت کرے گا۔ اور مولوی مہدی علی تو میرے ساتھ نئے نئے رنگ لا رہے ہیں۔ وہاں پہونچ کر تو مثل منہ زور گھوڑے کے میرے قابو سے باہر ہو جائیں گے' کلارک صاحب میری مشکلات کو کیا سمجھ سکتے ہیں میں نے عرض کیا کہ مولوی مسیح الزماں خاں صاحب کے مقابلہ میں کلارک صاحب

کو بھی ضد آ گئی ہو میں اور کرون صاحب ان کو راہ پر لا سکتے ہیں۔ فرمایا جاؤ اور کوشش کرو
میں وہاں سے اٹھ کر اوّل کرون صاحب سے ملا۔ وہ صاف انکار کر گئے۔ اب میں
اکیلا رہ گیا۔ خوب دل میں ہر پہلو پر غور کر کے کلارک صاحب کے خیمہ میں گیا۔ وہ بھی خالی
بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے موقع پا کر اصل مطلب چھیڑا۔ کلارک صاحب نے مولوی مہدی علی
صاحب کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایسے لائق آدمی کی حاضری سے ہز ہائنس کو بڑا فائدہ
ہو گا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی رائے سے بالکل متفق ہوں مگر مولوی مسیح الزماں خاں
صاحب اس کو منظور نہیں کرتے اور ان کا قول بھی قابل غور ہے فارسی شعر ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

ابھی ہم لوگ معمولی تعلیم اُردو فارسی اور انگریزی میں کامیاب نہیں ہوئے بجز
اس کہ اس تعلیم میں بھی خلل پڑ جائے اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس پر کلارک صاحب
نے کہا کہ تم ہمیشہ میری رائے سے اختلاف کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں
بدخواہ نہیں ہوں۔ مولوی نذیر احمد کا معاملہ یاد کیجئے وہ نیچری خیال کے تھے۔ مولوی مہدی علی
نیچریوں کے گرو مشہور ہیں۔ معلوم نہیں کہ کیا ہنگامہ بلدہ میں مچ جائے جواب دیا کہ ہز ایکسلینسی
نے کیوں میری تجویز منظور کر لی۔ میں نے کہا کہ انھوں نے تو منظور نہیں کی بلکہ خاموش رہ گئے
اس واسطے کہ مخالفین پہلے ہی سے ان کی نسبت گمان بد رکھتے ہیں۔ مذہبی بات ہے تمام
بلدہ مولوی مسیح الزماں خاں کے ساتھ ہو جائے گا۔ اس پر بدمزاج ہو کر کہا کہ ہز ایکسلینسی
نے کیوں نہیں مجھ سے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا اب بھی کیا گیا ہے۔ ان
سے ملاقات کر لیجئے یہ سن کر آواز دی مرتضیٰ حاضر ہے۔ وہ آیا کہا کہ "جاؤ نواب صاحب کو

اطلاع کردو ہم آتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اُدھر ہی جاتا ہوں اطلاع کر دوں گا۔ یہ کہہ کر میں سیدھا نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب سب کیفیت سُن کر نہایت خوش ہوئے۔ خلاصہ این کہ وہ بات رفع دفع ہوگئی اور مہدی علی صاحب نے اپنی مایوسی کا غصّہ پورا مولوی امین الدین خاں پر اُتارا۔ مولوی امین الدین خاں بھی ایسے غیور تھے کہ انھوں نے بعد خانہ نشینی تا دمِ مرگ گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ یا وہ دھوم دھام کے دربار میں نے ان کے دیکھے تھے یا ایک بوریئے پر میلا سا تکیہ سرہانے ان کی لاش کو دیکھا۔ وہ تو شاہ رحیم الدین صاحب مع اپنے وکیل مرزا غضنفر علی بیگ آ پہونچے جو اُن کی تجہیز تکفین بھی ہوگئی۔ خدائے تعالےٰ اُن کو بخشے عجیب با وضع آدمی تھے۔

یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ میرے ماموں صاحب عالم مرزا جمال الدین گورکانی بھیس بدلے ہوئے لنبے لنبے بال تسبیح گلے میں ڈالے قلعہ دولت آباد میں داروغۂ قلعہ تھے۔ میں اُن سے ناواقف تھا۔ شب کو وہ میرے پاس آئے اور اپنا نام و نشان بتا کر مجھ سے گلے ملے۔ مجھ کو ماموں صاحب کی یہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اور چاہا کہ وزارت پناہ سے سفارش کروں مگر وہ ملاقات تک کو راضی نہ ہوئے اور کہا کہ مجھ کو گمنام رہنے دو۔ خلاصہ این کہ انھوں نے مجھ کو روضہ پر ایک مقبرہ کا پتہ دیا جس میں میری رشتہ کی نانی مدفون تھیں اور فی الحال اس میں ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا تھا۔ بڑی عالی شان عمارت اور وسیع احاطہ ہے۔ میں نے اس کا ذکر وزارت پناہ سے کیا انھوں نے وعدہ فرمایا کہ بلدہ چل کر یہ عمارت عالی شان تجھ کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ اس کی بابت مولوی مہدی علی معتمد مال کے پاس حکم بھی نافذ ہوا تھا مگر میری بدقسمتی سے وزارت پناہ کا یکایک انتقال ہوگیا اور اُن کے بعد جو طوفانِ بے تمیزی برپا ہوا جس کا ذکر آنے والا ہے۔ اس

میں یہ کارروائی بھی یوں ہی رہ گئی۔

انگریزیت کی کچھ کچھ جھلک آغا ناصر شاہ و میر ریاست علی و مرزا محمد علی بیگ کے باعث ڈیوڑھی مبارک میں بھی شروع ہوگئی۔ ایک نئے سوداگر ہیڈیٹیم پاؔل نامی نے جو شاید انگریز یہودی تھا کپڑوں کی دکان سکندرآباد میں کھولی تھی۔ یہ حضرات اور علاوہ ان کے دوسرے امیرزادے جوان جوان نئی تمنائیں دل میں لئے ہوئے اس دکان پر ٹوٹ پڑے۔ ہر قسم کے ریشمی و اونی رنگ برنگ کی نئی قطع برید اور نئی وضع کی شیروانیاں اونچے اونچے کالر لمبے کف مختلف الوان کی پتلونیں۔ سواری شکاری ڈنر ملاقات کے جدا جدا لباس ہر طرف رائج ہونے لگے، مسٹر کرون اس سوداگر کو ڈیوڑھی مبارک میں بھی لائے، اور ہر قسم کے لباس حضور پُرنور کے واسطے تیار کئے گئے۔ نیچے نیچے چولی دار انگرکھے اور زرنگار ٹوپیاں غائب ہونے لگیں۔ ڈیوڑھی مبارک میں مشرق و مغرب نے مصافحہ شروع کر دیا۔ ایک طرف تو قدیم وضع قدیم رفتار قدیم لباس کے ملازمین اور مولوی مسیح الزماں خاں کا گروہ اور علاقداران پائگاہ۔ دوسری طرف نئی اُمت نئی وضع نئی رفتار کے لوگ پُرانے گروہ پر سبقت لے جانے لگے بمعدودے چند امرائے عظام اور ان کے علاقدار البتہ اپنی قدامت پر قائم رہے۔ نواب وزارت پناہ نواب بشیرالدولہ نواب خورشید جاہ و خاندان نورالامرا تا حیات قدیم طریق کے پابند رہے اور انگریزی سوداگر کو ان کی ڈیوڑھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی لیکن گو نواب وزارت پناہ اپنی ذات اور اپنے ولی نعمت حضور پرنور کی ذات مبارک تک اس انقلاب کو ناپسند

لـ اپنی مدارالمہامی کے آخر زمانہ میں یہ بھی اس جدید رفتار کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

فرماتے تھے ۔ مگر اس کے سدّ سکندر نہ بن سکے اور ان کی وفات کے بعد بالآخر گویا یاجوج ماجوج دیوار چاٹ کر نکلے اور ہر طرف قابض و متصرف ہو گئے ۔

اس مقام پر حضرت ناصر الدولہ کے عہد کے معاشرتی حالات جو میں نے متواتر معتبر ذرائع سے سُنے قابل بیان ہیں؛ یہ تو بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ناصر الدولہ نے خطاب ہز مجسٹی سے صاف انکار کر دیا تھا ۔ اس بادشاہ ذی جاہ کو کمال درجہ نہ فقط انگریزوں اور انگریزیت سے کوفت تھی بلکہ کل بیرونی باشندگان مثل اہل بمبئی و پونہ و مدراس اور ان کی معاشرت لباس و رفتار سے بھی کلّی نفرت تھی ۔ البتہ اگر کوئی ہندوستانی بالخصوص اہل دہلی میں سے حیدرآباد جاتا تو اس کی قدر فرماتے تھے ۔ جب سے کہ سرکار کمپنی بہادر سے خطاب ہز مجسٹی کی غلطی صادر ہوئی اس وقت سے حکم عام ہو گیا تھا کہ امرائے عظام میں سے کوئی بلا اجازت دروازۂ چادر گھاٹ سے باہر نہ جائے بلکہ ہر دروازہ پر ہرکارے مقرر کئے گئے کہ آیند و روند کی اطلاع ہوتی رہے ۔

اشیائے ملک کی پاسداری | اور یہ بھی حکم تھا کہ کوئی انگریزی چیز استعمال نہ کی جائے بلکہ اپنے ملک کی ساختہ شے استعمال کی جائے ۔ دفاتر و محکمہ جات و سررشتہ جات میں کاغذی گوڑے[1] کا ساختہ کاغذ استعمال کیا جاتا تھا ۔ نانڈیر کے سیلوں کے جامے اور نیمے پہنے جاتے تھے ایک نواب دربار رس کی جو شامت آئی کسی بمبئی کے سوداگر سے تنزیب یا ململ وغیرہ انگریزی ساخت کا کپڑا لے کر جامہ بنا کر دربار میں آئے ۔ بندگان عالی نے وہ کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کپڑا کہاں سے لائے ۔ شامت زدہ نے سکندرآباد کا نام لیا ۔ فرمایا کہ تمھارے پاس مفت کا روپیہ جمع ہو گیا ہے ۔ لہٰذا اس قدر جرمانہ داخل کر دو اور تا حکم ثانی خانہ نشین رہو ۔ یہ

---

[1] کاغذی گڑھ نام محلہ بیرون بلدہ پس پشت محلہ مستعد پورا ہے اب برباد ہو گیا ۔

بھی عجیب بات میں نے خود نواب وزارت پناہ سے سُنی کہ حضور پُر نور[۵۱] اکثر اپنے آقا یعنی بادشاہ دہلی کی قدم بوسی کی آرزو ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

انتقال امیر کبیر | اوپر بیان کر چکا ہوں کہ نواب امیر کبیر رشید الدین خاں مرض موت میں مبتلا ہو چکے تھے مگر جب تک زندہ رہے وہ اور مولوی صاحب معاملات ڈیوڑھی مبارک میں اور وہ اور شاہ پورجی معاملات انتظامی میں نواب وزارت پناہ کی سوہان روح رہے حتیٰ کہ مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ نواب امیر کبیر نے بمشورہ مسٹر پالمر بیرسٹر مقدمہ مسٹر نائٹ اخبار نویس کلکتہ پر قائم کیا اور ایک دھوم اس مقدمہ کی ممالک ہندوانگلستان میں مچ گئی۔ اس اخبار[۵۲] کی بدولت سر رچرڈ میڈ کی نسبت حکایات عجیب و نازیبا صاحبان انگریز میں مشہور ہو گئیں اور سچ یہ ہے کہ یہ سب تہمتیں سراسر غلط اور بے بنیاد تھیں۔ نہ لیڈی میڈ نہ سر رچرڈ ایسے کم ظرف تھے کہ تحفے تحائف[۵۳] قبول کرتے اور نہ شاہ پورجی یا امیر کبیر ایسے بدنما اور معیوب راستہ سے کامیاب ہونا پسند کرتے تھے مگر وزارت پناہ کے ہوا خواہوں نے "زمرد کا ہار" شہرت کی کھونٹی پر ایسا لٹکایا کہ زبان زد صاحبان انگریز ہو گیا۔ سچ ہے کہ سر رچرڈ خوشحال آئے تھے اور قرض دار واپس گئے۔

---

[۵۱] یہ حکایت حیدرآباد میں زبان زد خلق ہے کہ حضرت ناصر الدولہ اپنے خاص شاگرد پیشہ ہر منہ نامی سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہرمنہ جس طرح تو میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے میری بھی دلی آرزو ہے کہ میں بھی اپنے آقا کے سامنے دہلی میں اسی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوں۔

[۵۲] اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۸ راپریل ۱۸۸۴ء

[۵۳] یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ ایک روز امیر کبیر زمرد کا ہار پہن کر میڈ صاحب سے ملنے گئے۔ لیڈی میڈ نے ہار کی تعریف کی اور ان کو ہاتھ میں لینا چاہا۔ نواب صاحب نے ہار گلے سے اتار کر لیڈی میڈ کے گلے میں ڈال دیا پھر واپس نہیں لیا۔

ان کے بعد سر اسٹوارٹ بیلی ایک انصاف پسند مہذب اور شریف مزاج، شریف نواز آدمی کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوئے ۔ نواب امیر کبیر کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ امیر امرائے دربار عالمگیری کا آخری نمونہ تھے ۔ سادہ مزاج بلند حوصلہ عالی ہمت سپاہیانہ طبیعت رکھتے تھے حالت مرض میں ان کو شاپور جی برائے علاج و تبدل آب و ہوا بمبئی لے گئے ۔ سوداگران بمبئی نے کہ امیر کبیر کے نام اور شان و شوکت سے واقف تھے ان پر ہجوم کر دیا۔ یہاں ہر سوداگر کا کل مال بلا دریافت قیمت رکھ لیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ چند لاکھ کی نوبت آگئی جب شاپور جی نے گھبرا کر اس کے خلاف کچھ عرض کیا تو خفا ہو کر فرمایا کہ پھر تم کیوں مجھ کو بمبئی لائے ؟ کیا میں اپنے نام کو یا اپنے ولی نعمت کے نام کو دھبہ لگاؤں کہ ایک رئیس اعظم کا ادنیٰ خانہ زاد بخل کے اوصاف سے یاد کیا جائے ۔ یہ امیر تھے کہ اپنے نام اور بندگان عالی حضور پر نور کے مرتبہ کا خیال ہر امر میں رکھتے تھے ۔

ان کے انتقال کے بعد شاپور جی کے اقبال کا آفتاب گہنا گیا اور سر اسٹوارٹ بیلی کے تقرر سے نواب وزارت پناہ کی جان میں جان آگئی بلکہ دو جانیں ایک جسم میں جمع ہوگئیں اور شریک الخدمت یعنی کو رجینٹ کے تقرر کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور یہ لمن الملک الیوم للمختار الملک، تنہا ریجنٹ اور مستقل حکمراں ریاست ابد مدت ہوگئے اور امرائے پائگاہ کا باہمی جھگڑا بامداد سر اسٹوارٹ آسانی سے فیصل ہو گیا ورنہ جانبین میں، فوجیں اور توپیں طیار ہو گئیں تھیں اور اُدھر نواب غلام فخر الدین خاں میرے خسر اور اُدھر اُن کے چچا نواب معین الدین[۱] حسن خاں میرے مشورے سے باہمی صلح کے واسطے سراسیمہ و پریشان حسب الحکم نواب وزارت پناہ دوڑتے پھرتے تھے ۔ خطاب سر و شمس الامرا امیر کبیر

---

[۱] ان کی قبر محلہ تجلی پورہ میں حبا داللہ شاہ صاحب کے چبوترہ پر جانب غرب ہے ۔

اور نشست خواصی و مورچھال وغیرہ نواب خورشید جاہ کو اور خطاب سر آسمان جاہ امیر اکبر و ادخال طوطک وغیرہ نواب بشیر الدولہ کو عطا ہوئے' اور ملک برار کی نسبت یہ قرار پایا کہ نواب وزیر بحیثیت ملازمت اس معاملہ کو چھیڑنے کے مجاز نہیں ہیں بوقت بلوغ ہز ہائنس دیکھا جائے گا۔ یہ غلطی[۱] مہاراجہ چندولال سے دانستہ اور نواب سراج الملک سے بوجہ امیرانہ غفلت کے ہوئی تھی کہ ملک برار کو اخراجات کنٹن جنٹ فوج کے واسطے حوالہ سرکار دولت مدار انگلیشیہ کر دیا۔ اس دھبّہ کو مختار الملک مٹایا چاہتے تھے اور اس ہی غرض سے سفر انگلستان اختیار کیا گیا تھا مگر کامیاب نہ ہوئے۔

دربار قیصری میں اعلیٰ حضرت کی شرکت

لفظ "سوزیرن" کا فیصلہ عجیب طرح سے ہوا۔ یعنی نواب وائسرائے گورنر جنرل صدر صوبہ دار ممالک ہند نے ایک دربار اس غرض سے منعقد کیا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ عظمیٰ نے بجائے شاہان مغلیہ بدعوائے شہنشاہی خطاب قیصرۂ ممالک ہند اختیار فرمایا پس رئیسان ہند راجگان و نوابان اس دربار میں حاضر ہوں تاکہ یہ دعویٰ ثابت ہو جائے۔ اس دربار میں

---

[۱] نواب وزارت پناہ خود فرماتے تھے کہ کامیابی تو ناممکن ہے مگر کوشش کرنے میں دل کو تسکین ہو جاتی ہے گویا یہ شعر اُن کے حسب حال تھا ؎

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی — یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

اور کہتے تھے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے معنی آج تک میری سمجھ میں نہ آئے گویا ایک سراب ہے کہ دوپہر کو دکھائی دے اور سہ پہر کو غایب ہو گئی وائسرائے پانچ برس کے لئے آتا ہے اگر ذہن رسا رکھتا ہے اور ذکی اور فہیم ہے تو وہ اپنی پالیسی اختیار کرتا ہے اور ہوم گورنمنٹ اس کی مجبوراً پابند ہوتی ہے اور اگر وہ بلید الذہن اور محنت سے گریزاں ہوتا ہے تو وہ اپنے ممبروں کی رائے پر چلتا ہے اور میر سکرٹریوں کی رائے کا پابند ہوتا ہے پس یا د نئی پالیسی و بیکار ہوتی ہے جس سے نہایت تکلیف ہوتی ہے اور یہ بھی اکثر فرماتے تھے کہ ہمارے دربار میں جب کبھی کوئی فوجی آدمی رزیڈنٹ آتا ہے تو مجھ کو نہایت آرام ملتا ہے اس لئے کہ یہ افسر معمولاً خلیق اور ملنسار ہوتے ہیں اور جب کبھی سویلین بھیجا جاتا ہے تو مجھ کو ہر طرح کی دشواری پیش آتی ہے۔

ہز ہائنس دی نظام کی بھی طلبی ہوئی۔ اب نہ عمدۃ الملک سا معاون نہ بڑی بیگم صاحبہ سی مدد گار زندہ تھے کہ نواب وزارت پناہ مقابلہ بجد و کد کرتے۔ یہ عذر کہ حضرت نظام کبھی اپنے ممالک سے باہر تشریف نہیں لے گئے نامسموع ہوا۔ غرض سفر دہلی کی طیاری کی گئی۔ عنایت شاہ کا کلچہ[⁵¹] نکالا گیا۔ فدائی درویش کا نقارہ درست کیا گیا۔ جمعیت تبر برداران جس کو انگریزی میں سیپر و مائنر (سفر مینا) کہنا چاہیئے طیار کی گئی۔ میر منزل نواب قدیر جنگ جو اس خدمت پر اباً عن جدٍ ممتاز تھے۔ نواب جہاں[⁵²] دار خاں مہتمم خیمہ و خرگاہ اور منتظم اردوئے معلیٰ آگے روانہ ہوئے۔ منازل و قیام گاہ از حیدرآباد تا دہلی شریف قرار دیئے گئے۔ فیلان کوہ پیکر و اسپان سبک پا، بگھی خانہ و اصطبل و فیل خانہ و فراش خانہ وغیرہ کل کارخانجات شاہی روانہ کئے گئے۔ افواج قاہرہ میں سے سدّیوں کا رسالہ، میسرم کی پلٹن کرنل نیول کا دستۂ فوج باقاعدہ، ادلے مقدم جنگ، برق جنگ، غالب جنگ و سلطان نواز جنگ مع اپنے مختصر جمعیت عرب۔ امرائے پاگاہ مع مختصر جمعیت پاگاہ۔ و چیدہ چیدہ جمعداران نظم جمعیت ہمرکاب سعادت ہوئے۔

ہر منزل شاہی فرودگاہ کو بڑی تکلف سے آراستہ کیا تھا اور بڑے بڑے امرا کی مناسب فاصلے سے علیٰ قدر مراتب جدا جدا مسلیں تیار کر دی گئی تھیں۔ اور ہر مقام پر ڈاک اور تار کا انگریزی انتظام تھا۔

اس شان و شوکت کے ساتھ سواری مبارک مع محلات و امرائے ذی شان بلدۂ فرخندہ بنیاد سے روانہ ہو کر شہر پونہ پہونچی۔ وہاں ایک پارسی دستور نے بڑی دھوم سے

[⁵¹] اس کلچہ کا بالکل نمونہ بجنسہ شاہی علم پر بنا ہوا ہے اور اصل کلچہ خزانہ میں محفوظ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بزرگ حضرت عنایت شاہ نامی نے یہ کلچہ حضرت آصف جاہ اوّل کو عنایت کیا تھا۔

[⁵²] نواب ذوالقدر جنگ کی زوجہ عثمانی بیگم کے حقیقی دادا۔

تین روز حضور پُرنور اور جمیع امرار و مصاحبین کی دعوت کا انتظام نہایت بلند حوصلگی سے کیا اوقات مقررہ پر چائے خوری و میوہ خوری اور صبح شام کا کھانا امرا سے لے کر ادنیٰ ملازم تک خود میزبان کے ملازمین پہونچا دیا کرتے تھے۔ اس کا معاوضہ نواب وزیر نے بھی اسی دریا دلی سے ادا کیا۔ وہاں سے منزل بہ منزل بسواری ریل ہر مقام پر ایک دو روز آرام فرما کر جبل پور پہونچے۔ ہر منزل پر حکّام انگریز مثل کمشنر ڈپٹی کمشنر وغیرہ خدمت گذاری و حفاظت اُردو معلیٰ کے واسطے قیام گاہ پر حاضر رہتے۔ جبل پور میں ان ہی حکام نے انتظام سیر نربدہ کا کیا۔ وہاں سے سواری مبارک آگرہ رونق افروز ہوئی۔ یہاں انتظام سیر مقبرہ شاہجہاں و قلعۂ معلیٰ کیا گیا۔ ایک ناانصاف مورخ نے کاریگران اہل ہند کی حقارت کے واسطے تحریر کیا کہ یہ مقبرہ اہل یورپ کی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ خاک بر سر ایں مورخ کہ اتنا بڑا دروغ صرف بحقارت اہل ہند اپنی تاریخ میں لکھ گیا ہے۔ ایک نقب کی صورت میں ایک راستہ زیر زمین قلعہ شاہجہاں آباد سے لے کر قلعۂ آگرہ تک اور وہاں سے قلعۂ الہ آباد تک نہایت روشن اور وسیع کہ شاید دو سوار پہلو بہ پہلو آسانی سے آتے جاتے ہیں بنا ہوا ہے اور یہ سب ہندی کاریگروں کے اسی کمال کا نمونہ ہے جس کی تحقیر اس ناانصاف مورخ نے کی ہے۔ وہاں سے پائے تخت شاہان مغلیہ گورگانی دہلی شریف پہونچے کل حکّام انگریز[۵] مع فوج باقاعدہ و نشان و پھریرہ برائے استقبال و خیر مقدم شاہ دکن اسٹیشن پر حاضر ہوئے مقامات شہر اور آستانہائے اولیا کرام کی زیارت یا باہمی رؤسائے عظّام کی ملاقات کا حال مفصّل تحریر کرنا میرے مقصود سے زاید ہے۔ صدر صوبہ دار ممالک ہند نواب وائسرائے گورنر جنرل بہادر جس روز فرودگاہ شاہی پر برائے ملاقات آئے تھے یہ دربار بھی اُن ہی

---

[۵] وائسرائے کا اسٹاف اسٹیشن پر موجود تھا۔

اصول پر کیا گیا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

نواب وزارت پناہ نے میرے عم بزرگوار میرزا عباس بیگ جاگیردار بڑا گاؤں ملک اودھ جو منجانب گورنمنٹ اس دربار میں مدعو ہوئے تھے ان کی ملاقات و قدمبوسی حضور پرنور سے کرائی مگر جو خلعت و جواہر نواب وزارت پناہ نے اُن کے واسطے تجویز کیا اس کو بلا اجازت سرکار قبول کرنا ناممکن تھا اور اس کے واسطے عم بزرگوار نے کوئی طویل کارروائی مناسب نہ سمجھی۔ ماموں صاحب یعنی سرسید احمد خاں نے دستار و کمر سے انکار کیا اور صرف ترکی ٹوپی اور کالے کوٹ اور پتلون سے قدم بوسی کرنی چاہی۔ نواب وزارت پناہ نے اپنے قاعدۂ قدیم کے شکست کو نامنظور فرمایا۔ بالآخر ماموں جناب مولانائے معظم مولوی سمیع اللہ خاں[1] صاحب کہ جانشین مفتی صدرالدین خاں اور اُس وقت تمام اقلیم میں مستند صاحب فتوے تھے سید صاحب کی عوض منجانب دارالعلوم علی گڑھ قدمبوسی کے واسطے تجویز کئے گئے۔ جناب مولانا اس سے قبل عجب طرح نواب وزارت پناہ سے ملاقات کر چکے تھے۔ جس زمانہ میں نواب وزارت پناہ بطور خود اقلیم ہند کی سیر و سیاحت کے واسطے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے شہر آگرہ میں وارد ہوئے۔ ایک ہائی کورٹ اس شہر میں قائم تھا۔ چیف جسٹس نے اپنی شان عدالت و طرز کارروائی دکھانے کے واسطے نواب مستطاب معلی القاب کو عدالت میں مدعو کیا اور ایک ایسا مقدمہ جس میں ایک طرف مولانا معظم اور دوسری طرف ایک کشمیری پنڈت جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے نکل گیا (شاید پنڈت اجودھیا ناتھ ؟) عربی فارسی میں ہم پلہ مولانا

---

[1] مولوی صاحب اور والدہ ماجدہ حقیقی عم زاد برادر و ہمشیرہ تھے۔ ان کو لارڈ نارتھ بروک مصر میں اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور وہاں نمایاں خدمات کے صلہ میں اُن کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب اور تمغہ برٹش گورنمنٹ نے عطا کیا تھا۔

معظم کے اور ادب قانون وانگریزی میں ہم سر چیف جسٹس کے تھے اس روز اپنے سامنے پیش کیا۔
یہ دونوں علمائے متبحر اس فصاحت اور بلاغت سے زبان اردو میں بحث کر رہے تھے کہ گویا دو بلبل
ہزار داستان چہک رہے ہیں۔ نواب عالی جناب نے ان دونوں کو اپنی ملازمت کے واسطے مدعو کیا مگر
دونوں صاحبوں نے انکار کیا۔ پنڈت صاحب بانی مبانی اس جلسۂ عظیم کے ہوئے جو آج تک بنام جلسہ
قومی اقلیم ہند یعنی انڈین نیشنل کانگریس اقلیم ہند میں قائم ہے اور جناب مولانا بانی مبانی اُس
دار العلوم کے ہوئے جو اب شہر علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

دہلی کے سفر سے مع الخیر بلدہ فرخندہ بنیاد واپس آئے۔ اس وقت تک انتظام ریاست ان
خاص اصول پر مبنی تھا جو اوپر بیان ہو چکے ہیں یعنی اہل دکن کی تعلیم ایسے اصول کی کی جائے کہ
وہ ممد و معاون انتظام ملک میں رہیں۔ اس غرض سے دار العلوم عربی فارسی اور اردو کا قائم کیا گیا تھا
اور مدرسہ ڈاکٹری بہ زبان اردو زیر نگرانی سول سرجن رزیڈنسی کھولا گیا تھا جہاں سے طلبا سند حاصل کر کے
اضلاع ملکی شفا خانوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ منصب داروں اور امراء کے لڑکے
گاہ گاہ انگلینڈ برائے تکمیل بھیجے جائیں چنانچہ میر داور علی کا انتخاب بھی کیا گیا تھا چوں کہ اس
وقت تک ملکی اور غیر ملکی کے الفاظ نہیں گھڑے گئے تھے پنجاب واودھ وغیرہ قطعات اقلیم ہند
کے باشندے ہندو و مسلمان برادرانہ اور ہم قومی کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ دکن کے
ہنود تو داماد اور بہوئیں بھی ممالک مذکورہ سے انتخاب کر کے لایا کرتے تھے۔ اور اپنے حقوق قدیمہ
اُن پر منتقل کرایا کرتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نرندر کے داماد راجہ ہری کشن والد مہاراجہ کشن پرشاد
نظیر اس کی موجود ہیں۔ اسی سلسلہ میں سید علی بلگرامی اور مرزا مہدی خاں ایرانی بھی انگلینڈ بھیجے گئے
تھے۔ اس وقت تک اعلیٰ عہدوں پر زیر نگرانی امرا زادگان یعنی نواب بشیر الدولہ و مکرم الدولہ و
شہاب جنگ و شمشیر جنگ اکثر حضرات مدراس جو کہ ہم رفتار و گفتار اہل دکن تھے گو معاشرت خانگی

میں مختلف تھے) مقرر و ممتاز تھے اور یہ سب حضرات سیدھے سچے باوفا اور بہی خواہ اپنی سرکار کے تھے۔ کبھی ان کے ذہن میں اپنے دائرہ سے قدم آگے بڑھانا یا خیر خواہی کے پردہ میں اس سے ذاتی منافع حاصل کرنا نہیں آتا تھا۔ افواج نظم جمعیت میں راجپوتانہ کے پٹھان بکثرت اور اعلیٰ عہدہ پر معزز تھے۔ مگر اب انتظام ملک کے دفاتر و محکمہ جات میں شمالی ہند کے حضرات بھی بیشتر بسفارش سر سید احمد خاں آنے لگے۔ چنانچہ اس میں سر برآوردہ مولوی مہدی علی نواب اکرام اللہ خاں کاکوروی و نواب فدا حسین خاں اور اُن کے بعد مولوی مشتاق حسین امروہوی تھے جو آتے ہی اعلیٰ عہدوں پر ممتاز اور مشیر و صلاح کار نواب وزارت پناہ ہو کر مدراسیوں پر غالب آگئے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

نواب وزارت پناہ مولوی مہدی علی کی رفتار اورنگ آباد میں دیکھ کر ہوشیار ہوگئے تھے اور ان میں سے چند اشخاص کو خدمات سے سبکدوش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا بلکہ اپنے سفید جامے کا دامن دکھا کر فرماتے تھے کہ مہدی علی صاحب نے اس سفید جامہ پر سیاہ دھبہ لگا دیا ہے جب سے اب نواب وزارت پناہ نے سر سٹوارٹ بیلی سے مشورہ لیا اور چوں کہ نواب امیر کبیر رشید الدین خاں کا انتقال ہو چکا تھا اور سر رچرڈ میڈ شکست کھا کے رخصت ہو چکے تھے اور حل و عقد انتظام ریاست پورا بلا شرکت غیرے نواب وزارت پناہ کے قبضہ میں آ چکا تھا انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اسلامی اصول شریک کر کے ایک نیا ضابطہ انتظام ریاست مرتب کریں۔ سر اسٹوارٹ نے چند بنگالہ کے عالی خاندان ذی علم و ذی وجاہت اشخاص کے نام پیش کئے ان میں مولوی دلیل الدین خاں (احترام جنگ) و مولوی کریم الدین خاں[۱] وغیرہما تھے۔ یہ حضرات نہایت سچے اور سیدھے اور ذی علم تھے جن کے آنے سے ایک خاص رونق ریاست کو ہوگئی

---

[۱] سابق چیف جسٹس ۱۲

یہاں یہ بات بھی قابل گزارش ہو - نواب وزارت پناہ سے اب البطہ گورنمنٹ
آف انڈیا کے ساتھ ایسا درست ہوگیا تھا کہ انھوں نے خود صدر صوبہ دار ممالک ہندوستان
چند امور میں مشورہ لینے کی غرض سے سفر شملہ اختیار کیا تھا اور مہاراجہ نرندر بہادر کو عنان
انتظام سپرد کر دیا تھا - الغرض جس روز نواب وزارت پناہ بلدہ واپس رونق افروز ہوئے
اتفاقاً حضور کہ اس وقت بدولت اقبال کوہ مولیٰ پر مقیم تھے بسواری لینڈو مع مولوی[1]
صاحب ور اقم روبرو بیٹھے ہوئے برائے ہوا خوری لنگم پلی کے باغ تک تشریف لائے ادھر
سے نواب وزارت پناہ اسٹیشن سے آئے جین دروازۂ باغ میں سامنا ہوا - نواب وزارت
پناہ فوراً گاڑی سے اُتر کر بقاعدہ مقررہ سات کورنشات بجالائے ! دھر گاڑی حضور پر نور
کی بھی برائے قبول کورنشات ٹھیر گئی - نہ معلوم میرے دل میں کیوں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے
حضور پر نور سے عرض کیا کہ نواب وزارت پناہ اپنے مسل پر کوہ مولیٰ جا رہے ہیں ہم اُتر جاتے
ہیں حضور اپنے وفادار وزیر خانہ زاد کو ہمرکاب سعادت لے لیں - یہ امر مولوی صاحب کو ناگوار ہوا
اور مجھ کو اس سے باز رکھنا چاہا - مگر میں نے بہ تعجیل تمام نواب وزارت پناہ کو آواز دی کہ آئیے
حضور پُر نور یاد فرماتے ہیں ! ب مجبوراً مولوی صاحب کو بھی اُترنا پڑا نواب وزارت پناہ خنداں و فرحاں
باوجود پائے لنگ دوڑتے ہوئے اور آداب بجالا کر گاڑی میں بیٹھ گئے - خلاصہ یہ کہ وہ بیزاری
جو امیر کبیر و سر رچرڈ میڈ کے وقت میں حضور پر نور کو نواب وزارت پناہ سے ہوگئی تھی اب رفتہ رفتہ کم ہوتی
گئی ! دھر مولوی مسیح الزماں خاں کی قوّت گھٹ گئی ! ور ادھر ایک مرد شریف انصاف پسند نہایت مستقل
مزاج رزیڈنٹ یا ہم مسٹر جونز آ گیا گو کیپٹن کلارک مجھ سے اور مسٹر کرورن سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے مگر اب
کمال اطمینان سے ہم لوگ تعلیم و تربیت میں مصروف ہوگئے حضور پر نور کا سن شریف بھی جوانی پر آ گیا تھا اور اپنے مرتبہ
بادشاہی کی قوت سمجھنے لگے تھے اور اس حقیر راقم کی قدر کرنے لگے تھے بلکہ محبت اور ہر قسم کی عنایت فرماتے تھے -

---

[1] مولوی مسیح الزماں خاں -

سفرِ انگلستان کی تحریک

سفر انگلینڈ کی جو تحریک زمانہ سر اسٹوارٹ بیلی میں ہوئی تھی۔ اس کا مختصر حال بھی قابل شنید ہے ایک روز کپتان کلارک نے مجھ سے کہا کہ آج کا درس میں خود بلا موجودگی تمہارے یا مسٹر کرون کے دونگا ہم لوگ اپنے اپنے کروں میں نیچے اتر آئے۔ کلارک صاحب حضور پُرنور اور نواب ظفر جنگ بہادر کو لیکر بیٹھے ایک عرصہ کے بعد رحیم بخش میرے حلقہ کا ملازم دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ کپتان صاحب آپ کو بلاتے ہیں میں اوپر گیا تو انہوں نے ایک خط بنام رزیڈنٹ بزبان انگریزی بقلم حضور پرنور مجھ کو دکھایا اور کہا کہ کیا اچھا خط حضور پرنور نے خود اپنی طبیعت مبارک سے لکھا ہے۔ میں نے پڑھ کر تعریف کی اور ہنس کر کہا کہ مجھ سے بہتر اور آپ کی خود عبارت کے مثل لکھا ہے۔ مجھ سے کہا کہ اس ہی مضمون کا خط آپ اردو میں بنام پرائم منسٹر لکھوایئے۔ چنانچہ میں اس خط کا مضمون بتاتا گیا اور حضور پرنور تحریر فرماتے رہے۔ خط ختم ہوتے ہی کپتان صاحب نے چوبدار کو بلایا اور وہ خط نواب وزیر کے پاس بھجوا دیا اس وقت تک میں اور حضور پرنور خالی الذہن تھے اور یہ سمجھے تھے کہ صرف بطور مشق معمولی یہ کام ہوا ہے تاکہ رزیڈنٹ ترقی لیاقت سے واقف ہو جائے۔ اس کے دوسرے روز نواب وزارت پناہ نے مجھے یاد فرمایا اور پوچھا کہ یہ خط[1] تم نے کیوں لکھوایا۔ میں نے اصل حال بیان کر دیا ایک آہ سرد نواب وزارت پناہ نے کھینچی اور فرمایا کہ کاش اس سے قبل میں مرجاتا تو بہتر تھا۔ کیا تدبیر کی جائے کہ یہ رائے بدل دی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو آپ کے قبضہ کی بات ہے۔ فرمایا کہ یہ بات گورنمنٹ آف انڈیا

---

[1] مضمون بطور حکم مدار المہام کے نام یہ تھا کہ انگلینڈ جانے کا انتظام فوراً کیا جائے۔

تک پہونچ گئی ہو اب سفر نہیں رُک سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ میری تجاویز انتظام ریاست سب ملتوی اور میری تمنا دل کی دل میں رہ گئی۔ ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ معلوم نہیں کہ بعد واپسی سفر کیا واقعات پیش آئیں اور یہ فلک کجرفتار میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ مجھے یاد پڑتا ہی کہ اسی مضمون کا خط وزارت پناہ نے اپنے پارسی رازدار کو جو کسی زمانہ میں معتمد خاص بھی رہ چکا تھا لکھا تھا وہ خط اس سن رسیدہ پارسی کی اولاد کے پاس موجود ہو تو تعجب نہیں خلاصہ اینکہ اب سفر انگلینڈ کی تیاریاں اس دھوم دھام سے اور اس پیمانہ پر ہونے لگیں جو شاہ ایران و خلیفۃ المسلمین امیر المومنین سلطان روم کی شوکت واجلال سے کم نہ تھیں۔

وزارت پناہ کا انتقال | اب یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کی قدرت کاملہ کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہے کہ ایک شب کو قریب ایک یا دو بجے میرے پاس موہن لال پنڈت آیا۔ اس پنڈت کو میں نے سفارش کرکے ملازم رکھایا تھا۔ نواب وزارت پناہ مثل دیگر مشاہیر عالم خود بھی ستارہ شناس اور نجوم ورمل کے معتقد تھے اور بعض رمال مثل گلاب شاہ وغیرہ پنجابی اور اکثر جوتشی پنڈت ملازم سرکار وزارت تھے اور حسب دستور ان کے سلام کے واسطے بھی ایام و اوقات مقرر تھے۔ اس شب کو اس کی سلام کی باری تھی پٹاپل راما راو محاسب کے کاغذات پر دستخط فرماکر اور مراسلات رزیڈنسی و دیگر احکام ضروری جاری فرماکر گویا اس روز کا کام ختم کرکے پنڈت کو باریابی سے مشرف فرمایا اور حکم کشید زائچہ کا دیا پنڈت نے جیساکہ دستور اس قوم کا ہوتا ہے اچھے اچھے احکام ترقی اقبال و کامیابی دارین کے لگائے تبسم فرماکر زائچہ اس سے لیکر خود ملاحظہ فرمایا اور دیکھکر کہا کہ پنڈت جی خانہ حیات تو خالی ہے یا کچھ ایسے ہی لفظ کہے پنڈت نے

دفع دخل کی کوشش کی۔ اس عرصہ میں وزارت پناہ نے آواز دی شاگرد پیشہ حاضر ہوا۔ چوکی پر آفتابہ رکھنے کا حکم دیا اور پنڈت کو رخصت کر دیا۔ وہ سیدھا دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور یہ واقعہ بیان کیا میں نے غصہ میں اس سے کہا کہ یہ تیری کیا نامعقول حرکت تھی کہ محض اتنی سی بات کہنے کے واسطے تو نے میری نیند خراب کی۔ اس نے کہا کہ خدا کرے میرا اندیشہ جھوٹا ہو۔ الغرض صبح حسب معمول میں پرانی حویلی گیا اس ہی وقت کپتان کلارک صاحب اور مسٹر کرون بھی آگئے حضور پر نور ہنوز آرام میں تھے اور منصب داران چوکے کی گرد پلنگ نشست تھی کہ اتنے میں ٹیپو خاں[1] خستہ حال پریشاں بال چشم گریاں بر لب آہ وفغاں دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کو جلد بیدار کرو ان کا نمک حلال باوفا جاں نثار وزیر تصدق ہوا۔ کلارک صاحب نے گھبرا کر مجھ کو دیکھا۔ میں نے ٹیپو خاں کا ہاتھ پکڑا۔ اور کہا سانس درست کرو اور واقعہ بیان کرو۔ وہ پھوٹ کر رو پڑا اور بولا جلد حضور کو اطلاع کرو میں نے دوڑ کر حضور کو بیدار کیا۔ بندگان اقدس آنکھیں ملتے ہوئے نیچے تشریف لائے ٹیپو خاں نے تمام حال شب کا بیان کیا اور کہا ڈاکٹر حکیم سب حاضر تھے کسی کی کچھ نہ چلی۔ حضور پر نور نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "حضرت آپ جائیے اور پوری کیفیت لائیے"۔ کلارک صاحب کی گاڑی موجود تھی میں سوار ہو کر دولت وزارت پر پہونچا جوہیں میں نے کمرہ میں قدم رکھا حکیم باقر علی[2] خاں روتے ہوئے باہر نکلے میرے سوال پر انہوں نے کہا تم خود جا کر دیکھو کم بخت ڈاکٹر نے کام تمام کر دیا ہاتھ پکڑتے پکڑتے منع کرتے کرتے ظالم نے یخنی پلا دی۔ میں اندر گیا وزیر باتدبیر پلنگ پر دراز تھے ان کی شکل دیکھتے ہی میں جھجک کر

---

[1] شاہی چابک سوار۔

[2] باقر نواز جنگ طبیب خاص وزارت پناہ۔

پیچھے ہٹ گیا۔ ہر دو فرزندان "ہائے بابا" "ہائے بابا" پکار رہے تھے۔ تمام ڈیوڑھی میں اندر باہر اوپر نیچے ایک قیامت برپا ہوگئی۔ میں نے صاحبزادگان کی تشفی کرنی چاہی مگر وہ وقت تشفی کا کہاں تھا۔ میں پھر ڈیوڑھی مبارک پر واپس آیا اس وقت کپتان کلارک اور مسٹر کرون بھی رو پڑے اور چشم مبارک حضور پر نور سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔ کپتان کلارک اور مسٹر کرون تو روانہ ہوئے۔ مولوی مسیح الزماں خاں اور امرائے عظام سرخورشید جاہ و آسمان جاہ و وقار الامرا و مہاراجہ پیشکار بھی حاضر در دولت فلک رفعت ہوئے۔ یہاں تو ایک حالت سکوت تھی مگر دوسری طرف میجر گاف و کپتان کلارک و سید حسین صاحب بلگرامی مسٹر جونس[1] کے پاس پہونچے اور کہا کہ آپ فوراً اعلان کیجئے کہ نواب لائق علی خاں فرزند کلان مرحوم مغفور بجائے اپنے والد کے بالاستحقاق جانشیں کئے گئے۔ ورنہ بلدہ میں فساد کا بڑا اندیشہ ہے مسٹر جونس یہ سن کر نہایت برہم ہوئے اور کہا کہ "یہ تو ہندوستانی پردیسی آدمی ہے اور تم ایک دفتر کے منشی ہو اور تم ایک معلّم ہو تم لوگوں کو معاملات ملکی سے کیا تعلق ہے اور مجھ سے ان معاملات میں گفتگو کرنے کا کیا حق ہے جاؤ اپنا راستہ لو اگر میں نے سنا کہ تم لوگوں نے کوئی سازش قائم کی تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا" کپتان کلارک سے کہا کہ "بحیثیت معلّمی تم کو درس و تدریس سے تعلق ہے اگر اس کے خلاف میں نے سنا تو میں تم کو معطل کر دونگا" تینوں صاحب شرمندہ وہاں سے چلے آئے۔ مسٹر جونس اول تو خانوادۂ فرزندان صاحب الامر مرحوم کے پاس پرسا دینے کو در دولت وزارت پر گئے اور وہاں سے سیدھے پرانی حویلی آکر نہایت دردناک الفاظ میں ہز ہائینس کو ان کے جاں نثار وفادار خانہ زاد وزیر باتدبیر کا پرسا دیا۔ اور بعدہٗ مہاراجہ پیشکار کو کہ سن رسیدہ کمر خمیدہ

---

[1] رزیڈنٹ ۳؍جولائی ۱۸۸۲ء لغایۃ اپریل ۱۸۸۳ء

شریک خدمت وزیر مرحوم تھے ذمہ دار امن و امان بلدہ و انتظام ریاست کا کیا۔ یہ معاملہ چل رہا تھا کہ میں حسب دستور یوم مقررہ پر مسٹر جونس سے ملنے گیا تو نہایت ترش رو ہو کر مجھ سے کہا کہ "استادوں کو کیا حق مداخلت امور انتظامی میں ہے۔ کپتان کلارک کو میں نے جھڑکا دیا تو مولوی مسیح الزماں خاں میرے پاس سر آسمان جاہ و وقار الامرا کی طرف سے آئے تھے اب تم کس کی طرف سے آئے ہو؟" میں نے کہا کہ "حسب معمول حاضر ہوا ہوں" تو پھر کہا کہ "اگر میں نے سنا کہ کسی استاد نے ان معاملات میں دخل دیا تو میں اس کو نکال دونگا۔[۱۵]

---

[۱۵] جس روز نواب مختار الملک کا انتقال ہوا اُس روز مسٹر بیرنگ فینانس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا جو بعد ازاں بخطاب لارڈ کرومر مصر میں کارگزار رہے تھے اور ایک یوروپین پرنس حیدرآباد میں نواب وزیر کے مہمان تھے۔ انتقال کے ایک روز قبل بعد بریک فاسٹ نواب صاحب اپنے تمام مہمانوں کو تالاب میر عالم اپنے ساتھ لے گئے تھے جہاں نہایت پر تکلف دعوت کا انتظام ہوا تھا۔ جب سب تالاب سے واپس ہوئے تو نواب صاحب نہایت صحیح اور تندرست سید ھے چومحلہ مبارک آئے۔ حضور پرنور زنانہ میں تھے اور میں تنہا افضل محل کے چبوترہ پر کھڑا تھا میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو حضور پرنور کو اطلاع کی جائے فرمایا کہ حضور پرنور کو تکلیف دینا نہیں چاہتا اور چند نہایت عمدہ سنگ مرمر کی میزوں کی طرف اشارہ فرما کر ارشاد ہوا کہ تم ان میزوں کو میری طرف سے بطور نذر گزران دینا۔ شب کو نواب صاحب نے اپنے مہمانوں کے ساتھ ڈنر تناول فرمایا۔ ڈنر کے بعد میں نے سنا کہ زنانہ سے کوئی کھانا پیش ہوا جو اُن کو نہایت مرغوب تھا اُس کو تناول فرمایا۔ اس کے بعد ہی سوء ہضم کی شکایت محسوس ہوئی جو بالآخر باعث موت ہوئی۔ اس حادثۂ عظیم کی متعلق جو تفصیل مسٹر بلنٹ نے بحوالہ میڈم گینا (Mademoiselle Gainand) نواب صاحب کی فرانسیسی نرس اپنی کتاب انڈیا انڈر رپن (India under Ripon) میں صفحہ ۲۰۰-۲۰۱ پر تحریر کی ہے اُس کا اعادہ اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا۔ نرس نے بیان کیا کہ سالار جنگ بہترین انسان اور بڑے اولوالعزم آدمی تھے کبھی کسی نے اُن کی زبان سے سخت لفظ نہیں سنا اور نہ اُن سے کبھی کوئی فعل خلاف دیانت سرزد ہوا۔ سب حتیٰ کہ اُن کے دشمن بھی اُن کے ثناخواں تھے چنانچہ نواب امیر کبیر رشید الدین خاں نے مرض الموت کی حالت میں اُن کو بلایا اور اپنے بچوں کو اُن کے سپرد کیا۔ نرس مذکور کا بیان بطور یقین یہ ہے کہ نواب صاحب کو زہر دیا گیا۔ سہ شنبہ کو وہ ریذیڈنسی ڈنر میں شریک تھے۔ چہارشنبہ کو تالاب میر عالم سے واپس آکر رات کو علیل ہوئے اور پنجشنبہ کو صبح کو سوا سات بجے انتقال کیا۔ کوئی علامت مرض ہیضہ کی موجود نہ تھی استفراغ نہیں ہوا۔ (باقی نوٹ صفحہ آئندہ)

اب مہاراجہ پیشکار سے تمام حل وعقد ریاست کا متعلق ہو گیا خود غرض ملازمین کے دلوں میں محض خیالی خوف ایسا پیدا ہوا کہ اپنے وہی بچاؤ کی فکروں میں پڑ گئے اور وہ سازشیں اور تدبیریں جو نہ فقط اپنے بچاؤ کے واسطے بلکہ اپنی ہوسیں نکالنے کے واسطے شروع ہوئی تھیں عہد میمنت مہد حضرت بندگانِ عالی غفران مکان جنت آرام گاہ کے ختم ہونے تک برابر قائم رہیں وہ ذات صاحب قوت واختیارات تو یکایک ایک شب میں اٹھ گئی۔ ایک سن رسیدہ خمیدہ قامت پرانے خیالات کا آدمی پر سرکار ہوا۔ جس کو کونے میں بٹھا دینا آسان سمجھا گیا۔ دروازۂ رزیڈنسی کھل گیا۔ مسٹر جونس خود تازہ وارد رزیڈنٹ تھے۔ دیگر امرائے عظام سوائے سر خورشید جاہ بے علم ناتجربہ کار اپنے خانگی انتظام میں غیروں کی مدد کے محتاج لہذا ہر شخص اپنے حوصلہ کے مطابق منافع ذاتی کی فکر میں پڑ گیا۔

ڈیوڑھی میں سب سے پہلے مولوی مسیح الزماں خاں نے قدم بڑھایا افسر اساتذۂ فارسی وقرآن مجید تھے اپنی دانست میں خوب رعب اپنا حضور پر نور پر جما چکے تھے بڈھے مہاراج کی کچھ اصل نہ سمجھتے تھے۔ اتفاقاً صمصام الدولہ جو حضرت افضل الدولہ کے چچا اور ان معنوں میں حضور پر نور کے دادا تھے یکایک انتقال کر گئے تھے۔ اُن کی ہمرکابی میں جو

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) بجز اس کے کہ انہوں نے خود انگلی حلق میں ڈال کر قے کرنی چاہی تھی۔ نواب صاحب شدت پیاس کے ساتھ حلق اور صدر پر سوزش کی شکایت کرتے تھے۔ بعد موت اُن کے رنگ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ دو انگریز ڈاکٹروں میں ایک نے ہیضہ تشخیص کیا مگر دوسرے کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ ڈاکٹر اُس وقت طلب ہوئے جبکہ امید زندگی باقی نہ رہی تھی۔ زنانہ میں کہرام بپا تھا۔ دو فقیر موجود تھے جو نواب صاحب کو کاغذ پر عربی میں کچھ لکھ کر اور اُس کو پانی میں دھو کر پلا رہے تھے۔ تقریباً آٹھ سو عورتیں محل میں جمع تھیں۔ جب نواب صاحب کے انتقال کی خبر زنانہ میں ہوئی (انتقال مردانہ حصہ مکان میں ہوا) تو عورتوں نے شدت غم میں زمین پر لوٹنا شروع کیا اپنے جسم کے کپڑے چاک کئے اور چوڑیاں توڑیں۔ ایک ہفتہ ماتم رہا۔ یہ بیان نرس کا ہے جو اُس وقت خود موجود تھی۔

جمیعت تھی اس میں سے پانسو سوار مولانا نے تاکے اور مہاراج پر زور ڈالا کہ فوراً احکام جاری کر دیں۔ مہاراج گو بظاہر سب کی خاطر داری کرتے تھے مگر نہایت مستقل مزاج اور پابند قواعد و ضوابط آدمی تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ یہ امر میرے اختیار سے باہر ہے آپ حضرت بندگان عالی کا حکم مجھ کو بھجوا دیجئے۔ مولوی صاحب نہایت برہم ہوئے اور بجبر مہاراجہ سے حکم لکھوانا چاہا۔ اُدھر محلات مبارک نے فریاد کی کہ وزیر اعظم کے مرنے کے بعد بیگمات کی لوٹ شروع ہو گئی اور حضرت بندگان عالی سے یہ سب حال عرض کر دیا مہاراج نے مجھ غریب کو اس معاملہ میں کھینچنا چاہا۔ میں پہلو تہی کر گیا۔ اس واسطے کہ مولوی صاحب نے پہلے ہی کپتان کلارک صاحب کو ہموار کر لیا تھا۔ بس میں نے مشورہ دیا کہ وہ خود حاضر ہو کر اس معاملہ میں مشورہ حضور پر نور سے کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مولانا کو اور زائد غصہ آیا اور درس کے وقت حضور پر نور کو دھمکایا اور لفظ ناشدنی کہہ بیٹھے۔

مولوی مسیح الزماں خاں کی برطرفی

اس پر حضور پر نور نے کتاب بند کر دی اور بچشم گریاں اُٹھ کھڑے ہوئے اور درس کے کمرہ سے باہر تشریف لے آئے۔ مصاحبین و حاضر باشاں نے جو یہ حال دیکھا سب دوڑ پڑے۔ حضور پر نور نے فرمایا کہ میں اب مولوی صاحب سے نہ پڑھوں گا۔ کل مصاحبین سوائے دو کے مولانا کے ہوا خواہ اور اپنی بہبودی ان کی نگاہ پر سمجھے ہوئے تھے مگر دو صاحب ایک محمد علی بیگ[۵۲] کہ جو ہمیشہ میری طرح مولانا کے معتوب رہے اور دوسرے میر ریاست علی[۵۳] کہ جن کو آبائی عن جدٍ خاندان وزارت سے تعلق تھا۔ و حالیکہ سب

---

[۵۱] دیکھو حیات مسیح مصنفہ منشی مظفر حسن خان سلیمانی صفحہ ۷۶، صفحات ۵۲ اور ۵۵ بھی قابل ملاحظہ ہیں کہ کس طرح مولوی صاحب نے جاگیر حاصل کرنی چاہی اور اس کے متعلق کیا خط و کتابت نواب سالار جنگ اور کلارک صاحب میں ہوئی

[۵۲] افسر الملک بہادر۔ [۵۳] محبوب یار جنگ بہادر۔

نے متفق اللسان ہو کر حضور پر نور سے مولانا کی سفارش کی لیکن یہ دو صاحب یہ موقع پاکر
ہم زبان حضور پر نور ہو گئے۔ اس عرصہ میں میر سعادت علی[1] خاں فرزند خرد نواب وزارت پناہ
مرحوم اور نواب ظفر جنگ بھی آپہونچے اور نہ فقط ہم زبان حضور پر نور ہوئے۔ بلکہ مولوی صاحب
کی سزا دہی کے مشورے دینے لگے۔ میر سعادت علی خاں اور نواب ظفر جنگ نے میری
طرف خیال دوڑایا۔ آخر یہی مشورہ قرار پایا کہ آغا مرزا بیگ کو جلد بلوانا چاہئے۔ سہ پہر کا وقت
تھا کہ یہ بدمزہ معاملہ پیش آیا تھا اور صلاح و مشورہ ہوتے ہوتے رات زیادہ ہو گئی۔
میں ان دنوں سرور نگر کے سرکاری مکانات میں بغرض تبدیل آب و ہوا مع اہل و عیال
مقیم تھا کہ یکایک بعد دو بجے شب کے ایک سوار اسپ دواں آیا اور رقعہ شاید مرزا
محمد علی بیگ یا میر ریاست علی کا لایا کہ بفور حکم قضا شیم ہذا ڈیوڑھی میں حاضر ہو جاؤ۔ میں
ازحد پریشان ہوا اور اُسی وقت گاڑی پر سوار ہو کر متحیر اور پریشان خیال پرانی حویلی پہونچا۔
وہاں یہ تماشہ دیکھا کہ ایک طرف مولانا مع اپنے مصاحبین بیٹھے ہیں اور دالان کے دوسری
طرف حضور پر نور مع امرازادگان عظام و ہر دو مشیران خاص جلوہ افروز ہیں۔ مجھ کو دیکھتے
ہی سب سے پہلے معین الدین[2] صاحب دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا "عزتِ
اُستادگی رفت"۔ اتنے میں نواب ظفر جنگ بھی بہ عجلت تمام میری طرف تشریف لائے اور
کہا کہ حضرت جلد آئیے حضور پر نور رو رہے ہیں میں یہ سن کر گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا حاضر ہو کر
مستفسر حال ہوا سبھوں نے یک زبان تمام قصہ بیان کیا میں نے عرض کیا کہ حضور پر نور
کیوں اپنے مزاج وہاج کو پریشان فرماتے ہیں نہایت سہل طور پر یہ قصہ فیصل ہو سکتا ہے۔
اب صبح بھی ہو گئی ہے حضور موںھ ہاتھ دھوئیں اور مزاج وہاج کو خوش رکھیں یہ کوئی بڑی

---

[1] نواب منیر الملک۔ [2] اقبال یار جنگ بہادر۔

بات نہیں۔

الغرض میری فہمائش اور تسکین وہ الفاظ نے پورا اثر کیا۔ اب مجھ سے رائے طلب کی گئی کہ کیا کیا جائے میں نے عرض کیا کہ آپ کے امرائے عظام آپ پر اپنی جان اور سر تصدق کرنے پر مستعد ہیں وہ یہ حالت سن کر خود ہی انتظام معقول کر دیں گے۔ بقولیکہ "جو بولے سو گھی کو جائے"۔ فوراً حکم اقدس ہوا کہ آپ ابھی جائیے اور ان امرا کو لے آئیے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو حکم کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں مگر میں اور مولوی صاحب خواجہ تاش ہیں اس میں میری بدنامی کا اندیشہ ہے بالآخر حکم ہوا کہ آپ تو مہاراج کو لے آئیے اور نواب ظفر جنگ اپنے والد سر خورشید جاہ اور نواب میر سعادت علی خاں اپنے برادر بزرگ نواب میر لائق علی خاں کو لے آئیں۔ الغرض یہ تینوں امرا حاضر ہوئے مہاراجہ پیشکار اور نواب خورشید جاہ اگلے وقتوں کے خیال کے امرا تھے اور بعد خدا اور رسول اپنے آقائے ولی نعمت کی پوجا کرتے تھے۔ نواب میر لائق علی خاں ایک نوجوان تند مزاج اور مردانہ امیر تھے۔ ان تینوں امرا نے حالات سن کر حضور پر نور کی کمال ہمدردی کی اور حکم دیا کہ تا حکم ثانی درس مولوی صاحب کا ملتوی رہے۔ اتنے میں کپتان کلارک اور مسٹر کرون بھی حاضر ہو گئے۔ مسٹر کرون نے تو پوری ہمدردی حضور پر نور کے ساتھ کی مگر کپتان کلارک نہایت برہم ہوئے اور کہا معاملات تعلیم میری سپرد ہیں۔ امرا کو اس میں کیا مداخلت کا حق ہے۔ اس پر امرا برہم ہو گئے۔ اور نواب خورشید جاہ نے فرمایا کہ تم ایک ملازم آدمی تم کو میری موجودگی میں یہ کلمات کہنے ناجائز ہیں اگر قصہ کے طویل ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم کو ان الفاظ پر معطل کر دیتا۔ شاید اس وقت کلارک صاحب کو مسٹر جونز صاحب کے الفاظ تہدید یاد آگئے بہرحال انہوں نے پھر دم نہ مارا اور خاموش اپنے حجرے میں جا کر مجھ کو اور مسٹر کرون کو بلایا اور

کہا کہ اس میں ہماری تمہاری سب کی عزت میں فرق آتا ہے اور اب ہم ہز ہائینس کو کیونکر قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ لہذا اس وقت ضرورت ہے کہ ہم تینوں ملکر مولوی کو مدد دیں۔ مسٹر کردن نے یہ سن کر پیٹھ موڑلی اور یہ کہکر کہ "یہ میرا (بزنس) کام نہیں ہے" باہر چلے گئے۔ کپتان صاحب میرے سر ہو گئے اور کہا کہ تم جاؤ اور ہز ہائینس کو سمجھاؤ ورنہ میں استعفا دیدوں گا۔ میں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلئے جو آپ کہتے جائیں گے میں ہز ہائینس کو سمجھاتا جاؤں گا وہ اس پر اور برہم ہوئے اور کہا کہ تم کو خود ہز ہائینس کی معتمدی کی ہوس ہے مگر یاد رکھو کہ سب سے پہلے آپ کی خرابی ہے۔ خلاصہ اینکہ نواب لائق علی خاں نے امرائے عظام کو اطلاع دی کہ فلاں وقت ڈیوڑھی مبارک میں حاضر ہو کر مولوی صاحب کی سزا اور ان کی خدمت پر انتظام جدید تجویز فرمائیں۔ کپتان کلارک نے اپنی شرکت بھی چاہی کل امرا نے متفق اللفظ انکار کرنا چاہا مگر میں نے صلاح دی کہ معاملہ طول ہو جائے گا۔ اگر گورنمنٹ آف انڈیا تک نوبت پہونچی اور کپتان صاحب ضرور فریاد کریں[۵۱] گے تو اس وقت گورنمنٹ ہرگز کپتان صاحب کی برطرفی منظور نہ کرے گی۔ اس پر امراء خاموش ہو گئے۔

القصہ سب امرا جمع ہوئے اور کپتان کلارک صاحب بھی شریک جلسہ ہوئے۔ نواب لائق علی خاں اور سر خورشید جاہ اور مہاراجہ بہادر نے متفق الرائے یہ فیصلہ کیا "مولوی صاحب چوبیس گھنٹہ میں خارج البلد[۵۲] کئے جائیں اور مہاراج ان کے لئے معقول وظیفہ[۵۳] جاری فرمائیں"۔ گو کپتان کلارک اور نواب آسمان جاہ نے اختلاف کیا مگر کثرت آرائے سے

---

۵۱ دیکھو دکن ٹائمز مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۸۳ء ۵۲ محرم الحرام ۱۳۰۱ ہجری مقدسہ م ۱۸۸۳ء

۵۳ مولوی مسیح الزماں خاں بتاریخ شعبان ۱۳۰۱ھ بحکم کونسل آف ایجنسی خدمت سے علیحدہ ہوئے۔ کونسل مذکور کی تجویز کا فقرہ جاریہ تھا کہ راجہ نرندر پرشاد کی تحریک اور نواب خورشید جاہ کی تائید سے۔ کہ مولوی مسیح الزماں خاں خدمت سے برطرف کئے جائیں کونسل کو اتفاق ہے۔ مولوی صاحب کا وظیفہ چارسو ماہوار مقرر ہوا۔ حیات مسیح کے صفحہ ۲۰۴ پر تفصیل تمام وظائف کی لائحہ ہے جو مولوی صاحب اور ان کے عیال کو ان کے انتقال تک ملتے رہے۔ جملہ مقدار ایک ہزار آٹھ سو تھی۔

مجبور ہو گئے۔ امر دوم کا فیصلہ بھی بہ کثرت آرا یہ ہوا کہ "آغا مرزا بیگ علاوہ اپنی خدمت موجودہ کے کل خدمات متعلقہ مولوی صاحب پر فوراً سرفراز کئے جائیں۔ اور اس خدمت کے واسطے مہاراجہ پیشکار ایک رقم ماہوار بطور اضافہ جاری کریں"۔ اس انتظام سے ڈیوڑھی مبارک کل سازشوں سے تاختم تعلیم محفوظ ہو گئی ہیں اور مسٹر کرون انگریزی شاخ میں اور میں اور مولوی انوار اللہ اور مولوی اشرف علی چڑیا کوٹی ہندوستانی تعلیم میں باطمینان تمام مصروف رہے علی الصباح قبل درس انگریزی میں نے مولوی انوار اللہ صاحب کو حکم دیا تھا کہ حاضر ہو کر ہم سب کو نماز پڑھائیں۔ بعد ظہر میں اور مولوی اشرف علی صاحب دونوں قرآن مجید معہ ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب تحت اللفظ ایک روز اور ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب دوسرے روز پڑھایا کرتے تھے اور درس فارسی ملتوی کر کے فقط زبان اردو تا چار ساعت عصر اور مشق خوش نویسی صرف آدھ گھنٹہ بعد درس اردو مقرر رہا۔ اور اس میں نواب ظفر جنگ اور گاہ گاہ نواب سعادت علی خاں شریک رہتے تھے۔ امرائے عظام کی مداخلت بیجا بعد انتقال نواب امیر کبیر رشید الدین خاں مفقود ہو چکی تھی اور حق یہ ہے کہ مہاراجہ بہادر اور سر خورشید جاہ نے اور چند روز نواب لائق علی خاں نے مجھکو ہر قسم کی مدد اور کمک انتظام ڈیوڑھی مبارک میں دی۔ بعدہٗ باغوائے بعض نواب لائق علی خاں مجھ کو اپنا مخالف اور مہاراجہ بہادر کا خیر خواہ اور دوست سمجھنے لگے اور اب میری بدقسمتی سے مجھ کو پھر دشواریاں پیش آنے لگیں مگر یہ دشواریاں صرف ذاتی تھیں۔ میرے فرائض کے ادا کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اور مجھ کو پورا موقع حضور پرنور کی ترقی نوشت و خواند کا مل گیا۔

---

[1] ۳ رمضان المبارک ۱۳۰۱ھ

امور عام ریاست

یہ حال بعد انتقال وزیر باتدبیر ڈیوڑھی مبارک اور تعلیم حضرت بندگان عالی کا تا ختم تعلیم رہا۔ عام امور ریاست میں عجیب و غریب ہنگامے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے سید عبدالحق سردار دلیر جنگ اسم بامسمیٰ نے قدم آگے بڑھایا۔ اور مولوی مہدی علی اور سید حسین صاحب بلگرامی کو اپنا امیدوار کر کے اور ایک افسر اعلیٰ مسٹر ٹریور کے ذریعہ سے مسٹر کاڈری رزیڈنٹ کو اپنا معین بنا کر پوری کامیابی معاملات ریلوے میں حاصل کی۔ اور بہت بڑے دولت مند بن گئے مگر جس جس سے ان کو مدد ملی تھی اور جن کو سبز باغ دکھایا تھا ان سب کو دھتا بتا دی ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دی۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہ رئیس و ریاست کے سچے جاں نثار تھے جو کچھ اُنھوں نے کمایا وہ ریاست کا روپیہ نہ تھا۔ بلکہ یہ پہلا انڈین یعنی ہندی تھا جس نے ولایت والوں کو لوٹا اس کی دوربینی اور دانائی اور فنانشیل لیاقت اور عدیم المثال کامیابی پر ہر انگریز اور دیسی آدمی کو اس قدر شک آیا کہ اُس کے دشمن جانی بن گئے۔ اور بالآخر اُن کو ایک ایسا موقع ہاتھ لگا کہ ملازمت ریاست سے سبکدوش کرا دیا[1] اور ملازمت سے نکالے جانے کا اس جیا مند ملازم پر اس قدر اثر ہوا کہ آخر جان بحق تسلیم کر بیٹھا۔

اب مختلف گروہ اپنے اپنے اغراض کے حاصل کرنے کے واسطے از اعلیٰ تا ادنیٰ مستعدی قائم ہو گئے اور اس بڈھے نمک خوار و نمک حلال منصرم[2] ذمہ وار ریاست پر ایسے شدید حملے شروع ہوئے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گیا۔ خیال کرو کہ ایک ضعیف آدمی اس کے سر پر ایک ایسا بھاری بوجھ لدا ہوا ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کو سنبھالے ہوئے

---

[1] دیکھو بمبئی گزٹ مورخہ ۱۳ر جون ۱۸۸۳ء میں مسٹر جونز سابق رزیڈنٹ حیدرآباد اور سر اون برن کی رائے عبدالحق کی نسبت۔

[2] مہاراجہ نرندر پرشاد۔ دیکھو بمبئی گزٹ مورخہ ۲۵ر اپریل ۱۸۸۴ء

ہے اور چند قزاق اس کے گرد جمع ہیں کوئی اس کا دامن گھسیٹتا ہے۔ کوئی اُس کا گریبان چیرتا ہے اور کوئی چھرا لئے ہوئے اس کی پیٹھ پر کھڑا ہوا ہے۔ نہ وہ اپنے تئیں بچا سکتا ہے اور نہ اس بوجھ کو سر سے گرا سکتا ہے۔ اس میں یورپین انگریز مفلس قلاّش اپنا پیٹ بھرنے کے لئے شریک حال فتنہ پردازاں ہوگئے اور مسٹر کاوڑی نے جو ایک ذی علم اور علم دوست اور شاعر آدمی تھے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا بمبئی و مدراس وکلکتہ کے اخباروں اور بالخصوص پاینیر اخبار میں لمبے لمبے مضامین اس بے زبان و بے دست و پا بڈھے پر نکلنے شروع ہوگئے سالار جنگ مرحوم وزیر کے نام کا اثر ہند سے لیکر ایران وممالک ترکیہ اور وہاں سے تمام یورپ اور بالخصوص انگلستان پر ایسا پڑا ہوا تھا کہ "سر سیلر جنگ"[ل] کے نام کو لوگ جپتے تھے۔ غرضیکہ اس موقع پر گورنمنٹ آف انڈیا سے بھی ایک بڑی غلطی ہوئی یعنی مسٹر جونز جو تازہ وارد حیدرآباد تھے علم و تجربہ پہ بھروسہ نہ کرکے سر اسٹیوارٹ بیلی کو ریاست کے انتظام کا ڈھانچہ تیار کرنے کے واسطے حیدرآباد بھیجدیا۔ سر اسٹیوارٹ ایک امیرانہ مزاج شریف النفس اور ہر شخص کے متعلق نیک خیال رکھنے والے آدمی تھے۔ بہت جلد حضرات ہندوستانی شمالی نے اور ان کے مددگار ہوکے گیدڑ از دین و دنیا آزاد یورپین انگریزوں نے ان کو گھیر لیا اور بڈھے مہاراجہ پر اور اس خیال سے کہ ان سے لائق تر سر خورشید جاہ انتظام مستقل میں بر سرِ کار نہ آجائیں۔ ان پر بھی حملے شروع کردئے چونکہ حق نواب میر لائق علی خاں کا تسلیم ہوچکا تھا صرف ان کی کم سنی مانع کامیابی تھی۔ لہٰذا نام خورشید جاہ بہادر کا فرد امیدواران میں سے خارج کردیا گیا۔ اور یہ قرار پایا کہ نواب میر لائق علی خاں زیر تعلیم مہاراجہ رہیں اور بعد زمانہ قلیل مستقل وزیر اعظم ریاست ابد مدت ہوجائیں اور اس وقت تک مہاراجہ

[ل] یعنی سر سالار جنگ۔

کامل ذمہ دار امن و امان ریاست کے رہیں اس فیصلہ سے مہاراج کے ہوش بجا نہ رہے
اور یہ شعر اُن کی زبان پر جاری ہو گیا ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
بازمی گوئی کہ ترِ دامن مکُن ہشیار باش

مگر مسٹر پالمر اور رستم جی پارسی وغیرہما جو نہایت ہمدرد مہاراجہ کے تھے انہوں نے مہاراجہ کو اس ذمّہ داری کے انکار سے باز رکھا اور بہت کچھ ہمت اور جرأت دلائی اور انہوں نے بامید اصلاح آیندہ اس وقتی انتظام کو قبول کر لیا جس کا نتیجہ بجز شرمندگی ان کو اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ مسٹر جونز اس ہتک کو برداشت نہ کر سکے۔ اور اپنا تبادلہ ناگپور کرا لیا۔ مسٹر کاوڑی اس انتظام کے نگراں رزیڈنٹ[لہ] مقرر کیے گئے۔ نواب وزارت پناہ کے انتقال کے بعد دروازہ رزیڈنسی کا اہل سازش کے واسطے کھل گیا تھا مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سازش میں اہل دکن و حضرات دکن و امرائے ریاست شریک نہ تھے۔ چھوٹے رتبہ کے لوگ تو آپس میں ایک دوسرے کی رکابی اپنے آگے گھسیٹنے میں مصروف تھے۔ ہر دفتر ہر محکمہ میں سازش کی ہنگامہ آرائی موجود اور ریاسی کڑاہی میں اُبال اُٹھ رہا تھا۔ رشوت ستانی کھلے دروازہ ہو رہی تھی نیک کردار لوگوں پر ایک ہراس اور پریشانی چھا گئی ہر طرف گروہ کے گروہ مثل چوپایاں بے راعی سینگ چلاتے ٹکریں مارتے پھرتے تھے اور اپنی پناہ کے واسطے اپنے اپنے وسیلے بنا رکھے تھے ہر ملزم اپنے سفارشی کے ذریعہ سے بری ہو کر بیباک ہو رہا تھا۔ یہ تو چھوٹے لوگوں کا حال تھا بڑے رتبہ کے لوگ بلند حوصلگی سے میدان ارا کرتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے مرزا محمد علی بیگ نے قدم بڑھایا۔ خوبرو جوان امید ہائے

لہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۳ء

فراواں دل میں بھری ہوئیں اپنے فن میں استاد کامل اسپ دوانی و نیز دیگر ہنر سپاہ گری میں حیدر آباد میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان صفات کے ساتھ مصاحب خاص اور مولوی مسیح الزماں خاں کے معاملہ میں مورد الطاف شاہی ہو چکے تھے۔ ادھر بوجہ اس کے کہ انگریزی فوج میں رسائیدار رہ چکے تھے رزیڈنٹ ان کو اپنا آدمی سمجھتا تھا اور یوروپین اصحاب میں انہوں نے ایک خاص رسوخ اور فی الحال نواب لائق علی خاں کی صحبت میں مرتبۂ اعتبار حاصل کر لیا تھا۔ ہر طرف نگاہ دوڑا کر ایک جمعیت معقول کے مقتدر سردار بن گئے تھے۔ اور وزیر اعظم کی دعوتوں کی مثل چھوٹے پیمانہ پر انگریزوں کی دعوتیں شروع کر دی تھیں۔ ابتدا میں ان سے میری ملاقات عجیب طرح پر ہوئی۔ یعنی حضرت عمر علی شاہ صاحب ایک دن صبح کے وقت ایک خوب صورت نوجوان کو کہ انگریزی فوج کی وردی پہنے ہوئے زرنگار فوجی پگڑی باندھے ہوئے تھا میرے پاس لائے اور کہا کہ یہ جوان آدمی بھی تمہاری طرح میرا فرزند ہے یہ تمہارا خواجہ تاش مقرر ہوا ہے تم مجھ سے اقرار کر لو کہ جو کچھ تم سے ممکن ہوسکے اس کی مدد کرو گے۔ میں نے ان کے ارشاد کو بسر و چشم قبول کیا۔ مرزا محمد علی بیگ نے مجھ سے کہا کہ مشکل یہ ہے کہ میں سنّی ہوں اور آغا ناصر شاہ اور میر ریاست علی میرے مربّی اس وقت تک ہیں جب تک میرا مذہب ان سے پوشیدہ ہے۔ میں نے ان کا بہت اطمینان کیا اور ہر وقت بہ مقابلہ مولوی مسیح الزماں خاں ان کا مدد و معاون رہا۔ الغرض ان کی دیکھا دیکھی مولوی مہدی علی صاحب نے بھی قدم آگے بڑھایا اور نواب لائق علی خاں کو اپنی خیر خواہی کا اطمینان دلا کر رزیڈنسی میں آمد و رفت شروع کر دی اور صاحبان انگریز کی دعوتیں ان کے یہاں بھی ہونے لگیں۔ سر سید احمد خاں کے وسیچ پچ جب تھے۔ چہرہ پر کمال درجہ متانت اور سنجیدگی زبان نہایت شیریں۔ کلام نہایت پر اثر

ہر شخص سے اپنے نفع کے بعد سلوک کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے ماتحت لوگ ان پر جان نثاری کرنے کو مستعد ایک گروہ خوش لیاقت ذی علم کارگزاروں کا اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ عام طور پر نہایت ہر دل عزیز بنے ہوئے تھے اور گو میں ہمیشہ گوشہ نشین رہا مگر ان حضرت نے مجھ سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔

الغرض دو تین یورپین اور ایک گروہ خوش لیاقت ہندوستانی کارگزاروں کا ان کے شریک حال تھا۔ اور اب رزیڈنٹ بھی ان کا بہت مدّاح بن گیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر مہاراجہ بہت پریشان ہوئے۔ مرزا محمد علی بیگ پر تو بوجہ مصاحبت بادشاہ وقت اور تعلق سرکار انگریز ہاتھ ڈالنا اندیشہ ناک تھا۔ مگر مولوی مہدی علی پر ہاتھ ڈال بیٹھے اور نیتا بی رام راؤ اور ایک مہدوی پٹھان جن کا نام میں بھول گیا۔ اور جو دفتر خزانہ کے بڑے عہدہ دار تھے ان دونوں کو حکم دیا گیا کہ مولوی مہدی علی سے حساب فہمی کی تیاری کرو مولوی بیچارے کے ہوش اڑ گئے۔ ایک روز میں صبح کے وقت ڈیوڑھی مبارک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سواری تیار تھی کہ مولانا پریشان حال میرے پاس آئے میرے روبرو آئینہ تھا اور قرآن مجید طاق پر رکھا ہوا تھا۔ مجھ سے سلام علیک بھی نہ کی ہاتھ بڑھا کر قرآن مجید سر پر رکھ لیا اور کہا کہ یار اگر تو اس وقت مجھ کو بچائے تو یہی کلام پاک ضامن دیتا ہوں کہ میں مدت العمر تیرا ممنون رہونگا۔ ورنہ میں کچھ کھا کر سو رہونگا۔ اور خون ناحق ایک سیّد کا تیری گردن پر ہوگا۔ میں نے کہا کہ قرآن مجید کو تو آپ طاق پر رکھ دیجئے۔ اور یہ بتائیے کہ میں کس طرح تمہارے معاملہ میں مداخلت کر سکتا ہوں اگر کوئی راستہ بتاؤ تو میں دریغ نہ کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ صرف ایک ملاقات میری مہاراجہ سے کرا دو پھر میں سمجھ لوں گا۔ الغرض رائے یہ قرار پائی کہ بعد مغرب یہ مہاراجہ کی ڈیوڑھی پر حاضر رہیں اور میں ملاقات کرانے میں

کوشش کروں۔ چنانچہ یہی ہوا مولوی نے پاؤں مہاراجہ کے پکڑ لیے اور کچھ ایسی چرب زبانی اور لسّانی سے کام لیا کہ مہاراجہ بچند شرائط ان کی آبروریزی سے دست بردار ہوگئے۔ اس عرصہ میں ایک سنئے صاحب مہدی حسن نامی حیدرآباد میں وارد ہوئے ہیں اور یہ قلیل عرصہ تک تعلیم گاہ[1] قیصر باغ شہر لکھنؤ میں ساتھ رہے تھے۔ ایک دیسی میم اپنے ساتھ لیتے آئے یہ پہلا موقع تھا کہ عورتوں نے سازش میں دخل دیا۔ جوان عورت جمیلہ بھی چندروز پردہ نشین رہی بعدہٗ نواب میر لائق علی خاں تک پہونچی اب کیا تھا دوستوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوگئیں۔ مگر چوں کہ مہاراجہ تک رسائی دشوار تھی مولوی مشتاق حسین اور یہ صاحب دونوں مل کر میرے پاس آئے اور اپنا استحقاق قدیم مجھ پر ثابت کرنا چاہا۔ میں نے استحقاق تو فوراً قبول کرلیا مگر ملازمت کی نسبت میں متفکر ہوا کہ مجھ کو انتظام ریاست میں کوئی مداخلت نہ تھی اور مہاراجہ پہلے ہی ہندوستانیوں سے بدظن تھے اور خود مولوی مشتاق حسین پہ ہاتھ ڈالنے والے تھے۔ پھر بھی ہم کشتی دامن گیر ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ نواب لائق علی خاں ان کا نام پیش فرمائیں اور میں ان کی شرافت اور لیاقت کی گواہی دے دوں۔ چنانچہ نواب صاحب موصوف نے تحریراً ان کا نام صیغۂ عدالت میں پیش کیا اور میری واقفیت بھی ظاہر فرما دی نواب صاحب موصوف کی سفارش ایسی نہ تھی کہ مہاراجہ انکار کرتے یہ ملازم ہوگئے۔ اور رفتہ رفتہ یہ بھی طوفان بے تمیزی میں زیادہ تر میم صاحبہ کی خوش تدبیری سے شریک اور مشہور و ممتاز ہوگئے اور اس باتدبیر بی بی نے بقول شخصے

چلمن کے بدلے ہم کو زمیں پر گرا دیا
اس شوخ بے حجاب نے پردہ اٹھا دیا

---

[1] کیننگ کالج۔

ہر جلسہ و ہر دعوت میں بے نقاب آمد و رفت شروع کر دی۔ یہ شعر اس کے حسب حال تھا[۹]

نوید اے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہو اُن کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے بارے رخ پر سے اُس نے اُلٹا نقاب آدھا

ڈیوڑھی مبارک میں تو بجز اس کے کہ کلارک صاحب کبھی کبھی مجھ سے چکر لاتے تھے ہر طرح کا آرام رہا۔ اور علاقہ پائیگاہ میں بھی کسی سازش کی ضرورت نہ تھی۔ سر آسمان جاہ کے پاس ایک شریف النفس صائب الرائے پارسی دوسا بھائی نامی انتظام کارخانجات وجمعیت و جاگیرات کے واسطے موجود تھا۔ اور نواب صاحب خود اپنے مصاحبین کی صحبت میں بلا فکر شب و روز زندگی بسر فرماتے تھے۔ یہی حال نواب وقار الامراء کا تھا کہ شاپورجی ان کے علاقہ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اگر ان دونوں اُمراء سے کوئی سوال ان کے علاقہ کی بابتہ کیا جاتا تو یہ اپنے اپنے مہتممانِ علاقہ کی صورت تکنے لگتے۔ البتہ خورشید جاہ بہادر بیدار مغز اور انتظام علاقہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ القصہ اس وقت کل شمالی ہندوستان کے حضرات ایک گروہ عظیم تجربہ کار اور گرگان باراں دیدہ علم و ہنر میں فرد یکتائے زمانہ دوراندیش خوش فکر ایسے کہ موقع خود نہ آئے تو موقع کو گھسیٹ لائیں یک دل و یک جہت ہو کر بیچارہ مہاراجہ کے انتظام کو بدنام کرنے میں ہمہ تن مصروف بکار تھے بقول معروف ع ایک میں خون گرفتہ سو جلّاد۔ یہ سب کوشش اس واسطے تھی کہ وقتی انتظام ٹوٹ جائے اور نواب میر لائق علی خان مستقل دیوان و مختار مدار المہام ہو جائیں تا کہ بظاہر تو دنیا میں سرخ رو نمک حلال وزیر مرحوم رہیں اور کم سن وزیر کی آڑ میں خود اپنی کارگزاری اور لیاقت رزیڈنٹ کے ذریعہ گورنمنٹ آف انڈیا پر ثابت کر کے اپنی جڑیں ریاست میں خوب جما لیں۔ وہ چند شریف[۱۰] حضرات جو بذریعہ سر اسٹوارٹ بیلی بنگالہ سے طلب کئے

---

[۱۰] دلیل الدین احترام جنگ اور مولوی عبدالکریم ممبر مجلس عدالت العالیہ

گئے تھے اُن کی عمروں نے وفا نہ کی اور جلد جلد رئیس و ریاست پر تصدق ہو گئے۔ ورنہ اس تمام گروہ میں صرف دو اہلکار ایسے تھے کہ مثل کولھو کے بیل کے اپنے ہی کارہائے متعلقہ میں سرگرم رہتے تھے۔ ایک مولوی چراغ علی[۵۱] نہایت ذی لیاقت ہر علم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اعلیٰ درجہ کا ادیب عربی و انگریزی اس کے ساتھ بے مثل محاسب کم گو، لغو باتوں سے بری، مولوی مہدی علی کے نہایت مخالف ماتحت تھے مگر اپنی ذاتی لیاقت کی وجہ سے خود ان کے بالادست ان سے مرعوب لیکن افسوس کہ باوجود ان جمیع صفات حسنہ کے لارڈ بیکن کے پیرو تھے، دوسرے اکرام اللہ[۵۲] خاں عالی خاندان فصیح البیان ظریف الطبع سلیقہ شعار احباب پرست اور ہر سازشی گروہ سے اسقدر متنفر کہ بعد انتقال نواب وزارت پناہ استعفاء دیکر اپنے وطن چلے گئے اور سرکار انگریزی نے ان کو رام پور میں اپنی طرف سے مشیر نواب مقرر کر دیا۔ مدراسیوں میں مولوی شیخ احمد[۵۳] صاحب ہر صفت حسنہ سے متصف اور سازش سے بری لیکن افسوس کہ اُن کی عمر نے بھی نہ وفا کی۔ یہ گروہ گو آپس میں مخالف مگر مہاراج کے گرانے میں ہمہ تن شریک تھا۔ سردار دلیر جنگ عبدالحق کا میں کچھ مختصر حال اوپر لکھ چکا ہوں ان کے ساتھ کوئی گروہ ممد و معاون مثل مولوی مہدی علی نہ تھا اور صرف

---

[۵۱] اعظم یار جنگ او؛ مدر کے رہنے والے۔ بعد میں معتمد فینانس ہو گئے تھے۔

[۵۲] نواب یار جنگ متوطن کاکوری ضلع لکھنؤ۔ صوبہ دار گلبرگہ شریف۔

[۵۳] رفعت یار جنگ ان دونوں کے والد لال محمد مشہور ہے کہ اورنگ آباد میں انگریزی فوج چھاؤنی کی مسجد کے مؤذن تھے۔ مولوی امین الدین خاں معتمد عدالت اپنے عروج کے زمانہ میں بھی درس حسب عادت قدیم دیا کرتے تھے اور لوگ مولوی صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے درس میں شریک ہو جاتے تھے یہ دونوں لڑکے بھی شریک درس کر دیے گئے تھے۔ مولوی صاحب نے ان کو ابتداء میں دفتر میں اہلکار مقرر کیا اور پھر ترقی دیتے رہے مگر جب عماد جنگ کو حکومت اور ثروت نصیب ہوئی تو انہوں نے بدعوائے ملکی اپنے محسنوں اہل شمالی ہند کی مخالفت میں نام پیدا کیا۔

اپنی فطری لیاقت سے ہرگروہ کا دو بدو اور بہ کامیابی مقابلہ کرتے تھے لیکن مہاراج کے نہ مخالف تھے نہ موافق۔ خلاصہ اینکہ رزیڈنسی میں ہر روز برائیاں مہاراج کی پہونچائی جاتی تھیں جس کے باعث رزیڈنٹ کا دخل اندرونی انتظام میں زائد ہوتا جاتا تھا اور مخبری کی بدولت اہل سازش کا اعتبار رزیڈنسی میں بڑھتا جاتا تھا، بلکہ یہ خیال ترقی پر تھا اگر یہ چند منتظم موجود نہ رہتے تو ریاست کا کام ایک روز بھی نہ چل سکتا۔ اگرچہ میں کسی گروہ میں شریک نہ تھا مجھ پر بھی بدگمانی ہوئی کہ میں مہاراج کا طرفدار ہوں اور بوجہ اس کے کہ شب و روز بادشاہ کی خدمت میں ایک باا ثر اور معزز حاضر باش ہوں مہاراجہ کی قدر اور دوسروں کی بے قدری بادشاہ وقت کے ذہن میں ڈال سکتا ہوں۔ یہ کل حضرات ظاہری طور پر خیرخواہ نواب میر لائق علی خاں کے تھے مگر آخر میں اُنہوں نے ان کو بھی دھوکہ دیا اب میری طرف بھی متوجہ ہوئے اور نواب میر لائق علی خاں کو کہ میرے شاگرد اور قدرداں تھے میرا پورا مخالف بنا دیا۔ چنانچہ ایک روز چائے خوری کے وقت نواب موصوف اور کل اُستاد اور حاضر باش مصاحبین جمع تھے اتفاقاً میں اور نواب میر لائق علی خاں پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ نواب موصوف نے بے مزہ گفتگو شروع کی عادت ان کی یہ تھی کہ ہر عہدہ دار سے گالی گلوچ پر آجاتے تھے میں نے بہ خیال حفظ ماتقدم عرض کیا کہ نواب صاحب ؎

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

یہ میر کا شعر ہے میں ایک غریب آدمی آپ کے والد کا دست گرفتہ ہوں مجھ سے جو کچھ ارشاد ہو زبان سنبھال کر۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ تو کرسی سے پیٹھ لگا کر سر کو بلند کر کے

ہائے بابا ہائے بابا کہتے ہوئے مثل بچوں کے رونے لگے۔ اب ہر طرف سے حاضرین دوڑ پڑے حتیٰ کہ حضور پر نور خود ان کے پاس تشریف لائے مگر وہ اس ہی حالت گریہ میں مبتلا رہے۔ آخر مجھ سے دریافت کی نوبت آئی۔ میں نے واقعہ بیان کر دیا۔ چونکہ حضور پر نور میرے مزاج سے واقف تھے کچھ نہ فرمایا اور نواب کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے اٹھا لے گئے کہ "تم حضرت کی باتوں کا برا مت مانو" اس دن سے میر لائق علی خاں کو میری مخالفت کا پورا یقین ہو گیا اور جو تدابیر میری نقصان رسانی کی انہوں نے اور ان کے ہوا خواہ میر ریاست علی اور مرزا محمد علی بیگ اور ان کے برادر خرد نواب سعادت علی خاں نے کیں ان کی تفصیل طویل اور بے لذت ہے۔ اب میں اور مہاراج دو خون گرفتہ رہ گئے۔ مگر ہم میں تیسرے صاحب بھی جلد شریک کئے گئے یعنی نواب خورشید جاہ کہ اپنی انتظامی لیاقت میں نہایت مشہور تھے اور ایک یہی امیر باقی رہ گئے تھے جن کو خطاب شمس الامرا امیر کبیر کا ملا تھا۔ اور اہل شہر ان کو اپنی پشت پناہ سمجھتے تھے۔ پس اہل سازش کو ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا کہ گورنمنٹ کہ ان کی وقعت اور لیاقت سے واقف ہے کہیں ان کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ لہذا رزیڈنٹ کے کان ان کی مخالفت میں بھرے جانے لگے چونکہ مجھ سے اور مسٹر کاڈری سے اکثر علمی گفتگو رہتی تھی۔ ان کا دل میری طرف سے صاف رہا۔

آخر یہ حالت پہونچی کہ روز بروز انتظام ریاست بدتر ہوتا گیا اور الزام اس کا بیچارہ خون گرفتہ وزیر غیر مستقل پر عائد ہونے لگا۔ مہاراج نے نواب امیر کبیر خورشید جاہ کے مشورہ سے یہ رائے قرار دی کہ اب تعلیم حضور پر نور کی ختم کر دی جائے تاکہ عنان ریاست اپنے دست مبارک میں لیکر ہم نمکخواروں کو اس عذاب الیم سے نجات عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس کی تدبیر شروع کر دی گئی مگر یہ امر کپتان کلارک کو ناپسند ہوا اور میجر گاف اور سید حسین صاحب

لائق علی خاں نے انگریزیا اور ہندوستانیوں کو ہم رائے کر کے نواب کو ڈرایا کہ امیر کبیر اور مہاراجہ تم سے بازی لیجائیں گے[1]۔ اب حضور پرنور کی کم سنی اور ناتجربہ کاری پر بھی اس ہی خیال سے حملے ہونے لگے۔ اُدھر میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اور اسی میں اپنا بچاؤ سمجھا کہ تعلیم ختم کر دی جائے۔ میں نے یہ مشورہ دیا کہ فی زمانہ نمائش گاہ کلکتہ میں قائم ہے حضور پرنور اس کے ملاحظہ کے واسطے کلکتہ تشریف لے چلیں تاکہ لارڈ رپن خود اندازہ کر لیں اُس وقت تعلیم ختم کر کے کامل اختیار حضور پرنور کو دے دیا جائے۔ ابتدا میں یہ رائے میری ہر دو امرائے نامدار کو ناپسند ہوئی کہ حضور پرنور آ ًعن جدٍ خود مختار بادشاہ اس ریاست کے ہیں اور کبھی کوئی رئیس ریاست کے حدود سے بجز دربارِ دہلی باہر رونق افروز نہیں ہوا لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ ہماری زندگی میں کسرِ شان ہمارے آقائے ولی نعمت کی ہو۔ مگر بالآخر جب یہ دیکھا کہ رزیڈنٹ کو بھی اہلِ سازش نے اپنی رائے سے متفق کر لیا اور کوئی دوسری شکل کامیابی کی نہیں ہے۔ تو میری رائے کو اختیار کیا اب میں نے حضور پرنور کو شوق خود مختاری اور ختم تعلیم کا دلایا اور سفر کلکتہ کی ترغیب دی یہاں تک کہ ظفر جنگ بہادر اور حضور پرنور کو شوق سیر و سیاحت کا پیدا ہو گیا۔ اور مہاراجہ کے نام تحریری حکم سفر کی تیاری کا صادر ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ اہل سازش ایسے زبردست ہو گئے تھے اور رزیڈنٹ سے لیکر فارن آفس تک نے مہاراجہ کو ایسا بدنام کر دیا تھا کہ روزانہ کام بھی چلنا دشوار ہو گیا تھا پس ہم تین آدمیوں کا مقصود یہ تھا کہ کسی طرح عزت کے ساتھ اس طوفانِ بے تمیزی سے نکل جائیں لیکن اہلِ سازش کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اس تدبیر سے ہم اپنی جڑیں مضبوط

---

[1] یہ رائے اُن ہر دو صاحبان کی غلط تھی۔ بالآخر لائق علی خاں ہی کو اس تجویز سے فائدہ پہونچا جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔

کر رہے ہیں اس مغالطے میں آکر کمال درجہ کوشش بلا کامیابی اس سفر کے روکنے میں کی گئیں۔

اب سفر کی تیاری اُسی پیمانہ پر کی گئی جو وزارت پناہ مرحوم نے بروقت دربار دہلی کی تھی۔ بلکہ مہاراجہ نے بہت شاہانہ تکلف بڑھا دیا اور مسٹر کاڈری کو کلکتہ روانہ کیا تاکہ حضور پر نور کے مرتبہ کے مطابق استقبال اور مہمانداری میں کوئی امر فروگذاشت نہ ہوا اور ہم مسافرین منزل بمنزل قیام کرتے ہوئے الہ آباد پہونچے وہاں کے قلعہ کی سیر کرتے ہوئے بنارس وارد ہوئے اور مہاراجہ بنارس کے ہاں مہمان رہے۔ اس سفر میں اہلِ سازش میں سے کوئی ہم رکاب سعادت نہ تھا۔ لیکن مرزا محمد علی بیگ اور میر ریاست علی اور نواب سعادت علی خاں نے مجھ پر اور مہاراج پر حملے شروع کر دیئے اور کپتان کلارک نے نواب لائق علی خاں کو اپنی آیندہ بہبودی حاصل کرنے کا پورا موقع دیا یعنی اس کل سفر میں نواب لائق علی خاں ان کے برادر خرد نواب سعادت علی خاں مرزا محمد علی بیگ اور میر ریاست علی شب و روز اعلیٰحضرت کی خدمت میں حاضر رہنے لگے اور کامل موقع ان حضرات کو مہاراجہ بہادر پر بدنما حملہ آوری کا مل گیا۔ یعنی کوئی ان کی خمیدہ قامت کی کوئی اُن کی دھیمی آواز کی کوئی ان کی غنودگی کی نقل کر کے قہقہے لگاتے تھے میری بابت بھی زبان درازی سے غافل نہ رہے مگر چونکہ میں بھی حاضر باش تھا اور حضرت بندگان عالی کی عنایت خاص مجھ پر مبذول تھی اس وقت زیادہ نقصان نہ پہونچا سکے لیکن نواب امیر کبیر کی پوری شامت آگئی ہر عیب سے وہ متصف کر دیئے گئے اور باوجودیکہ کپتان کلارک خاص اس گروہ کے مد ومعاون تھے مگر ان کا ٹی چھوٹا سر اور ریائے لنگ نہ فراموش کیا گیا۔ مرزا محمد علی بیگ نے فائدہ کثیر اسی موقع خداداد سے اُٹھایا ایک طرف بادشاہ وقت کی

صحبت میں بے تکلفی میسّر ہوگئی دوسری طرف امیدوار وزیر کے "برادرم علی بیگ" ہوگئے۔

اس اجمال کی تفصیل بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ بلدہ میں نواب لائق علی خاں کو کم موقع حاضر باشی اور صحبت بے تکلف کا ملتا تھا پس اس وہم سے کہ راقم یا مہاراجہ امیر کبیر کے ہم راز وہم ساز تھے اور نواب ظفر جنگ کی شرکت میں اُن کے خلاف پارٹی قائم کی تھی اور مسٹر کرون کو ہموار کر لیا تھا لہٰذا ضرور ہوا کہ اپنی حفاظت کے واسطے اپنی پارٹی بھی قائم کی جائے اور حضور پرنور کو اپنی طرف رجوع کیا جائے۔ نواب میر سعادت علی خاں نے شب و روز کی حاضر باشی اختیار کی اور مرزا محمد علی بیگ و میر ریاست علی کو اپنے ہمراہ رکھا۔ اور کپتان کلارک میرے قدیم مخالف کو اپنا ممد و معاون بنایا۔ اُن صاحبوں نے اوّل ظفر جنگ پر ایسے حملے کیے کہ بالآخر حضور پُرنور ان کی صورت سے بیزار ہوگئے۔ اس کے بعد وہ مجھ غریب کی طرف متوجہ ہوئے مگر زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حالت سفر میں نواب لائق علی خاں کو خود بھی موقع ہر وقت کی حاضر باشی اور صحبت بے تکلف کا ملا اور کپتان کلارک ان کی کمک پر ہوگئے۔ اس گروہ نے اس سفر میں بلدہ آنے تک مہاراج امیر کبیر نواب خورشید جاہ کا کام تمام کر دیا اور حضور پرنور مہاراج کو پیر نابالغ اور نواب خورشید جاہ کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور خوفناک سمجھنے لگے اور مجھ پر ان حملوں کا صرف اس قدر اثر ہوا کہ حضور پرنور مجھ کو ان امرا کا طرفدار خیال فرمانے لگے۔ اس شطرنج کی بازی میں ایک تازہ وارد انگریز صاحب بہادر بھی شریک ہوگئے نام ان صاحب کا مسٹر بنیٹ تھا جن کا ذکر آئندہ آنے والا ہے۔

بنارس کا ایک واقعہ قابل تحریر ہے یعنی یہاں پر مسٹر کارڈری کلکتہ سے واپس آکر مہاراج سے ملے اور یہ کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا دستور قدیم یہ ہے کہ دارالسلطنت کلکتہ میں سوائے شاہی خاندان انگلستان کسی کی سلامی یا استقبال نہیں کیا جاتا۔ یہ سن کر مہاراج نہایت

گھبرائے مگر نواب خورشید جاہ نے مردانہ وار مسٹر کاڈری سے گفتگو کی کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہر قدم پر "سوزرین" کی بحث قدیم ہمارے آگے آتی ہے۔ مسٹر کاڈری نے شانہ ہلا کر کہا کہ میں محکوم اور مجبور ہوں۔ میرے منہ سے یہ نکل گیا کہ حضور پر نور بغرض سیر و سیاحت باہر نکلے ہیں، بنارس تک سیر کافی ہوگئی۔ اس پر مسٹر کاڈری نے کہا کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ حضور پر نور اب بیچ سفر سے واپس کیونکر جا سکتے ہیں۔ درحالیکہ اُن کی مہمانداری کا انتظام کل رؤسائے ہند سے بدرجہا زیادہ کیا گیا ہے۔ اب گفتگو بے مزہ ہونے لگی اور نواب امیر کبیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیئے۔ اس تمام گفتگو میں کپتان کلارک الگ رہے اور تمام بوجھ مہاراجہ اور نواب امیر کبیر پر ڈال دیا۔ ایک غلطی مہاراج سے یہ ہوئی تھی کہ سفر سے قبل بہ مشورہ ٹام پالمر بیرسٹر انھوں نے ایک زبردست شخص سر جان گارسٹ کو اپنی ملک کے واسطے بصرف کثیر انگلینڈ سے طلب کیا تھا وہ اس مرتبہ کا تھا کہ خود رپن کے پاس خاص طور پر مہمان ہوا لیکن مہاراج کی تدبیر الٹی ہوئی اور تقدیر نے یاوری نہ کی اخبار نویسوں نے روپیہ کھا کر اس قدر غل مچایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا مہاراج سے بدظن ہوگئی۔ اور سر جان گارسٹ باوجود اخذ رقم کثیر صاف پہلوتہی کر گئے گورنمنٹ جو باوجود کوشش اہل سازش مہاراج کی موافق نہ تھی اب مخالف ہوگئی۔

القصہ مسٹر کاڈری نے خفا ہو کر مجھ سے کہا کہ تم کو ایسے امور میں کیا مداخلت کا حق ہی جاؤ ہز ہائینس کو اطلاع کر دو کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ میں براہِ راست حضور پر نور کو سمجھا لوں گا۔ چنانچہ میں نے حضور پر نور کو اطلاع دی اور کل حال بھی عرض کر کے کہا کہ ہرگز ہرگز حضور پر نور کلکتہ جانے پر راضی نہوں ورنہ تمام ہند میں ہنسی اُڑ جائے گی میرا یقینی خیال یہ ہے کہ حضور مضبوط رہے تو ضرور شاہانہ استقبال ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں نے کاڈری صاحب کو بلوا لیا۔ صاحب عالی شان بہادر نے نہایت مدلل گفتگو کی اور کہا کہ آپ کی شان ایسی ہے کہ وہ کسی طرح کم نہیں

ہوسکتی اور گورنمنٹ اپنے قاعدہ وضابطہ سے مجبور ہے میری شامت جو آئی میں بول اُٹھا کہ قواعد وضوابط امور درباری میں ہیں خانگی معاملات میں ان کو کیا دخل ہے۔ کاڈری صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور حضور پرنور سے عرض کیا کہ اگر ایسے مشیر آپ کے پاس رہیں گے تو ضرور آپ کو نقصان پہونچائیں گے۔ خلاصہ اینکہ بڑی دلیلوں اور فہمائشں کے بعد کاڈری صاحب کو سوکھا جواب ملا۔ اور یہ ارشاد ہوا کہ ما بدولت واقبال کا خود ارادہ ہے کہ یہاں سے واپس جائیں۔ اب کاڈری صاحب چپ کنھیں پڑگئے اور حضور پرنور یہ فرماکر صاحب عالی شان سے ہاتھ ملاکر زنانہ میں تشریف لے گئے۔ صاحب عالی شان نے اول تو مجھ پر دیدے نکالے اور کہا کہ یہ سب آگ تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میں یہ الزام تسلیم کرلوں تو اس میں آپ کی خود بڑی نیک نامی ہے کہ نظام دکن کو ہندو اور مسلمان پارسی اور سکھ اور دیگر کل اقوام دیسی عیسائی خاص محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ہندو بڑی ریاستوں کے علاقے اب تک اورنگ آباد میں موجود ہیں۔ تل شکر وغیرہ کے خریطے اب تک بذریعہ صاحب عالی شان حضور پرنور کے پاس داخل ہوا کرتے ہیں اور سکھوں کا معبد بمقام ناندیڑ موجود ہے اگر کچھ بھی حضور پرنور کے مرتبہ میں فرق کیا جائے گا تو یہ سب رنجیدہ خاطر ہونگے پس کس قدر آپ کی نیک نامی ہے کہ فلاں رزیڈنٹ صاحب نے لڑجھگڑ کر شاہی مراتب نظام کو قائم رکھا اور مسلمان مورخین تو اپنی تاریخوں میں اس امر کو بطور یادگار درج کریں گے۔ اس پر مسٹر کاڈری نے یہ جواب دیا کہ سرجان گارسٹ کیوں بلائے گئے۔ مختصر اینکہ جان نثار امیر کبیر اور خون گرفتہ وزیر کی فہمائش پر کاڈری صاحب جو ایک مرد شریف تھے کوشش کرنے پر راضی ہوئے اور یہ قرار پایا کہ بنارس سے سواری مبارک ایک اسٹیشن تک کہ شاید نام اس کا مرزاپور ہے آگے بڑھ کر قیام فرمائیے اور کاڈری صاحب فوراً کلکتہ جاکر جو نتیجہ اُن کی کوشش کا ہو وہ مرزاپور آکر بیان کریں۔ اس کے بعد جو مناسب امر ہو کیا

جائے۔ چنانچہ ہم مرزاپور پر مقیم تھے کہ کاڈری صاحب خنداں و فرحاں آن پہونچے اور کہا کہ سوائے اس کے کہ فارن سکرٹری اسٹیشن پر نہیں حاضر ہونگے۔ باقی کل مراتب استقبال وغیرہ ادا کیئے جائیں گے۔ اور بمقام چورنگی ہز ہائینس مہمان عزیز گورنمنٹ کے رہیں گے۔ اب ہم خوشی خوشی کلکتہ[1] پہونچے اور اُن وسیع مکانوں میں جن میں ہمارے واسطے تمام سامان مہمان نوازی موجود تھا فروکش ہوئے۔ مہاراج نے بایں وجہ کہ ہماری فوج پہرہ چوکی وغیرہ یہاں پردیسی ہے گورنمنٹ سے پہرہ چوکی کا انتظام بھی طلب کر لیا۔ یہاں معمولی دید باز دید ڈنر ایوننگ پارٹی اور مسابقت یعنے گھوڑدوڑ وغیرہ میں وقت صرف ہوتا رہا۔ مسلمانان کلکتہ نے خیر مقدم کا خطبہ یعنی ایڈریس پیش کرنے کی اجازت طلب کی کپتان کلارک نے یوم خطبہ مقرر کر کے مجھ سے فرمائش کی کہ منجانب حضور پُرنور میں جواب خطبہ تحریر کروں اور پڑھوں میں نے ہرچند کہا کہ یہ کام مہاراج سے تعلق رکھتا ہے یا نواب لائق علی خاں جواب ادا کریں بہرحال وہ نہ مانا وفد آیا اور میں نے ہی خطبہ کا جواب[2] دیا۔ اس امر کا مہاراج کو بہت رنج ہوا

---

[1] حضور پر نور کلکتہ میں بتاریخ ۱۰ صفر ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء رونق افروز ہوئے۔

[2] ”بندگانِ عالی متعالی اعلیٰ حضرت اقدس و اعلےٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھکو اچھی طرح معلوم ہوا کہ اس مملکت کے باشندے ہنود و اہل اسلام دونوں فریق حصول علم و اکتساب ہنر میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔ اور اگلے وقتوں میں بھی یہ ملک تمدن اور شائستگی میں دیگر ممالک سے کچھ کم نہ تھا۔ پس جب ایسا ایک گروہ کہ جس کی موجودہ حالت قابل تقلید و گزشتہ کیفیت لائق تعریف ہو ما بدولت کی نسبت ایسا اخلاص عقیدت آمیز ظاہر کریں تو یہ امر بڑا سرمایۂ شادمانی اور ہمیشہ اظہار اخلاص قابل قدر ہے۔ اس شہر میں سرکار نظام کو بہت بڑی خوشی اس بات سے حاصل ہوئی کہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو فی الحال سرکار عظمت مدار ہندوستان کے ظل حمایت میں کہ جس میں اور سرکار نظام میں روابطہ مستحکم و محبت قلبی سلف سے قائم ہے مرفہ حال خرم و شاد پایا۔ اور اعلیٰ حضرت اقدس و اعلیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھکو سیر و سیاحت کا کمال درجہ شوق ہے اور جس قدر اس ملک کی تعریف اور اہل ملک کی توصیف سنا کرتا تھا اُسی قدر شوق یہاں آنے کا زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ دارالسلطنت دکن بنگالہ بہت دور واقع ہے اور چونکہ اگلے زمانہ میں اس قدر دور و دراز کا سفر تکلیف دہ۔ دشوار گزار و خطرناک تھا بایں وجہ میرے ملکی لوگ آسودہ حالی اباقی توبر صفحہ آئندہ

گویا یہ کام خاص اُن کی کم وقعتی کے لئے کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کپتان کلارک نے مجھ سے کہا کہ سید امیر علی جج ہائی کورٹ کل ہز ہائینس کی ملاقات کو آئیں گے ہز ہائینس کو سویرے برآمد کرانا صرف ہم لوگ حاضر رہیں گے گویا مختصر خانگی دربار ہو جائے گا میں نے پھر ان کو یاد دلایا کہ یہ کام مہاراج یا نواب لائق علی خاں کا ہے۔ اس پر وہ بہت برہم ہوئے اور کہا "وہ بڈھا منسٹر نہیں ہے اور جب لائق علی صاحب منسٹر ہوگا دیکھا جائے گا"۔ میں نے کہا کہ "میں ایک شرط سے راضی ہوتا ہوں کہ سید صاحب دستار بسر کمر بستہ حاضر در دولت ہوں"۔ اور سر سید احمد خاں کا قصہ یاد دلایا اس پر کپتان کلارک نے کہا کہ مجھ کو پہلے سے معلوم ہے کہ تم سید صاحب کے مخالف ہو میں جو حکم دیتا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کے قطع نظر ادھر بہت کم آتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اور اہل دکن کے باشندوں میں کسی قسم کی شناسائی نہ ہونے پائی۔ اب سرکار ہند کے فیض عام وحسن انتظام کے باعث نہ کوئی صعوبت راہ نہ کسی قسم کا خطرہ باقی رہا اور اگرچہ اپنے خاندان میں میں نے ہی پہلے پہل اس ملک میں قدم رکھا ہے مگر مجھکو کامل امید ہے کہ اس ملک کے لائق اور قابل باشندوں میں اور میرے ملک کے لوگوں میں بھی سلسلۂ آمد و رفت قائم ہو جائیگا اور میں یقین کرتا ہوں کہ میرے اس سفر کا نتیجہ میری رعایا کے واسطے بھی مفید ہوگا یعنی جس قدر تجربہ اور علم مجھکو اس سفر میں حاصل ہوا ہے اچھی طرح اپنی ریاست کے انتظام اور رعایا کی فلاح میں خرچ کرونگا اور یہی بہت بڑا مقصود اس سفر سے تھا۔ اگرچہ جو وجہ آپ نے میرے اس سفر کی بیان کی ہے وہ بھی درست ہے اور آپ لوگوں کا یہ بھی خیال ٹھیک ہے کہ جلسۂ تخت نشینی حصول اختیارات وعنان نظم ونسق جو عنقریب ظہور میں آنے والا ہے۔ میں ہمہ تن اپنی رعایا اور سلطنت کی بہبودی اور راحت وترقی علوم وفنون میں بدل وجان کوشش کرتا رہونگا اور نیز اس بات کا بہت بڑا خیال رکھا جائے گا کہ تہذیب مشرق کم نہ ہو جائے اور تقلید محمود مغربی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ختم کلام پر میں بہت بڑی خوشی اپنی ظاہر کرکے کہتا ہوں کہ آپ سب صاحب ایک ایسی نامی اور مشہور مجلس کے ارکان ہیں کہ سالہائے دراز سے بہ ظل حمایت سرکار عظمت مدار اکتساب علوم وفنون میں بدرجۂ غایت کوشش کر رہے ہیں اور زیادہ تر مسرت اس بات کی ہے کہ آپ اپنی کوشش بلیغ کے نتائج پر کامیاب بھی ہوئے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی جستجو اور حکیمانہ کوشش کی سرپرستی اور حمایت کے واسطے ہر وقت بدل موجود ہوں اور جو عمدہ نتائج آپ کی کوشش کی نسبت بہ تعلیم وتربیت مسلمانان بنگال کو وقتاً فوقتاً حاصل ہوتے رہیں اُن کے سننے کا ہمیشہ مشتاق رہونگا۔ اب میں بہت خوشی سے آپ کا اڈریس قبول کرتا ہوں اور اس دعا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جو آپ صاحبوں نے میرے اور میری سلطنت کی نسبت اڈریس میں مندرج کی ہے"۔ حضور پر نور نے خود اپنی زبان سے یہ ارشاد فرمایا کہ "آپ لوگوں کے اڈریس دینے کا میں نہایت مشکور ہوں"۔

ہوں وہ انتظام کرو اور تم خود بھی سید صاحب کے بنگلہ پر جا کر اُن سے ملاقات کرو۔ میں نے کہا ملاقات میں کیا ہرج ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں مگر خانگی دربار کا انتظام میرے اختیار سے باہر ہے اس کے علاوہ سید صاحب کو جو ایک مسلمان بادشاہ کے دربار کے قواعد کی پابندی لازم ہے دستار بسر کمر بستہ ہونے میں ان کی وقعت کم نہیں ہو سکتی اگر وہ بلا دستار و کمر آئے تو میں ان کی ملاقات کے وقت حاضر نہ رہوں گا۔ مختصر دربار تو الگ چیز ہے۔ خلاصہ اینکہ میں سید صاحب کی ملاقات کو گیا۔ سید صاحب نے صاحب لوگوں کی طرح اوّل مجھ کو برآمدے میں منتظر رکھا۔ اس کے بعد اندر بلایا اور صاحب بہادر کی طرح دو تین منٹ ملاقات کر کے رخصت کر دیا۔ خلاصہ اینکہ سید صاحب آئے بھی چلے بھی گئے۔ کسی نے یہ بھی نہ جانا کون آیا کون گیا۔ سید صاحب نہایت ذی علم صاحب تصانیف کثیرہ ہیں دستار و کمر باندھنے سے کیا ان کے نام و شان میں فرق آ سکتا تھا۔ سر اد پر ولیمز نے جو اس وقت والسرائے کے ہاں مہمان ٹھیرے ہوئے تھے یہ سن کر کہ میں حضور پرنور کا اُستاد ہوں خواہ مخواہ عالم متبحر و علامہ وقت ہونگا مجھ سے ملنے کی خواہش کی بر وقت ملاقات قدر ٹے ہنود اور اُن کی تصانیف بزبان سنسکرت کا تذکرہ آیا میں اُن امور میں جاہل نکلا ملاقات ہو گئی مگر لطف فریقین کو نہ آیا۔

بعد ڈنر ایوننگ پارٹی میں سر اسٹیوارٹ بیلی سے ملاقات ہوئی۔ شاید کپتان کلارک نے یا سید حسین صاحب نے اُن سے کہدیا تھا کہ میں اُس رسالہ کا مصنف تھا جس میں ان کی کارروائی پر اعتراض شدید کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ مہاراج کے ایک مرہٹہ ہوا خواہ نے بمبئی میں گمنام چھپوایا تھا۔ کچھ حالات اس نے میری زبانی بھی سنے تھے جو اُس نے درج رسالہ کر دئے تھے۔ اور جن کا علم کپتان کلارک اور میرے قدیم مہربان کو تھا اور ان دونوں صاحبوں نے مجھ پر غلط قیاس قائم کر لیا تھا۔ اس ملاقات میں تذکرہ اُس رسالہ کا آیا۔ میں نے اپنی شرکت کا تو اقبال کر لیا۔ مگر مصنف اور دیگر حالات کی بابتہ باوجود ان کے اصراری استفسار کے صاف

انکار کر دیا۔ اس ہی جلسہ میں ایک بڑے معزز ہم مکتب قدیم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان صاحب نے یکایک عقب سے آکر میری آنکھوں کو بند کر لیا۔ جب انہوں نے آنکھوں سے ہاتھ اُٹھایا تو میں نے دیکھا کہ راجہ امیر حسن خاں رئیس اعظم محمود آباد سامنے کھڑے تھے۔ دونوں خوب گلے ملے۔ میرے ہم مکتبوں میں یہ راجہ صاحب اور راجہ بھنگا نے بڑا نام پیدا کیا۔ باقی سب معمولی حالت پر رہے۔ راجہ اندر بکرم ضرور نام پیدا کرتا مگر کم سنی میں انتقال کر گیا۔ اب سنا ہے کہ اس کی رانی نے خاتونان اودھ میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ چودھری واجد حسین تعلقدار گدیہ نے بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی وہ میرے پاس حیدرآباد آنے والے تھے مگر جلد انتقال کر گئے تیناجسین اُن کا جوان بیٹا بھی دفعتہً مر گیا۔

الغرض کلکتہ سے منزل بمنزل اس ہی شان شوکت سے بلدہ فرخندہ بنیاد سواری مُبارک واپس آئی مہاراج اور نواب امیر کبیر نے لارڈ رپن کو ان الفاظ سے حیدرآباد میں مدعو کیا کہ حضور پرنور کے اخذ اختیارات کے وقت آپ بھی ہماری دعوت قبول کیجئے۔ لارڈ رپن نے بخوشی اس کو قبول کر لیا۔ اب تک صدر صوبہ دار اقلیم ہند کسی ریاست میں اس طرح دورہ نہ کرتا تھا جس طرح صوبہ داران قطعات ہند مانند گورنران بمبئی و مدراس وحکمران پنجاب و اودھ و بنگالہ وغیرہ اپنے اپنے حدود حکومت میں اوقات مقررہ پر گردش کرتے پھرتے ہیں مگر اس دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر صوبہ دار بھی ریاستہائے ہنود و اسلام میں مثل سیارہ زحل کمربستہ[1] مستعد بکار گردش کرنے لگے اور اس کو فرائض منصبی میں شمار کر لیا۔ جس سے لاکھوں روپیہ مہمان نوازی میں ریاستوں کے صرف ہو جاتے ہیں۔ اور نتیجہ ہیچ صرف لفظ "سوزرین" کا نفاذ کامل ہو گیا۔

---

[1] "کمربستہ" اس لئے کہ اس سیّارہ کے گرد ایک پٹی ہوتی ہے۔

بلدہ میں ہنگامہ

اب سنئے کہ بلدہ فرخندہ بنیاد میں ہماری واپسی کے بعد جو ہنگامہ برپا ہوا اس وقت اس کو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایک گروہ ذی علم و ذی لیاقت سرد و گرم زمانہ چشیدہ گرگان باراں دیدہ روپیہ اور حکومت کی تمنائیں دل میں بھری ہوئی پہلے مفلس اب مقتدر بنے ہوئے "ھل من مزید" پکارتے، سازشوں کی ننگی تلواریں کھینچے، اور آپس میں بھی خود پینترے بدلتے ہوئے مگر بڈّھے مہاراج اور بیدار مغز امیر کبیر کے خون کے پیاسے۔ اگر موقع نہ ہو تو بھی اپنی دُور بینی سے موقع بنانے والے۔ بمثل اسپانِ ریسماں بریدہ ہر طرف دولتّیاں مارنے لگے۔ شہسوار میدان وزارت تو راہی ملک بقا ہو گیا کوئی ایسا چابک سوار نہ رہا جو ان منھ زور گھوڑوں کو قابو میں رکھتا۔ آپس میں بھی دانت نکال کر ایک دوسرے کو چکھیّ لگاتے تھے اور امیر کبیر اور مہاراج پر بھی دولتّیاں اُچھالتے تھے بلکہ اپنی دولتیوں سے رزیڈنسی کا دروازہ توڑ کر رزیڈنسی میں بھی اُچک پھاند کرنے لگے حیدر آباد کی بدقسمتی سے اس وقت چند انگریز مفلوک الحال بتلاش معاش و معیشت بلدہ میں آگھسے اور اپنے قلم اور لیاقت کو ضرورت مند خریداروں کے ہاتھ "ثمناً قلیلاً" بیچنا شروع کر دیا بلکہ افسوس کی بات ہے کہ ایک دو معزز انگریز پنشن یافتہ بھی اپنے نام اور عزت کو بامید نقد سرِ بازار فروخت کرنے لگے۔ دُور دُور کے اخباروں میں لمبے چوڑے مضامین نکلنے لگے۔ رزیڈنسی سے لے کر فارن آفس تک یہ دُور بین لوگ اپنے ذاتی اغراض چھپا کر ظاہری الفاظ خیر خواہی و نمک حلالی کے پردہ میں حالات کم سنی و نا تجربہ کاری شاہ و اُمیدوار وزیر ظاہر کر کے اپنی لیاقت کا رنگ اور اپنے وجود کی ضرورت جتانے لگے۔

رزیڈنٹ وقت ایک بھلامانس شریف النفس علم دوست آدمی تھا۔ خوب ان کے پھندے میں پھنس گیا۔ اور روز بروز کاروبار ریاست کی خرابیاں۔ جو انھیں حضرات کی کارستانی کا نتیجہ تھیں۔ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اب صاف صاف دو فریق آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ایک فریق خون گرفتہ مہاراج نرندر جس میں صرف دو انگریز اور ایک دو پارسی اہل سازش کے ہم پلّہ کے تھے۔ باقی کل اہل بلدہ کیا ہنود کیا مسلمان سیدھے سادے بھولے بھالے قدیم زمانے کی دستار و گفتار رکھنے والے دل سے مہاراج کے خیر خواہ مگر قدمے درمے قلمے عاجز و کم ہمت گھروں میں گھسے ہوئے۔ یا پرمیشور یا بھگوان یا اللہ یا رحمٰن پکار رہے تھے۔ ڈیوڑھی مبارک میں بھی یہی حال تھا۔ میر ریاست علی و مرزا محمد علی بیگ بسر کردگی کپتان کلارک و نواب میر سعادت علی خاں ایک زبردست فریق مخالف مہاراج و امیر کبیر ہوگئے اور اس خیال سے کہ میں شریک خون گرفتگان ہوں شرمناک و نازیبا حملے مجھ پر کرکے میری وقعت اور اعتبار حضور پرنور کی نگاہ میں کم کرنے کی کوشش بلیغ کرنے لگے۔ دوسرے حاضرباش جو یا امیر کبیر عمدۃ الملک یا امیر کبیر رشید الدین خاں کے نمک پروردہ تھے۔ اگلے وقتوں کی سمجھ بوجھ رکھنے والے انگریزی و انگریزیت سے ناواقف عربی و فارسی تو ایک طرف اردو میں بھی کج مج زبان پریشان بیان مثل اہل بلدہ مرعوب اور خوف زدہ "یا حفیظ" برزبان دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑیاں تھامے ہوئے فریقین کی لڑائی بھڑائی کے نہ موافق تھے نہ مخالف۔ دوسری طرف دوسرا فریق بظاہر خیر خواہ نواب میر لائق علی خاں مگر باطن میں اپنی غرض کے یار چست و چالاک۔ الغرض پریشانی کی وحشت ناک گھٹا ایسی چھا گئی تھی کہ اتنا بھی نہ دکھائی دیتا تھا کہ آج کے بعد کل کیا ہونے والا ہے۔ اس فریق میں بھی چند تحتی فریق تھے۔ مگر سب سے زیادہ تحتی فریق ذی علم و ذی لیاقت مہذب عالی خاندان مولوی

مہدی علی کا تھا۔ دوسرا تحتی فریق سید حسین صاحب بلگرامی کا قائم ہوا۔ سید صاحب عالم متبحر علوم انگریزی کے اور رزیڈنٹ خود شاعر و ادیب و علم دوست دونوں کی خوب دوستی ہوگئی۔ ان کے گروہ میں کچے دل سے میجر گاف و کپتان کلارک اور پکے دل سے میر ریاست علی اور مرزا محمد علی بیگ بھی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل تھے تیسرے صاحب سردار عبدالحق خاں دلیر جنگ بہادر تھے۔ یہ شخص مرد میدان اپنا آپ گروہ تھا۔ نہایت بلند ہمّت۔ صائب الرائے ہوشیار۔ پکّا مسلمان۔ دغا و مکر و فریب سے متنفر۔ کارکن و کارفرما دونوں صفات سے متصف اپنے دفاتر و محکمہ جات پر بارعب و داب ایسا قابض و متصرف کہ کیا انگریز اور کیا ہندوستانی۔ کیا دکھنی اور کیا مدراسی کسی کی مجال نہ تھی کہ اہل سازش سے راہ و رسم بھی رکھ سکے۔ یہ بیدار مغز آدمی اہل سازش کی چال کو تاڑ گیا تھا کہ یہ حضرات مہاراج اور امیر کبیر کے قلع و قمع کرنے کے واسطے نواب میر لائق علی خاں کے طرفدار ہوئے ہیں۔ تاکہ اس کے بعد خود شاہ و وزیر کی کم سنی و ناتجربہ کاری رزیڈنٹ اور فارن آفس پر ثابت کر کے خود اپنی ہوسیں نکالیں اور یہ کارروائی کچھ مشکل نہ تھی۔ رزیڈنٹ اصل حالات سلف سے ناواقف یقین کر بیٹھا تھا کہ نواب وزارت پناہ مرحوم کی رونق بازار ان ہی حضرات کی وجہ سے تھی ؎

وگرنہ سیلے بود در بہارستاں

اور قلم فروش انگریزوں نے اخباروں کے ذریعہ سے اس یقین کو خوب مضبوط کر دیا تھا۔ پس سردار دلیر جنگ ان حضرات کے سدّراہ ہوگئے۔ بالآخر کل محکمہ جات و دفاتر مولوی مہدی علی (محسن الملک) و سردار با وقار میں تقسیم کر دیئے گئے اور شاہ و وزیر طفل دبستان شمار کیے گئے۔ یہ امر سید حسین بلگرامی کو ناگوار گزرا اور باہم بساطِ جنگ بچھ گئی۔ تا ایں کہ اس کا

اثر شاہ و وزیر کے تعلقات پر بھی پڑنے لگا جس کا ذکر آگے آتا ہی مگر باہم دلیر جنگ اور اس
گروہ میں اس امر پر صلح قرار پائی کہ "نصفٌ لی و نصفٌ لکم ھذا قومٌ جاھلون"
پس یہ کل گروہ متفق ہو کر اب منتظر تشریف آوری صدر صوبہ دار اقلیم ہند یعنی لارڈ رپن رہنے لگے
گو آپس میں چھیڑ چھاڑ لپاّ ڈکی بھی ہوتی رہی کہ کون میر لائق علی خاں کے پاس سبقت لے جائے
اس میں ہر جانب سے مولوی مہدی علی کو شکست ملتی رہی۔ خانگی صحبت میں تو رنگ مرزا محمد علی بیگ نے
خوب جما لیا تھا اور محبت کی زبان میں پیارے علی بیگ موسوم ہو گئے تھے۔ انتظامی امور میں
سید حسین صاحب بلگرامی ایسے دخیل ہوئے کہ خطاب "چچا" سے ممتاز کئے گئے مگر یہ بظاہری
ہتکنڈے تھے۔ نواب میر لائق علی خاں آخر اپنے باپ کے بیٹے تھے۔ خلاصہ ایں کہ فریق مہاراج
کم ہمت نے رزیڈنٹ کے ہاں اور فارن آفس میں بمقابلہ اہل سازش اور ڈیوڑھی مبارک میں
بمقابلہ کپتان کلارک شکست کامل کھائی اور خدمت وزارت پر حق نواب لائق علی خاں کا تسلیم
کر لیا گیا مگر بقول شخصے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ مسٹر پالمر اور کرنل ڈا بر مہاراج کو ہمت
دلاتے رہے کہ لارڈ رپن اور سر مارٹمر ڈیورانڈ ہر گز لائق علی خاں کم سن کو خود مختارانہ خدمت
نہ دلائیں گے۔ چنانچہ نواب امیر کبیر کی بھی یہی رائے تھی مگر میں چوں کہ کل حالات سے واقف تھا
اور مہدی علی اور عبد الحق مجھ سے ملتے رہتے تھے میں نے ملیا شاگرد پیشہ کے ہاتھ یہ
مصرعہ مہاراج کو لکھ بھیجا تھا کہ ع

ازاں پیش بس کن کہ گویند بس

اور اب لارڈ رپن بھی پونا تک آ گئے اور ہمارے یہاں بھی دھوم دھام کے ساتھ
انتظام ان کی مہمان داری اور دعوت کا مکمل ہو گیا کہ اتنے میں ایک خط رزیڈنٹ کا مہاراج
کے پاس آیا مضمون اس کا یہ تھا "چاہیئے تھا کہ حضور پر نور بذات بابرکات خود سرحد

ریاست پر استقبال والسرائے کا کرتے مگر والسرائے نے یہ معاف فرما دیا اور بجائے ان کے چار امرائے عظام سرحد پر برائے استقبال حاضر رہیں وغیرہ وغیرہ۔" یہ مراسلہ پڑھکر مہاراج رونے لگے میں اس وقت اُن کے پاس موجود تھا میں نے کہا کہ مہاراج از ماست کہ بر ماست کیوں آپ نے دعوت دی جو اس کی نوبت آئی۔ ادھر امیر کبیر نے یہ کہا کہ اگر حضور پر نور میری کمک و مدد کریں تو میں اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کو موجود ہوں اور حق یہ ہے کہ خود نواب میر سعادت علی خاں کے موںھ سے بھی بے ساختہ بآواز دردناک نکل گیا کہ "ہائے اس وقت بابا کو زندہ ہونا تھا"۔ خلاصہ ایں کہ دوسرے روز لارڈ رپن[1] آن پہونچے اور رزیڈنسی میں فروکش ہوئے۔ چار امرائے عظام جو استقبال کو گئے تھے علی الصباح مزاج پرسی کے لئے رزیڈنسی گئے اس کے بعد معمولی دید باز دید اور دربار اور ڈنر وغیرہ ہوتا رہا جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں مگر جس روز صدر صوبہ دار اقلیم ہند رزیڈنسی میں داخل ہوئے۔ اہل سازش کے ہاں کھلبلی پڑ گئی اور رزیڈنسی کی طرف دوڑ پڑے۔ اہل سازش کی خوش قسمتی سے ایک انگریز موسوم بہ مسٹر بلنٹ ایک خاص مالیخولیا میں گرفتار مصر و شام وغیرہ ممالک اسلامیہ میں سیر و سیاحت کرتا ہوا ہندوستان میں مع اپنی زوجہ موسوم بہ لیڈی بلنٹ وارد ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ لیڈی بیٹی یا پوتی یا نواسی لارڈ بائرن انگریزی شاعر نامآور کی تھی۔ دونوں میاں بیوی مسلمانوں اور بالخصوص عربوں سے کمال درجہ محبت کا دعویٰ رکھتے تھے اور ہندوستان کے ہر صوبے کے مشہور مسلمانوں سے مثل مولانائے معظم مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی مل کر ترغیب دلاتے تھے کہ ہندوستان یا مصر میں ایک عربی یونیورسٹی باصول جدید قائم کی جائے۔ گو خود انگریز تھے مگر انگریزی اہل حل وعقد کے اصول حکمرانی کے بڑے مخالف تھے اور

---

[1] ۴ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ ہجری (۱۸۸۴ء)

مسلمانوں کی طرف داری میں انگریزی حکام وقت چہ ادنیٰ چہ اعلیٰ کی مذمت میں رطب اللسان تھے
چنانچہ پھرتے پھراتے ہندوستان کا گشت لگاتے ہوئے حیدرآباد میں بھی آن دھمکے اور
یہ وقت تھا کہ سرجان گارسٹ[1] انگلینڈ سے بصرف کثیر بمشورہ طامس پامر برائے اعانت مہاراجہ
طلب کیا گیا تھا) پس ان کا ورود نامسعود بہوا خواہان نواب میر لائق علیخان کے واسطے میمنت نمود
ہوگیا۔ ایسا زبان دراز بیباک اور اپنی بی بی کی علوئے مرتبت کی وجہ سے اعلیٰ انگریزی سوسائٹی
میں بارسوخ۔ ان حضرات کو کہاں میسر ہوسکتا تھا۔ اس کے گرد جمع ہوگئے اور دھوم دھام کی
دعوتیں ہونے لگیں اور چند لوگ خاص اس کے گرد اس غرض سے مقرر و متعین کئے گئے کہ اس کے
دل دادہ مضامین عربی یونیورسٹی کی ضمنی بحث میں حیدرآباد کے غیر واقعی حالات و مذمت
نواب امیر کبیر و مہاراجہ بہادر خوب اس کے کان میں ٹھونسے جائیں۔ علاوہ ازیں اس نے
بچشم خود اعلیٰ درجہ کی طرز معاشرت نوابان میر لائق علی خاں و آسمان جاہ وقار الامرا کو دیکھا اور
ان کے ہوا خواہوں و مصاحبین نئی روشنی کی گفتار رفتار و دستار دل پسند کو مشاہدہ کیا
دوسری طرف ایک پیر خمیدہ قامت عمامہ بر سر ڈھیلا ڈھالا انگرکھا در بر نہ وہ مکان کی سجاوٹ
نہ کوچ نہ صوفہ کی نشست نہ وہ بریک فاسٹ و ڈنر کی معاشرت نہ وہ نئی تہذیب و زرق و برق
لباس والے عربی یونیورسٹی کے فوائد سمجھنے اور بحث کرنے میں ذکی الفہم مصاحبین یہ سماں
دیکھ کر کامل طرف دار نواب میر لائق علی خاں کا ہوگیا اور یاروں کا آلہ کارگزار بن گیا۔ الغرض
ایک طرف یہ شاندار اور بھڑکیلا سماں اور دوسری طرف یہ دقیانوسی حالت سرجان گارسٹ تو

---

[1] یہ انگلستان کے نامی وکیل تھے اور ۱۸۶۶ء میں لنڈن میں نواب مختار الملک نے ان کو معاملۂ برار کے تصفیہ کے لئے
سرکاری وکیل مقرر کیا تھا۔ پس جس وقت یہ حیدرآباد آئے تو عام خیال یہی تھا کہ برار کے کام کے واسطے آئے ہیں۔
(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

روپیہ وصول کرکے چمپت ہوئے۔ مسٹر بلنٹ نے راہ و رسم لارڈ رپن کے سکرٹری سے پیدا کر لی تھی اور اپنا تجربہ اُن سے بشرح و بسط بیان کر دیا تھا بلکہ حالت قیام بلدہ میں ان سے خط و کتابت بھی جاری تھی ایک شخص سیاح جس کو کوئی تعلق معاملات حیدرآباد سے نہ تھا اس کی بے غرضانہ تحریر و تقریر کا اثر ہوتا رہا۔ مجھ سے صرف ایک بار ان بزرگوار سے ملاقات[1] ہوئی اور وہ بھی بے مزہ اور بے لطف۔ اس واسطے کہ اس کے کان میری نسبت بھی کچھ بھر دیئے گئے تھے جس وقت لارڈ رپن حیدرآباد پہونچے وہ اپنی رائے قائم کر چکے تھے تاہم ان کو حضور پُرنور کی رائے بھی دریافت کرنی ضرور تھی۔ بندگانِ عالی کے خیالات سفر کلکتہ ہی میں بدل چکے تھے۔ بلدہ میں پہونچ کر نواب لائق علی خاں کا رنگ ایسا جم گیا تھا کہ بے ان کی صحبت کے اعلیٰ حضرت کو قرار نہ تھا حتیٰ کہ ایک عنایت نامہ میں ان کو تحریر فرما دیا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

لہٰذا جو ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا۔ مسٹر کاڈرہی نے کہ طرف داران کے ہو چکے تھے پورا موقع ان کو سر مارٹیمر ڈیورانڈ کے پاس گھسنے کا دیا۔ الغرض یہ قرار پا گیا کہ بڈھا مہاراج معزول کیا جائے اور کسی قسم کی قدر ان کی خدمت کی نہ کی جائے بلکہ بذلّت و خواری معزول

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

ورنہ دراصل مشورۂ نام پالمر مہاراجہ نرندر پرشاد کی مدد یعنی اُن کو خدمت دیوانی پر مستقل کرانے آئے تھے۔ معاوضہ پچھتر ہزار روپیہ کلدار قرار پایا تھا لیکن باوجود ناکامی اپنی پوری رقم وصول کر لی تھی۔ لنڈن جا کر اُنھوں نے فارٹ نائیٹلی ریویو میں نہایت بدنما حملے حضور پرنور اور وزیر نواب لائق علی خاں پر شروع کر دیئے تھے چوں کہ گارسٹ صاحب مہاراجہ کے وکیل تھے نتیجہ مہاراجہ کے حق میں اور بُرا ہوا اور شاہ اور وزیر کو یقین دلایا گیا کہ یہ حملے مہاراجہ کے علم و ہدایت سے کئے جا رہے ہیں ۱۲

[1] بلنٹ صاحب نے اس ملاقات کا ذکر اپنی کتاب "انڈیا انڈر رپن" میں کیا ہے صفحہ ۲۰۴ –

کیئے جائیں۔ گویا کہ وہ ملزم و مجرم سرکارین کے تھے۔ اہل بلدہ اور مہاراج کی طرف سے یہ غفلت
ہوئی کہ ابھی تک اسی اُمید موہوم پر کہ شاید تقدیر زور کر جائے چپکے بیٹھے رہے۔ دوسرے
دن دربار گدّی نشینی[1] ہوا۔ سر مارٹیمر ڈیورانڈ نے مہاراج کی کرسی دُور پھینک دی اور
نواب میر لائق علی خاں کی کرسی بجائے مہاراج درجۂ وزارت پر رکھوا دی۔ مہاراج تو گویا
زندہ زمین میں غرق ہو گئے اور تمام بلدہ میں ایک سکتہ کا عالم ہو گیا[2]۔ اب سواری صدر صوبہ دار
کی بھی آ پہونچی اور ایک تخت پر پہلو بہ پہلو حضور پر نور بیٹھ گئے۔ سر مارٹیمر نے کھڑے رہ کر
فارسی میں لنبا چوڑا خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد حضور پر نور نے پاندان و عطردان بدست مبارک خود
نواب صدر صوبہ دار کو عطا فرمایا اور نواب لائق علی خاں نے بحیثیت وزیر اعظم سر مارٹیمر و رزیڈنٹ
کو دیا۔ دربار برخاست ہوا۔ مہاراج تو افتاں و خیزاں اپنے کلبۂ احزاں میں جا چھپے نواب
وزیر سبز عماری میں مع جلوس وزارت بکمال کرّ و فر دولت کدۂ وزارت میں داخل ہوئے
مہاراج کے ہاں ایسا ماتم اور اہل بلدہ پر ایسی حیرت کہ ہر در و دیوار سے یہ صدا گوش زد تھی کہ

الٰہی کس بے گناہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شور ربائی ذنبٍ قتلتنی ہے

---

[1] ۷ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء اسی روز نواب لائق علی خاں خدمت مدار المہامی سے سرفراز ہوئے ۱۲ [2] اُسی روز کا ایک واقعہ قابل ذکر یہ ہے کہ جس وقت مہاراج نرندر پرشاد بسواری عماری مع جلوس ڈیوڑھی مبارک پہونچے اور مہتاب محل میں داخل ہوئے تو اُن کو خبر ہوئی کہ نواب لائق علی خاں کی کرسی ان کی کرسی ہٹا کر رکھدی گئی ہے۔ مہاراجہ پر دفعتہً اس علانیہ ذلت سے ایسی درماندگی طاری ہوئی کہ کرسی پکڑ کر اپنے کو گرنے سے بچایا۔ اُن کی بیٹی جو بوجہ حمیدہ جسم سینہ پر بندھا کرتی تھی کھسل کر پاؤں تک اوتر آئی۔ فوراً بمشکل آواز دی کہ آغا صاحب کو بلاؤ۔ جب والد آئے تو کہا کہ مجھے اس ذلت سے بچاؤ ورنہ میں یہیں ختم ہوا۔ والد مہاراجہ کی حالتِ زار دیکھکر نہایت پریشان ہوئے۔ وہ السراے کے آنے میں چند لمحے رہ گئے تھے تاہم فوراً حضور پر نور کی قیام گاہ کی طرف گئے

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آیندہ)

دوسری طرف اللہ تبارک و تعالیٰ نے خاندان وزارت کو پھر رونق تازہ عطا فرمائی۔ دوست شاد دشمن حقیر ہوئے کل ملازمانِ ریاست کے ہاں خوشی کے نقارے بجنے لگے۔ اُن کے چھوٹے بھائی نواب سعادت علی خاں سپہ سالار سلطنت آصفیہ اور مرزا محمد علی بیگ اُن کے نائب باسم کپتان یا میجر مقرر کئے گئے۔

آپ بیتی اور جگ بیتی

اب راقم کی آپ بیتی سنئے۔ دربار اختیارات کے دوسرے روز میں حسب معمول ڈیوڑھی مبارک میں حاضر ہوا اور حضور پر نور کو مہتاب محل میں سے کر بیٹھا اور یہ گفتگو گوش گزار اقدس کی" حضور پر نور بعمر طفولیت تخت نشین دولت آصفیہ ہو چکے تھے۔ لارڈ رپن کا یہاں آنا اور آپ کو گدی نشین کرنا ہیچ معنی ندارد یہ صرف فدوی کی پریشانی اور مہاراج کی سو تدبیر کا نتیجہ ہے لیکن یہ دعا ہے کہ ؎

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بملکِ دلبری پایندہ باشی

آج فدوی کی شاگردی ختم ہوئی ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

حضور پر نور دور سے اُن کو دیکھکر سمجھ گئے کہ یہ کیوں آرہے ہیں بس فوراً دوسری طرف تشریف لے گئے۔ چند بار یہی ہوا کہ جب والد کو اپنی طرف آتے دیکھا اور طرف تشریف لے جاتے تھے کہ اتنے میں لارڈ رپن کی سواری آئی اور حضور پر نور بغرض استقبال تشریف لے گئے۔ ذوالقدر جنگ

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ نواب وزیر فدوی سے کمال درجہ ناراض ہیں لہذا مجبوراً عرض ہے
کہ فدوی کو چھ ماہ کی رخصت عطا فرمائی جائے رہ گئی فدوی کی پرورش آیندہ سو ع

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

حضور پرنور اس گفتگو کو سماعت فرماتے رہے اور یکایک قلم دوات اور کاغذ آگے گھسیٹ کر
تحریر فرمایا کہ "حضرت آغا مرزا بیگ کو رخصت شش ماہ عطا کی جائے اور از تاریخ معزولی مولوی
مسیح الزماں خاں تا تاریخ امروز بحساب پندرہ سو روپیہ ماہوار ادا کر دی جائے اور یہی ماہوار
ماہ بماہ دے دیا جائے"۔ یہ تحریر لکھ کر مجھ کو عطا کر دی اور فرمایا کہ حضرت اگر باہر جانے کا قصد ہو
تو بے میری اجازت قصد نہ کیا جائے۔ میں نے وہ تحریر جیب میں رکھی اور باطمینان گھر واپس آیا
مگر خوبیٔ قسمت سنئے کہ وہ تحریر نہ معلوم کس طرح جیب سے کہیں راستہ میں گر پڑی مکان پر پہونچکر
جو دیکھا جیب خالی تھی رنج و افسوس تو از حد ہوا مگر چارہ کار چہ بود دل کو مسوس کر گھر میں چھپ رہا۔
مگر "عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم" یہی میرے حق میں بہتر ہو جیسا کہ آیندہ معرض بیان
میں آئے گا۔

اب جگت بیتی سنئے اہل سازش کے ہاتھ دس کروڑ سالانہ کی ریاست لگ گئی۔ اس واسطے
کہ مسٹر کاڈری نے مستقل طور پر یہ رائے قائم کر لی کہ شاہ و وزیر دونوں کم سن اور ناتجربہ کار ہیں اور
موجودہ اہلکار ہندوستان کے منتخب لائق تجربہ کار اور عالی خاندان وہ لوگ ہیں جن کے بھروسہ پر
خود وزیر مرحوم انتظام ریاست کرتے تھے۔ لہذا ان ہی حضرات کو ذمہ دار امن و امان کرنا چاہیئے
اور یہ رائے فارن آفس میں منظور کر لی گئی۔ بالخصوص اس لئے کہ بقول خود اہل سازش دونوں نوجوانوں
کی صحبت میں کم سن عیش دوست مصاحب جمع ہو گئے تھے۔ یہ اصول مستقل طور پر قائم ہو گیا
اور تا عہد وزارت نواب بشیر الدولہ یہ پالسی فارن آفس میں قائم رہی۔ پس ان اہلکاروں

کے لئے ضروری ہوا کہ رزیڈنٹ کو یار بنائیں اور اپنی قدر و منزلت اور حسن کارگزاری اس کی نگاہ میں روز افزوں قائم رکھیں۔ اس امر کے واسطے یہ لازمی ہوا کہ ہر اہلکار بمقابلہ دوسرے خواجہ تاش کے رزیڈنٹ اور وزیر اعظم کے پاس زیادہ رنگ جمائے۔ پس وہ گھوڑ دوڑ اور بسابقت شروع ہوگئی جس نے بزبان انگریزی حیدرآباد کو (Hot bed of intergue) اور مخزنِ سازش مشہور کردیا۔ اس وبائے عالمگیر سے بچند وجوہ در دولت شاہی محفوظ رہا۔ اول اینکہ حاضر باشان در دولت شاہی سوائے میرزا محمد علی بیگ و میر ریاست علی کے اور باقی سب قدیم رفتار و دستار کے لوگ جو نئی معاشرت سے ناواقف اور اپنی حالت پر قانع تھے اور آداب شاہی اس قدر ان کے رگ و پے میں ساری تھا کہ معمولی معروضات کی بھی جرأت نہ کرتے تھے۔ برخلاف ان دو صاحبوں کے جنھوں نے کمال درجہ کا رسوخ حاصل کرلیا تھا۔ فرق ان دونوں صاحبوں میں یہ تھا کہ میر ریاست علی معمولی خیالات کے آدمی تھے ان کی حد پرواز اپنے ہی کارخانجات مفوضہ تک تھی۔ مرزا محمد علی بیگ پردیسی آدمی دوراندیش خوش فکر چست و چالاک اپنے فنون سپاہگری میں حیدرآباد میں بے مثل۔ شاہ و وزیر کے مصاحبت کے رعب کے ذریعہ سے کاربرآری پر ایسے مستعد تھے کہ ع

دست از طلب ندارم تا کار من برآید

شہسوار ایسے کہ بعد حضور پرنور بلدہ میں اپنا ہمسر نہ رکھتے تھے۔ ایک روز شاہ و وزیر اعظم مع مصاحبین ہواخوری کے لئے جانب سرورنگر تشریف لے گئے۔ راستہ میں جیبی رومال وزیر اعظم کا گر پڑا اس شہسوار نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے جھک کر رومال زمین سے اٹھالیا آواز صد آفریں ہر طرف سے بلند ہوئی۔

خلاصہ ایں کہ ڈیوڑھی مبارک اہل سازش سے بالکل صاف و پاک تھی اور اگر کسی

شامت زدہ نے کسی کی شکایت میں لب کھولنے کی جرأت بھی کی تو حضور پر نور کا چہرۂ مبارک متغیر ہو جاتا تھا اس واسطے کہ سن طفولیت سے ہر حاضر باش کی خصلت و جبلّت سے بخوبی واقف تھے دوم این کہ امرائے عظام نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ سوم بڑی وجہ یہ تھی کہ حضور پر نور نے کل اختیار سیاہ سفید کا وزیر اعظم کے سپرد فرما دیا تھا اور اس قدر ان پر عنایت شاہی مبذول تھی کہ ایک بار یہ شعر ان کو لکھ بھیجا تھا کہ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پس مرجع اہل سازش و ربِ دولت وزارت و قصر رزیڈنسی بن گیا

آمدم بر سر مطلب روز دوم دربارِ اختیارات مغلئی[1] کا حکم صادر ہوا جس میں یہ حقیر بخطاب سرور جنگ ہفت ہزاری[2] ہفت ہزار سوار سرفراز فرمایا گیا اور دیگر مصاحبین بھی مختلف خطابات سے مثل افسر جنگ و محبوب یار جنگ ممتاز ہوئے۔ میں نے اپنی حماقت سے بحصول اجازت ایک فرمان جاری کیا جس میں خانگی انتظامات ڈیوڑھی مبارک اور قواعد دربار شاہی مندرج کئے اور امرائے عظام سے لے کر امرائے ریزہ جمعداران و منصبداران کے واسطے

---

[1] سنا ہے کہ مغلئی دربار بھی بروز تخت نشینی ۷ ربیع الاوّل ۱۳۰۱ھ منعقد ہوا تھا۔ والد کو خطاب سرور جنگ اور مرزا محمد علی بیگ اور میر ریاست علی کو خان بہادر عطا ہوا۔ بموقع جشن سال گرہ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ کو خطاب سرور الدولہ اور سرور الملک عطا ہوئے اور تو سب نے درخواست کر کے خطاب پائے لیکن والد کو حضور پر نور نے اپنے دست مبارک سے لکھا کہ "حضرت میں نے اپنی سال گرہ میں آپ کے واسطے سرور الدولہ اور سرور الملک خطاب تجویز کیا ہے" اسی دربار میں بحکم خاص مجھکو ذوالقدر جنگ۔ بھائیوں میں سے مرزا سجاد بیگ کو عثمان نواز جنگ۔ حیدر بیگ اور اکبر بیگ کو خان بہادر اور بہنوئی حمید اللہ خاں ابن مولوی سمیع اللہ خاں کو سربلند جنگ افضل العلما خطاب عطا ہوئے ۱۲ ذوالقدر جنگ

[2] یہ مجھے یاد نہیں کہ ہفت ہزاری تھا یا پنج ہزاری مگر زیادہ تر یاد ہفت کی ہے اور سب کو پنج ہزاری ملا تھا ۱۲

حسب مراتب جائے نشست و استادگی مقرر کی۔ یہ نیا طریق اجرائے فرمان اور اس کے مضامین اور میری مداخلت بیجا ایسی وزیر اعظم کو ناگوار گزری کہ وہ فرمان کالعدم کیا گیا اور میں معتوب ہو کر ایسا خانہ نشین ہوا کہ پھر عرصہ دراز تک خاموش تماشا دیکھتا رہا۔ نواب وزیر نے قدیم قواعد کو توڑ کر جدید انتظام ڈیوڑھی مبارک میں جاری فرمایا۔ افسر جنگ بہادر و محبوب یار جنگ بجائے عرض بیگی ایڈیکانگ مقرر ہوئے۔ سیاہہ نویسی ڈیوڑھی مبارک برائے نام رہ گئی۔ کل معروضات و باریابی صرف بذریعہ ایڈیکانگین قرار پائی اور صدور احکام خانگی بھی ان ہی کے ذریعے سے ہوا کرتے تھے۔ انگریزی دربار کے اطلاع نامہ حسب قواعد انگریزی بھی ان ہی کے ذریعہ سے جاری ہوتے تھے۔ ایک فہرست ان حضرات کی جو دعوت ڈنر وغیرہ میں قابل شرکت سمجھے گئے تھے ان ہی حضرات نے مرتب کی۔ الغرض ایک انقلاب عظیم ڈیوڑھی مبارک میں ہو گیا۔ چوں کہ یہ حضرات قدیم قواعد و ضوابط سے لاعلم تھے اور اہل یورپ کے شاہی مراسم تو ایک طرف وہاں کے امرائے عظام تک کی معاشرت سے ناقص العلم تھے پرانی رفتار غائب نئی رفتار ناقص آدھا تیتر آدھا بٹیر والا معاملہ ہو گیا۔ امرائے عظام تو ان قواعد کے پابند نہ ہوئے اور دربار و دعوت وغیرہ میں نواب امیر کبیر و نواب آسمان جاہ بجائے یونیفارم (وردی) وہی اپنے قدیم لباس میں شریک ہوتے رہے ڈنر سوٹ وغیرہ کا نام بھی ان کو معلوم نہ تھا گو رفتہ رفتہ سوائے امیر کبیر دیگر امرا بھی یہ جدید طریقے اختیار کرنے لگے۔ عام طور پر جو شامت زدہ نافہمی سے خلاف ان قواعد کے حاضر ہوتا وہ وحشی سمجھا جاتا۔ حضور پرنور کے ملاحظہ میں صرف ضروری امور یا رزیڈنسی کا کوئی ضروری مراسلہ وہ بھی صرف بطور اطلاع کبھی کبھی پیش کیا جاتا تھا۔ عام انتظام کلیۃً در دولت وزارت سے متعلق تھا۔ گو یہ اسی شطرنج کا نقشہ تھا جو ارسطو فطرت وزارت پناہ مرحوم جما کر چھوڑ گئے تھے اور جس کو اپنے عہد وزارت

میں مہاراج بمشکل بٹھا رہے تھے۔ اتنی فرصت ان کو نہیں ملی کہ جو تبدل و تغیر وزیر باتدبیر مرحوم کیا چاہتے تھے یا جو نئے اصول ان کے مرکوز خاطر تھے وہ جاری کر سکیں۔

چند تغیرات

اول جو بڑا تغیر اور انقلاب عظیم نواب لائق علی خاں نے کیا یہ تھا کہ اس وقت تک زبان ریاست فارسی تھی۔ وزیر حال نے زبان ریاست اردو کر دی۔ اس جگہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز میں سہ پہر کے وقت وزارت پناہ مرحوم (سر سالار جنگ اول) کی خدمت میں حاضر تھا۔ اتفاقاً اثنائے گفتگو میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آج مولوی مشتاق حسین نے ایک نئی بات مجھ سے کہی کہ فارسی زبان کے عوض کل دفاتر و محکمہ جات ریاست میں اردو زبان جاری کر دی جائے۔ میں نے حماقت سے عرض کیا کہ مولوی صاحب کی رائے تو معقول ہے یہ سنتے ہی یا تو مسند سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے یا سیدھے اٹھ بیٹھے اور فرمایا "خدا نہ کرے" خدا کے الف کو اتنا بڑھایا کہ میں گھبرا اٹھا اور سمجھا کہ تم سے غلطی ہوئی اس کے بعد فرمایا کہ تم ہندوستانی لوگ فارسی تحریر و تقریر میں مشاق نہیں ہو۔ فارسی زبان اہل اسلام کے فتح مندی کی علامت ہے کہ ہم بھی قوم فاتح ہیں اور یہ ملک ہم نے بزور شمشیر فتح کیا۔ اپنے ملک میں تو تم لوگ یہ نشانی مٹا چکے اب یہاں بھی یہ اندھیر کیا چاہتے ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں، فارسی بھی زندہ رہے گی۔

دوسرا تغیر عظیم[1] یہ ہوا کہ مراسلت مابین وزیر اعظم و رزیڈنٹ بذریعہ میجر گاف و سید حسین صاحب بلگرامی شروع ہو گئی۔ منشی خانہ برائے نام رہ گیا اور منشی محمد صدیق کہ اباً عن جدٍ

---

[1] دیکھو جریدہ غیر معمولی مورخہ ۱۶ جنوری ۱۸۸۶ء۔

اس خدمت پر ممتاز تھے اور سفر و حضر میں کسی وقت، نواب وزارت پناہ سے جدا نہ رہتے تھے اب ان کی باریابی بھی دشوار ہوگئی۔ انگریزی عبارت میں میجر گاف فوجی آدمی منشی نہ تھے اور سید حسین صاحب کی انشا پردازی ایسی لاجواب تھی کہ اچھے اچھے اہل زبان ادیب اور منشی ان کی لیاقت کے معترف تھے۔ مگر معاملہ نگاری میں ان کو مشق نہ تھی اس واسطے کہ نواب وزارت پناہ مرحوم نے کبھی ان سے انتظامی معاملات میں کام نہیں لیا تھا۔ بوین صاحب اور سید صاحب دونوں بحیثیت معتمد خانگی صرف معمولی مراسلت مثل سیر و شکار یا گاڑیاں گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کے طلب کے جواب یا دعوت وغیرہ کی بابت رزیڈنٹ سے مراسلت کرتے تھے انتظاماتِ ملکی میں ان کو مطلق مداخلت نہ تھی۔ مگر اب نواب وزیر حال کے مشیر خاص تمام معاملات میں دخیل ہوئے اور مولوی مہدی علی کہ بحیثیت معتمد مال و فینانس اعلیٰ ترین عہدہ دار ریاست تھے، سید صاحب کے سامنے مثل گلِ مہدی پژمردہ بے بو و بے رنگ ہوگئے گو ہر روز کتب اخلاق بغل میں دبائے ہوئے ڈیوڑھی وزارت پر حاضر ہوتے تھے مگر درس اخلاق تو ایک طرف باریابی بھی بدشواری ہوا کرتی تھی۔ صرف تعمیل احکام جو اکثر بمشورہ سید صاحب جاری ہوا کرتے تھے کیا کرتے تھے۔ راقم تو خانہ نشین ہو چکا تھا اور مسٹر کردن پنشن لے کر وطن روانہ ہوگئے تھے۔ کپتان کلارک البتہ درِ دولتِ فلک رفعت شاہی میں بہت سی امیدیں دل میں لے کر جایا کرتے تھے اور ان کو یقین کامل تھا کہ اعلیٰ حضرت ان کو اپنے معتمدِ خانگی کی خدمت پر مع معتمدی علاقہ صرف خاص سرفراز فرمائیں گے اس خدمت کی بابت ان کو مرزا محمد علی بیگ افسر جنگ بہادر ان کے دست گرفتہ تھے اور سید حسین صاحب مؤتمن جنگ بہادر بھی کہ خاص الخاص ان کے دوست تھے معاون تھے دونوں سے بہت کچھ امید کامیابی کی تھی مگر چوں کہ ان کی اخلاقی حالت اچھی نہ تھی ظاہر اور باطن

ایک نہ تھا۔ لہذا حفظ آیندہ کی وجہ سے نواب وزیر نے ان کا وجود حیدرآباد میں نامناسب تصور فرمایا اور رزیڈنٹ کو اپنا شریک رائے کرکے پنشن دے کر وطن روانہ کردیا اور اپنے مشیر خاص سید حسین بلگرامی کو بخطاب پرائیویٹ سکرٹری ہزہائنس و منتظم صرف خاص ڈیوڑھی مبارک مقرر کردیا۔ مگر چوں کہ نواب وزیر کو خود ایک انگریز منشی و ادیب کی ضرورت تھی۔ مولوی مہدی علی صاحب کو موقع مل گیا۔ اس ذی علم اور ضرورت سے زیادہ دانا آدمی نے اپنے پاس ہر فن کے اعلیٰ لیاقت کے مددگار جمع کر رکھے تھے۔ من جملہ ان کے مسٹر فریدوں جی بھی تھے گو وہ عبارت کی رنگینی جو سید صاحب میں تھی ان میں نہ تھی مگر عبارت بلیغ اور بالخصوص معاملہ نگاری میں بہت خوش لیاقت تھے۔ پس ان کو نواب وزیر کے پاس اس غرض سے جما دیا کہ میرا دست گرفتہ ہے، نواب وزیر کو قابو میں رکھے گا۔

نواب وزیر کو اللہ تبارک تعالیٰ نے عجب ذہنِ رسا اور قوی یادداشت عطا فرمائی تھی۔ پہلے سید صاحب اور بعدہٗ فریدوں جی صفحے کے صفحے خطبات یعنی (Speeches) اسپیچز کے لکھ کر ان کو دیتے تھے اور وہ ایک نظر میں تمام و کمال فرفر عمدہ لہجہ میں اس طرح ادا فرماتے تھے کہ گویا فی الوقت طبع زاد اسپیچ دے رہے ہیں اور گو تحریر میں مطلق مداخلت نہ تھی مگر انگریزی اور فارسی میں بہت خوش گفتار تھے۔

مہدی علی کی بے مثل تدبیر

یہاں مہدی علی کی بے مثل تدبیر کا ایک قصہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ جب سید حسین بلگرامی کی گرمیِ بازار کی وجہ سے مہدی علی مردود بارگاہ نواب وزیر تھے، ایک روز نواب لائق علی خاں کی صحبت میں سید حسین بلگرامی۔ مہدی حسن۔ مہدی علی۔ نواب سعادت علی خاں
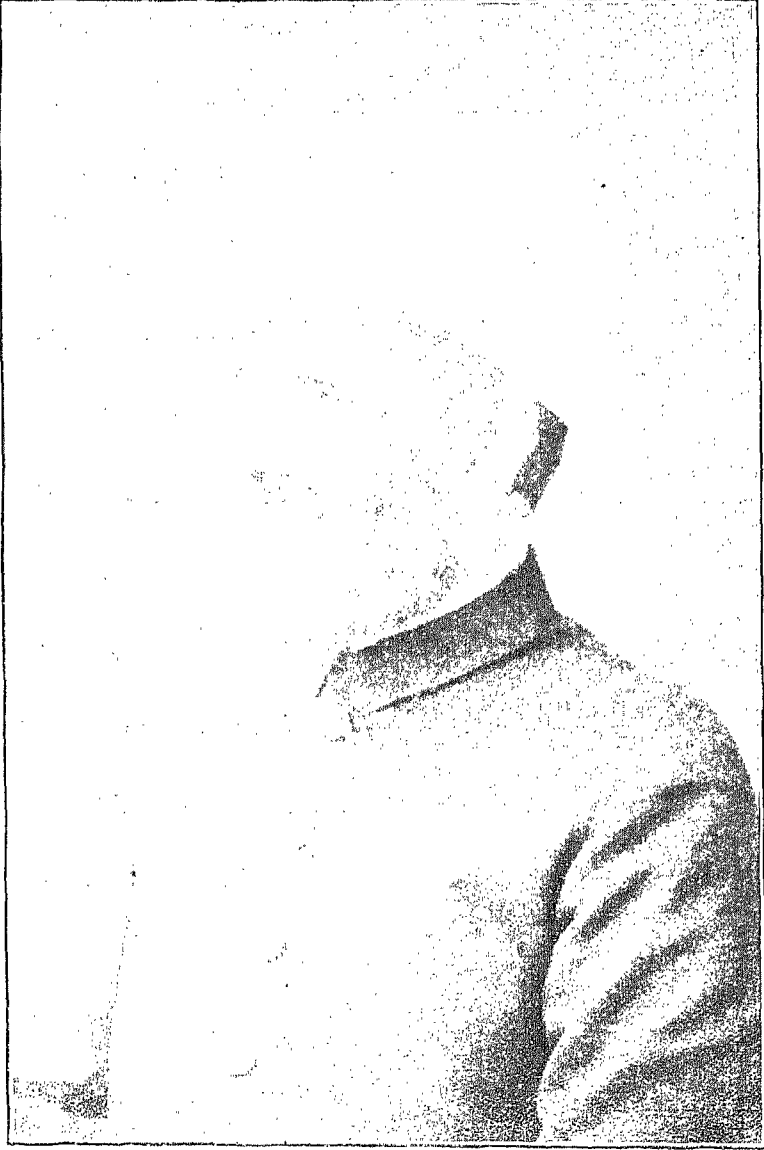
نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی
سید مہدي علي خان منیر نواز جنگ

منیرالملک مولوی چراغ علی۔ عبدالحق و مشتاق حسین و دیگر مصاحبین ریزہ جمع تھے کہ اثنائے حرف و حکایت مہدی علی نے سید حسین صاحب کی وفاداری کا تذکرہ شروع کیا اور کہا کہ سرکار کا ایسا وفادار اور جاں نثار اگر حضور کا پرائیوٹ سکرٹری ہو جائے تو پھر سرور جنگ کی باریابیاں خود بخود موقوف ہو جائیں گی۔ منشا یہ تھا کہ سید حسین صاحب کسی طرح نواب وزیر کے پاس رہیں۔ سید حسین صاحب تو فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے۔ سب نے مہدی علی کے رائے کی تائید کی۔ رئیس اور وزیر میں اس وقت اتفاق تھا۔ سید حسین صاحب فوراً اس خدمت پر مقرر ہو گئے۔ مہدی علی صاحب نے سید حسین صاحب کی علٰحدگی کے بعد ہی نواب وزیر پر اپنا ایسا رنگ جمایا اور خود سید حسین نے اپنی کج فہمی سے بطور معتمد خانگی اعلیٰ حضرت اپنے محسن کے معاملات میں ایسی خرابیاں ڈالیں کہ مہدی علی نے ان کی ایمان فروشی کے روزانہ قصّوں سے نوجوان وزیر کے کان بھر کر چند ہی روز میں نواب لائق علی خاں کو سید حسین صاحب کی صورت سے متنفر کر دیا۔ اب سید صاحب اور مولوی صاحب میں مثل دو چپت پہلوانوں کے رد و قدح ہونے لگی[1]۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شاہ و وزیر میں نا اتفاقی شروع ہو گئی۔ نواب وزیر نے حسن بن عبداللہ کو سید صاحب کے پاس برائے فہمائش بھیجا۔ حسن صاحب نے نادانی سے سید صاحب کی گزشتہ حیثیت یاد دلائی کہ وہ دست گرفتہ و ساختہ و پرداختہ خاندان وزارت کے تھے۔ اس پر سید صاحب کو غصہ آ گیا اور جواب دیا میں اُن کے (یعنی نواب وزیر کے) باپ کا غلام نہیں تھا۔ اب نواب وزیر کو میں یاد آیا اور حسن صاحب کو میرے پاس بھیجا۔ اتفاقاً میں اُس وقت وظیفہ میں تھا وہ میرے خسر نواب فخرالدین خاں سے ملے اور نواب وزیر کا پیام پہونچا کر چلے گئے۔ پیام یہ تھا کہ حضرات اب آپ گھر سے باہر نکلئے اور جو کچھ بن سکے آپ

---

[1] دیکھو دکن ٹائمز مورخہ ۶ ستمبر ۱۸۸۴ء۔

مجھ میں اور حضور پر نور میں صفائی کرانے میں دریغ نہ کیجئے اگر آپ کامیاب ہو گئے تو آپ کے کل متعلقین کے منصب جاری کر دوں گا اور دو تین لاکھ نقد آپ کو دوں گا اور والد نے جو آپ سے جاگیر کا اقرار کیا تھا وہ جب میری صفائی ہو جائے گی تو حضور پُر نور سے سفارش کر کے وعدہ پورا کر دوں گا جب نواب فخر الدین خاں نے یہ پیام مجھ کو پہونچایا تو مبارکباد بھی دی اور کہا کہ یہ موقع ہاتھ سے مت دو اور گھر سے باہر نکل کر کوشش بلیغ کرو۔ میں سن کر چپ ہو رہا۔ سہ پہر کو حسن بن عبداللہ پھر آئے میں نے اُن سے کہا کہ شاہ و وزیر دونوں کا میں ان کے سن طفولیت سے خدمت گزار رہا ہوں لیکن اس مزدیا انعام کا جب لفظ درمیان میں آیا ہی تو میرا یہ جواب ہی کہ میں آقا فروش نہیں ہوں جب تک مجھ کو یہ معلوم نہ ہو کہ حضور پُر نور کس حد تک ناراض ہیں میں خلاف مرضی مبارک آنحضرت کوئی اقرار نہیں کر سکتا۔ اس پر حسن بن عبداللہ نے غصّہ سے جواب دیا کہ آپ بھی مرحوم کی نمک حرامی اور احسان فراموشی پر تلے ہوئے ہیں۔

خلاصہ این کہ ہفتہ عشرہ کے بعد مولوی مہدی علی صاحب میرے پاس آئے اور کہا چل یار اٹھ خدا کا شکر کر کہ نواب وزیر سے صفائی ہو رہی ہے۔ پُرانے قصے سب بھول جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں نے جواب دیا کہ یار من مجھکو میرے حال پر چھوڑ دو۔ دو ہاتھیوں کی ٹکروں میں میں چکنا چور ہو جاؤں گا۔ یہ کہکر کہ اس حماقت کا کیا ٹھکانا کہ ایسا موقع چھوڑتے ہو چلے گئے۔ اس کے بعد سردار عبدالحق میرے پاس آئے میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا مگر وہاں چلنے میں کیا نقصان ہے یہی جواب تم بالمشافہہ دیدو۔ میں نے بھی دل میں خیال کیا کہ اب زیادہ انکار مخالفت پر مبنی سمجھا جائے گا۔ ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس دن بہت بڑا ایٹ ہوم خانہ باغ میں دیا گیا تھا کل عہدہ دار اور علاقہ دار و دیوانی کا

مجمع کثیر تھا۔ نواب وزیر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹہلتے ہوئے الگ لے جاکر مجھ سے کہا کہ بیشک
آپ کی ناراضی میرے ساتھ بجا ہے مگر آپ اس قصہ کو بھول جایئے اور میرا خیال نہ کیجئے بلکہ
والد مرحوم کا خیال کیجئے وہ قصہ بھی مجھکو بیان کرنا ضرور ہے وہو ہذا۔

حضور پرنور بمقام سرور نگر وبائے ہیضہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور عالت نزع تک پہنچ گئی تھی۔
اور سول سرجن نے رزیڈنٹ کو رپورٹ کر دی تھی۔ نواب وزیر نے اس خیال سے کہ پھر حکومت
انتظامی یعنی ریجنسی قائم ہوگی اور نواب امیر کبیر خواہ مخواہ شریک منتظم ہونگے۔ سید حسین صاحب
بلگرامی کو نواب امیر کبیر کی خدمت میں برائے مشورت و کارروائی آئندہ بھیجا۔ میں اس وقت
حضور پرنور کے پاس سے اٹھ کر شامت کا مارا امیر کبیر کے پاس پریشان حال باچشم گریاں و
دل بریاں آیا۔ سید صاحب مجھکو دیکھکر گفتگو ختم کر کے چلے گئے۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا
کہ لائق علی خاں نے سید حسین کو میرے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اور میں مل کر آئندہ
انتظام کی بابت رزیڈنٹ سے تحریک کریں میں نے جواب دیدیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے
ابھی فضل و کرم کی امید رکھنی چاہیئے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ حضور پرنور کو صحت کلی عطا ہوگئی۔
اس وقت اس خیال سے کہ مبادا امیر کبیر یہ حال حضور پرنور سے کہدیں نواب وزیر نے موقع
پاکر عرض کر دیا کہ سرور جنگ اور نواب امیر کبیر نے رزیڈنٹ کے پاس برائے وراثت نواب
ظفر جنگ تحریک کی تھی جب مجھکو اس کا پتا لگا تو میں نے فوراً اصل حال کی عرضی داخل کی
اور نواب امیر کبیر نے رزیڈنٹ کا خط بہ تکذیب تہمت پیش کر دیا۔

آمدم برسر مطلب مولوی مہدی علی اور عبدالحق اور حسن بن عبداللہ بھی وہاں آگئے
آخر کار بشرم حضوری میں نے وعدہ کیا کہ میں ڈیوڑھی مبارک میں جانا شروع کرتا ہوں اور
وہاں کا رنگ دیکھتا ہوں اور یہ بھی عرض کیا کہ مجھکو ہر وقت طلب نہ فرمائیے۔ میں خود حسب موقع

حاضر ہوتا رہوں گا۔ دوسرے روز میں بعد مغرب ڈیوڑھی مبارک میں حاضر ہوا حضور پرنور صحن میں تختوں پر جلوہ افروز تھے اور کل مصاحبین بھی حاضر تھے اور شعر و اشعار کی صحبت گرم تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر طبیعت حاضر ہو تو ایک غزل کہہ ڈالوں اور اس تقریب سے صحبت میں شریک ہو جاؤں چنانچہ طبیعت پر زور ڈال کر شعر لکھتا گیا۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں۔ غزل ے

رہا ہو رشک کعبہ یہ دل اندوہگیں برسوں ۔۔۔ رہی ہو صورت زیبا کسی کی دلنشیں برسوں

یہ اپنے نام کی تاثیر ہے تم سے شکایت کیا ۔۔۔ چڑھی ہو جب سے غصے میں نہ اتری آستیں برسوں

تم آئے چشم ما روشن، تم آئے گھر مرا گلشن ۔۔۔ زرا دو دم ٹھہر جاؤ اگر ممکن نہیں برسوں

بڑا ہی قدرداں شاہِ دکن حاذق چلو جلدی

عبث بیٹھے رہے تم گھر میں مغموم و حزیں برسوں

صحبت دیر تک قائم رہی تقسیم پان کے وقت مجھکو بھی پان عنایت ہوا اور پاندان طلائی میرے آگے خود بدست مبارک کھسکا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا اور گھر چلا آیا۔ خلاصہ اس کہ چند بار کی آمد و رفت میں معلوم ہوا کہ یاروں نے قصہ کو طویل کر دیا اور نواب وزیر کے واسطے بجز میر ریاست علی محبوب یار جنگ کلمۃ الخیر کہنے والا کوئی نہ تھا۔ مرزا محمد علی بیگ افسر جنگ نے کہ عرصہ تک برادرم علی بیگ بنے رہے اب سید صاحب کا پلہ بھاری دیکھ کر رشتۂ برادری سید صاحب سے قائم کر لیا۔

حضور پرنور نام بھی نواب وزیر کا سننا پسند نہ فرماتے تھے میں نے یہ حال نواب وزیر سے عرض کر دیا اور کہا کہ میری تائید میں مرزا محمد علی بیگ افسر جنگ کو اشارہ فرما دیجیے انھوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا کہ یہ حضرت سب سے زیادہ میرے مخالف ہیں حتیٰ کہ اگر

میں کسی کو ان کے پاس بھیجتا ہوں تو اس سے ملتے بھی نہیں اب آپ ہی جو ہو سکے کوشش کیجئے
وہ صفائی قلب تو اب کہاں میسر ہے میں صرف ایک طریق کار (Modus operendi)
قائم کرنا چاہتا ہوں تاکہ ریاست کا کام تو نہ رُکے۔ وہ آپ کا قطعہ مجھکو یاد ہے کہ ؎

جلاؤ جلاؤ لگے آگ اس کو مرا دل ہے صاحب جلانے کے قابل
رُلاؤ رُلاؤ کہیں غرق ہوئیں یہ آنکھیں ہیں میری رُلانے کے قابل

اب سنئے کہ نہ معلوم نواب امیر کبیر اور مہاراجہ کو یہ علم کیوں کر ہوا کہ میں نواب لائق علی خاں کی تائید کر رہا ہوں ان دونوں صاحبوں نے مجھکو سخت پکڑا میں نے بھی اصل واقعات بیان کر دیئے۔ نواب امیر کبیر نے مجھ سے کہا کہ اب صفائی ناممکن ہے۔ سید حسین بلگرامی کی بے ربط خط و کتابت نے مسٹر کارڈری اور فارن آفس کو پورا طرف دار نواب لائق علی خاں کا بنا دیا اور ادھر حضور پر نور کو ضد آگئی ہے۔ تم سے جس قدر جلد ہو سکے اپنے تئیں اس قصہ سے الگ کر لو۔ اگر نواب لائق علی خاں مجھ سے مشورہ لیتے تو میں یہ رائے دیتا کہ تم ہندوستانیوں کو اپنے اپنے گھر روانہ کرو خود بخود صفائی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ بہت خوب کیا میں بھی ایسا گنہگار ہوں کہ ان کے ساتھ شریک کیا جاؤں۔ یہ سن کر نواب صاحب ہنس پڑے اور فرمایا کہ بہر حال تم اس معاملہ سے الگ ہو جاؤ۔ اب مجھ کو بھی اپنا اندیشہ پیدا ہوا[1] اور میں نے مولوی مہدی علی میر نواز جنگ اور عبد الحق

---

[1] یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ اس زمانہ میں سید حسین خاں مؤتمن جنگ بہادر نے ایک حکم بنام نواب وزیر صادر فرمایا کہ۔ سرور جنگ کو انعام دے کر ان کے وطن رخصت کر دیا جائے۔ چوں کہ نواب وزیر سے یہ مشورہ ہو چکا تھا اس واسطے بلا اطلاع اعلیٰ حضرت اس کارروائی کی جرأت کی گئی۔ میں فوراً قلعہ گولکنڈہ بدر خواست باریابی

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

سردار دلیر جنگ سے مشورہ کیا۔ مولوی مہدی علی نے کہا کہ خورشید جاہ تو ہمارے دشمن ہیں وہ تم کو ڈرا رہے ہیں مگر سید عبد الحق نے مجھ سے کہا کہ نواب امیر کبیر سچ فرماتے ہیں گورنمنٹ آف انڈیا پوری طرف دار سالار جنگ کی ہے۔ ابھی ایک نہایت سخت اور گستاخانہ خط مسٹر کاڈری نے حضور پرنور کو لکھا ہے بہتر ہے کہ تم الگ ہو جاؤ۔ میں اس فکر میں تھا کہ کیا راستہ اختیار کروں کہ ایک دن سید میر شاگرد پیشہ نواب امیر کا میرے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے اور فوراً بلایا ہے۔ میں اسی وقت اس کے ساتھ ہولیا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ حضور پرنور نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور حکم ہے کہ تم ان کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ میں نے صاف انکار کردیا کہ آپ کے ساتھ میری باریابی نہایت نقصان دہ اور خلاف مصلحت ہے۔ حضور پرنور مجھکو براہ راست یاد فرمالیں۔ نواب صاحب کو بھی میری رائے پسند آئی اور فرمایا بہتر ہے میں پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔ چنانچہ تین چار روز بعد سید میر اپنے ساتھ ایک پالکی لایا اور کہا دروازہ بند آپ لنگم پلی کے باغ میں چلئے اور زنانہ محل سرا میں اتریئے تاکہ آپ کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں حیرت زدہ اس کے ساتھ ہولیا۔ مکان خالی تھا صرف نواب ظفر جنگ بہادر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ حضور پرنور خود تنہا تشریف لاتے ہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) پہونچا اور تا برآمدی حضور پرنور افسر جنگ و محبوب یار جنگ کی نشستگاہ میں منتظر باریابی رہا۔ یہ دونوں بزرگوار سید صاحب سے ناراض ہوچکے تھے اس واسطے کہ سید صاحب ان کے فوائد میں بوجہ اپنی ایمانداری کے حارج ہونے لگے تھے پس دونوں صاحبوں نے متفق اللسان ہوکر کہا کہ آپ بھی خوب ان کی خبر لیجئے۔ اس کمرہ میں اتفاقاً افسر جنگ کا بڑا لڑکا کہ بہت کم سن تھا آگیا۔ میں نے اس سے انگریزی میں باتیں کیں اس نے فرفر بلا تکلف جواب دیئے۔ مجھکو بہت تعجب ہوا اور ایک گھڑی سنہری اس کو انعام دی خلاصہ اینکہ حضور پرنور برآمد ہوئے اور میری حکایت سن کر بہت تعجب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آپ خاطر جمع رکھئے کون آپ کو مجھ سے جدا کرسکتا ہے اور میں تو اس گروہ سے مع لائق علی خاں بیزار ہوگیا ہوں ۱۲

اور منظور اقدس یہ ہے کہ اس ملاقات کا حال کسی کو معلوم نہ ہونا چاہیئے۔ اس عرصہ میں نواب امیر کبیر بہادر بھی تشریف لے آئے۔ میں نے وہیں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا پڑھی اور شام کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ قریب ایک بجے شب کے حضور پر نور تنہا کالے یابو کی اکّا گاڑی میں سوار صرف ایک سائیس ساتھ اور پٹھو خاں اردلی میں تھا تشریف لائے اور نذریں قبول فرما کر کرسی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ہم سب بھی گرد میز کے بیٹھ گئے حضور پر نور نے میری طرف خطاب فرمایا کہ حضرت آپ کو علم ہو گا جن مشکلوں میں میں گرفتار ہو گیا ہوں اور پھر جب نواب امیر کبیر کے ذریعے سے میں نے آپ کو طلب کیا۔ آپ نے آنے سے انکار کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے حضور نے اپنے خاص دامن گرفتہ میں داخل فرمایا ہے تو پھر کسی کی ذریعے سے فدوی کو طلب فرمانے کی ضرورت نہ تھی۔ براہ راست طلب فرما لیا جاتا۔ اور پھر میں نے ذوق کا یہ شعر پڑھا ؎

ہم سا جانباز جہاں میں نہ ملے گا تم کو
گرچہ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر

یہ سن کر تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ "اچھا میں خود آپ کے پاس آگیا"۔ میں نے عرض کیا کہ مجھکو کچھ زیادہ معلوم نہیں صرف عبدالحق کی زبانی یہ سنا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا پوری طرف دار سالار جنگ کی ہو گئی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گورنمنٹ کو ہمارے خانگی انتظام میں کیا مداخلت کا حق ہے۔ اس پر امیر کبیر نے کہا کہ گورنمنٹ نے حضرت مغفرت مکان افضل الدولہ کے وقت میں بھی اسی طرح دخل دیا تھا۔ میں نے کہا وہ بھی سوئے تدبیر اہل شوریٰ کا نتیجہ ہو گا۔ میں دو تین بار نواب لائق علی خاں سے ملا وہ خود ترسیدہ اور ہراساں ہیں اور سید حسین صاحب وغیرہ پر الزام رکھتے ہیں کہ ان کے

اغوا سے حضور پر نور ناراض ہیں ورنہ بذات مبارک خود مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ اس پر امیر کبیر بہادر نے کہا کہ میں تو پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب تک یہ ہندوستانی پردیسی خود غرض خود مطلبی نہ نکالے جائیں گے ہم کو ہر طرح کی تکلیف رہے گی۔ مگر حضور پر نور نے فرمایا یہ سب غلط ہے۔ اب سُنئے کہ لائق علی خاں نے میرے ساتھ کیا رفتار رکھی کہ بے میری اطلاع و استمزاج اہم امور میں بھی جو چاہا کرتے رہے۔ میں کھڑا ہوا ہوں وہ کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میرے روبرو بے تکلف سگرٹ نکال کر دھوئیں اُڑانے لگے۔ دعوت پارٹی میں باوجود قطعی احکام جو لباس دل چاہا پہن کر حاضر ہوئے۔ اپنے مصاحبوں کو بلا اجازت اپنے ساتھ لاتے رہے اور ہمیشہ میری طرف پیٹھ موڑ کر دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ مجھکو تو اس نے اپنا ہم مرتبہ بھی نہ سمجھا بلکہ کم مرتبہ سمجھتا رہا۔ میں نے عرض کیا کہ تعجب ہے کہ حضور پر نور آقائے ولی نعمت کے ساتھ بھی اُن کا غنڈاپن نہ گیا یہی شکایت ان کے والد مرحوم کو بھی ان سے تھی۔ چنانچہ ایک روز خود وزارت پناہ مرحوم نے مجھ سے ذکر فرمایا کہ وہ کہیں دعوت یا ہوا خوری کے واسطے جا رہے تھے۔ صاحبزادوں کو بھی حکم دیا کہ کپڑے پہن کر خانہ باغ میں حاضر رہیں۔ لیکن جب وزارت پناہ کپڑے وغیرہ پہن کر نیچے اُترے تو یہ حضرت موجود نہ تھے اور بڑی دیر بعد حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے جب اس گستاخی پر ناراضی ظاہر فرمائی تو انھوں نے جواب دیا کہ بابا آپ کے مزاج میں جلدی بہت ہے۔ یہ حکایت سن کر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "یہ آپ کی تعلیم کا نتیجہ ہے"۔ پھر حضور پر نور نے ارشاد فرمایا کہ اب آپ کیا کہتے ہیں؟ میں نے پھر وہی شعر عرض کیا ؎

ہم سا جانباز جہاں میں نہ ملے گا تم کو
گرچہ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر

فدوی سرفروشی کے واسطے موجود ہے اور اس وقت مجھکو ایک خواب یاد آیا جو میں نے بہت عرصہ ہوا دیکھا تھا یعنی میں نے یہ دیکھا کہ گویا حضرت مغفرت مکان افضل الدولہ ایک پلنگ پر دراز ہیں اور ایک بی بی زیور و جواہر سے آراستہ پلنگ کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں اور نواب خورشید جاہ ان کے سرہانے اور نواب ظفر جنگ ان کی پائینتی کھڑے ہوئے ہیں مجھکو پلنگ کے پاس بلاکر فرمایا کہ میرا فرزند تو پریشان حال اور تم گھر میں بیٹھے ہو یہ خواب بھی میں نے عرض کیا اور پھر یہ شعر بھی میں نے سنایا ؎

کیا تاب کسی کی جو مرے دل کو سنبھالے
آخر تری آنکھوں کے ہیں ہم دیکھنے والے

حضور خاطر جمع فرمائیں صرف سوء تدبیر کا نتیجہ ہے۔ کاڈری صاحب ایک بھلے مانس آدمی ہیں اصل واقعات جب ان کو معلوم ہونگے تو دوسری شطرنج انشاء اللہ تعالیٰ بچھ جائے گی۔ حضور پرنور یہ فرماکر کھڑے ہوگئے کہ اچھا آپ کل میرے پاس آئیے میں کل تحریریں آپکو دکھاؤنگا۔ اس کے بعد صحبت برخاست ہوئی اور ہم اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

دوسرے دن قریب دوپہر میں درِ دولت فلک رفعت شاہی پر حاضر ہوا۔ حضور پرنور میری اطلاع ہوتے ہی زنانہ سے برآمد ہوئے اور اپنے کمرۂ آفس میں جاکر مجھکو یاد فرمایا اور صندوقچہ منگواکر کل تحریریں میرے سامنے رکھدیں۔ میں نے جو غور سے حضور پرنور کے عنایت نامجات کو جو سید صاحب نے بنام رزیڈنٹ لکھے تھے پڑھا تو مجھ پر یہ اثر ہوا کہ گویا کوئی اہل غرض کسی مقتدر شخص سے عنایت اور مہربانی کا خواستگار ہوکر اپنی غرض نکالا چاہتا ہے ان تحریرات کا اثر رزیڈنٹ پر بھی یہی ہوا ہوگا کہ حضور پرنور بذات مبارک ناراض نہیں ہیں چند روز میں صفائی ہوجائے گی۔ مگر کاڈری صاحب کا خط نہایت بدتہذیبی کا تھا جس کا خلاصہ

یہ تھا کہ آپ کا گدّی سے اُترنا آسان ہے، لائق علی خاں کی معزولی ناممکن ہے۔ حضور پر نور نے چشم پُر آب ہو کر فرمایا کہ اس کے بعد اب زندگی بے مزہ ہے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور ناحق رنج فرماتے ہیں، کاڈری صاحب کس کھیت کی مولی ہیں، خود وائسرائے آپ کا ہمسر اور ہم مرتبہ نہیں ہے۔ آپ آج ہندوستان میں نہ فقط اہل اسلام کے امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین کا مرتبہ رکھتے ہیں بلکہ ہنود بھی آپ کو مہاراجہ بالاستحقاق سمجھتے ہیں۔ اب تک راجگانِ ہند کی طرف سے خریطے اور تیل وشکر آپ کے پاس داخل ہوتے ہیں اور ان کے پورے[ل] اورنگ آباد میں موجود ہیں۔ علاوہ اس کے آپ کی ریاست گورنمنٹ آف انڈیا سے پرانی ہے۔ مثل میسور یا کشمیر کے نہیں ہے کہ دام دے کر مول لی ہے۔ یا کھیت[ٹ] میں سے پکڑ کر آپ کو بٹھا دیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آج سلطنتِ برطانیہ کی قوّت وشوکت وشان بہت زیادہ ہے۔ مگر اس کو باولے کتے نے نہیں کاٹا کہ ایک ملازم کی خاطر سے ایک رئیسِ ذی جاہ کو گدّی سے اُتار دے۔ یہ فقط کاڈری صاحب کی گیدڑ بھپکی ہے۔ برٹش گورنمنٹ تو آپ کے احسان کی وجہ سے سر نہیں اُٹھا سکتی۔

[ل] مغل بادشاہوں کے دربار کا دستور بلحاظِ مصلحتِ سیاسی یہ تھا کہ تمام رؤسائے ہندوستان اپنے اوقات مقررہ پر اور اکثر تو ہمیشہ بادشاہ کے ہمرکاب رہا کرتے تھے چنانچہ یہ لوگ اورنگ آباد میں حضرت عالمگیر کے ہمراہ تھے اور بادشاہ نے ان کو شہر اور کیمپ شاہی کے اطراف میں مقامات بغرض سکونت عطا فرمائے تھے۔ یہ مقامات پوروں کے نام سے مشہور اور اس وقت تک موجود ہیں اور بعض رؤساء نے بطور یادگار ان پوروں پر اب تک اپنا اپنا قبضہ قائم رکھا ہے۔ اورنگ آباد میں چوّن[۵۴] پورے تھے۔ اورنگ پورہ اور بیگم پورہ یہ دونوں تو آباد ہیں اور پورے اکثر ویران ہو گئے یا ویران ہوتے جاتے ہیں۔ سیکرن پورہ اور پہاڑ سنگھ پورہ راجہ بنڈیل کھنڈ کو پدم پورہ اور کرن پورہ راجہ بیکانیر کو اور جے سنگھ پورہ راجہ جے پور کو عنایت ہوئے تھے۔ اسی طرح جسونت پورہ قطب پورہ بلوچ پورہ۔ کریم پورہ۔ پادنی پورہ دیگر امراء دربار کو عنایت ہوئے۔ مولوی بشیر احمد دہلوی سابق ملازم سرکار نظام نے اپنی تاریخ بیجاپور کے حصّۂ سوم صفحہ ۵۳ پر ان پوروں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ۱۲

[ٹ] یعنی مہاراجہ بڑودہ ۱۲

اگر میر صادق عیاری نہ کرتے تو ٹیپو سلطان تمام جنوبی ہند کا سلطان ہوتا۔ اگر آسی[1] کی لڑائی میں حضور کی فوج نہ جاتی تو تمام قوم مرہٹہ تمام بالاگھاٹ و پائیں گھاٹ تا بہ وسط ہند ڈنکا لمن الملک کا بجاتی۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء میں کل ریاستہائے ہند کیا مرہٹہ اور کیا راجپوت حیدرآباد کو دیکھ رہے تھے ذرا بھی ناصر الدولہ جنت مکان قدم آگے بڑھاتے تو انگریزوں کا اقلیم ہند میں پتا بھی نہ لگتا۔ برٹش گورنمنٹ کو ان کے انتقال کے بعد آپ کے وزیر با تدبیر جاں باز و سر نثار خیر خواہ نمک حلال دور اندیش فلاطون فطرت نے عین جاں کنی کی حالت میں شربت حیات پلایا۔ گو ان احسانات کو صاحبان انگریز بھول گئے اور زبانی شکریئے ادا کرکے گول ہو گئے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہو سکتا کہ ایک نوکر کے واسطے آقا کو سزا دے بیٹھیں۔ لاحول ولا قوۃ حضور کیوں رنج فرماتے ہیں۔ جواب ترکی بہ ترکی دیدیجئے اور اس قصہ کو ختم کر دیجئے۔ اگر حکم ہو تو فدوی اس کا جواب تحریر کرتا ہے۔ اس پر دستخط فرما دیجئے۔ میری اس تمام گفتگو[2] سے حضور پرنور کا چہرہ بشاش ہو گیا اور فرمایا لکھئے آپ کیا لکھتے ہیں۔ میں نے قلم برداشتہ چند سطور لکھ کر پیش کیں جس کا خلاصہ یہ تھا کہ گو آپ کا خط اس قابل نہ تھا کہ اس کا جواب دیا جائے مگر چونکہ معاملہ اہم ہے لہذا میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں لائق علی خاں کے ساتھ ایک دن بھی کام نہیں کر سکتا۔ لہذا میں نے ان کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ پر جس کو میں مقرر کروں گا آپ کو بہت جلد اطلاع دوں گا تاکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کو مطلع کر دیں۔ حضور پرنور کچھ دیر تک خط کو غور سے ملاحظہ فرماتے رہے بالآخر میرے اصرار پر قلم اٹھا کر دستخط فرما دیئے۔ اور فرمایا ؎

---

[1] یہ مقام جنگ آسی رجنبہ کے قریب نواب قطب علی خاں جاگیردار دہاوڑہ کی جاگیر میں واقع ہے۔ قطب علی خاں سے ذوالقدر جنگ کی منجھلی بیٹی بیاہی ہے ۱۲

[2] یہ صحبت و گفتگو قلعہ گولکنڈہ میں ہوئی ۱۲

ما کارہائے خود بخداوند کارساز

بسپردہ ایم تا کرمِ او چہا کند

"ٹھیک ہے ان گستاخیوں کا سدِّباب ہونا چاہیئے" یہ فرما کر خط میرے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ آپ خود یہ خط مسٹر کاڈری کو دیجئے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی مثل ہے کہ جو بولے وہی گھی کو جائے مگر جرأت کر کے عرض کیا کہ کیا حرج ہے اگر افسر جنگ یہ خط لے جائیں جن بجمن ہو کر فرمایا بس اب ان سب کو الگ رکھئے ہم ان کو آزما چکے ہیں۔ میں وہ خط لے کر سیدھا امیر کبیر بہادر کے پاس گیا اور کل حال بیان کر دیا وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا مرحبا ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مگر اب لائق علی خاں کو کیا جواب دو گے۔ میں نے عرض کیا بخدائے لایزال میں نے ان کی مخالفت سے یہ کام نہیں کیا۔ یہ فرض تو ہر مسلمان اور ہندو نمک خوار کا ہے کہ حضورِ پر نور کے آداب شاہی کا خیال رکھے۔ مسٹر کاڈری کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ ایک رئیسِ اعظم سے بہ گستاخی پیش آئیں۔ لائق علی خاں سے اس کے بعد بھی صفائی ممکن ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا:- "دوسرا شخص لائق علی خاں کی جگہ پر کون ہوگا" میں نے عرض کیا کہ جس کو حضورِ پر نور پسند فرمائیں۔ اس پر ظفر جنگ نے کہا کہ اب ہماری باری ہے۔ آپ ضرور کوشش کریں۔ میں وہاں سے سیدھا رزیڈنسی گیا۔ مسٹر کاڈری مجھ پر بہت مہربان تھے بلکہ اپنی تصنیف ترجمۂ ہومر کی ایک جلد دستخط کر کے مجھ کو دی تھی اور ملاقات میں اکثر علمی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس خط کو پڑھتے ہی وہ تو آگ بگولا ہو گئے اور کہا سرور جنگ! یہ تمھاری تحریر ہے میں نے کہا تحریر تو میری ہے مضمون خود ہز ہائنس کا ہے۔ کہا تم جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ میں نے کہا۔ میں ایک ادنیٰ ملازم ہوں نتیجہ سے مجھے کیا غرض میرا کام تعمیل حکم ہے۔ اس پر وہ بولے میں

نہیں چاہتا کہ مجھ میں اور ہز ہائنس میں تیسرا شخص دخیل ہو۔ میں خود بالمشافہ ہز ہائنس کو جواب دے دوں گا۔ ہز ہائنس کو یہ خط واپس لینا ہوگا۔ میں خاموش وہاں سے اُٹھ کر اوالیر کبیر کے پاس گیا اور وہاں سے درِ دولتِ شاہی پر حاضر ہوا۔ حضورِ پرنور گویا میرے منتظر تھے میں نے کل کیفیت عرض کر دی۔ فرمایا اب کیا کیا جائے میں نے عرض کیا کہ یہ سب گلہری کا غصہ ہے کہ درخت پر چڑھ کر بلّی پر چرپ چرپ کرتی ہے اگر وہ خط پھیرے تو آپ صاف جواب دیدیجئے کہ یہ خانگی خط نہیں ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری جو تحریر آپ کے پاس جاتی ہے وہ وائسرائے کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ میں نے معزولی کی اطلاع دیدی جدید تقرر کی اطلاع بھی بہت جلد دے دوں گا۔ اس وقت تک البتہ کوئی ردوبدل نہ کروں گا۔ کاڈری صاحب آئے اور شکست خوردہ چلے گئے۔ صدر صوبہ دارِ اقلیمِ ہند لارڈ ڈفرن تھے اُنھوں نے فوراً جواب بھیجا کہ میں خود حیدرآباد آتا ہوں میں ممنون ہوں گا اگر اس وقت تک یور ہائنس کوئی قدم آگے نہ بڑھائیں۔ مسٹر کاڈری تو برائے چند ماہ رخصت لے کر عزت بچا لے گئے۔ ان کی جگہ منصرمانہ قائم مقام کرنل راس[1] بھیجے گئے۔ یہ بزرگوار سپاہی آدمی بھولے بھالے سیدھے سادے آدمی بہت جلد نواب وزیر کے طرف داروں کے پھندے میں پھنس گئے اور حضورِ پرنور کو خوب ڈرایا کہ وائسرائے سے لے کر وزیرِ ہند یعنی سکرٹری آف اسٹیٹ اور دونوں طبقات وسلطنت برطانیہ یعنی ہاؤ زآف پارلیمنٹ بلکہ خود ملکہ معظمہ اس قدر مدّاح و ممنون ہز ایکسی لنسی سر سالار جنگ مرحوم کے ہیں کہ ہرگز ان کے فرزند بلکہ کل خاندان کے نقصان کو گوارا نہ کریں گے اور یہ بھی کہا کہ آپ کے مشیر آپ کے بدخواہ ہیں جو نشتر سے لڑواتے ہیں۔ اس کا اثر حضورِ پرنور کی ذات مبارک پر ایسا پڑا کہ کمال درجہ خوف زدہ اور پریشان ہو گئے اور پھر راقم کو یاد فرما کر بچشم پُر آب فرمایا کہ

---

[1] کرنل راس ۱۳ اپریل ۱۸۸۶ء لغایتہ اکتوبر ۱۸۸۶ء رزیڈنٹ رہے ۱۲

اب کیا کیا جائے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر حضور پر نور متاثر ہو کر نواب لائق علی خاں سے صلح کریں گے تو تمھاری شامت آجائے گی۔ بہتر ہے کہ تم بھی صلح کی رائے دو۔ لہذا میں نے عرض کیا کہ کرنل جو کچھ کہتے ہیں سچ کہتے ہیں اگر حضور ارشاد فرمائیں تو میں لائق علی خاں کو لا کر قدموں پر گروا دوں۔ ارشاد فرمایا کہ میرا اس کا ملاپ ناممکن ہے بہتر ہے کہ میں ریاست سے دست بردار ہو جاؤں۔ یہ سن کر میری بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور عرض کیا کہ اگر ان کو معزول ہی کرنا منظور اقدس ہے تو یہ امر بھی مشکل نہیں ہے صرف حضور کا استقلال چاہیئے فدوی سرفروشی کو حاضر ہے ؎

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

پہلے فدوی کرنل راس سے مل کر ان کی کاروائی کا اندازہ کرلے اس کے بعد فدوی کوئی رائے قائم کرے گا۔ فرمایا کب جاؤ گے میں نے عرض کیا ابھی۔ اگر سرکاری گاڑی عنایت ہوئے اور ایک چوبدار بھی ساتھ کیا جائے تو ابھی جاتا ہوں۔ خلاصہ ایں کہ اس شان و شوکت کے ساتھ میں بلارم پہونچا وہ چائے خوری پر تھے مجھ کو بھی چائے میں شریک کرلیا اور چند سوالات میری نسبت کئے۔ میں نے کہا کہ میں حضور پر نور کا استاد ہوں اور میرے ہی ہاتھ پر درس ختم ہوا۔ مجھکو کوئی خاص خدمت انتظام ریاست میں نہیں ملی ہے صرف در دولت پر حاضر رہتا ہوں اور جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ پھر پوچھا کہ آپ میرے پاس کسی کام کو آئے ہیں میں نے کہا صرف بغرض ملاقات۔ چند منٹ خاموش رہ کر بولے کہ بہت اچھا ہوا آپ مجھ سے ملنے آئے ہز ہائنس اور منسٹر میں نااتفاقی کس بات پر ہوئی۔ میں نے کہا کہ پہلے یہ بتایئے کہ کیا یورپ میں شاہ و وزیر کی نااتفاقی نہیں ہوا کرتی۔ یہ سن کر ہنس پڑے اور کہا کہ آپ یورپ کی تاریخیں

پڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا ہر ملک اور سلطنت میں ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں شخصی سلطنت میں بادشاہ آقا اور وزیر ملازم ہے دل چاہا ملازم کو رکھا دل چاہا موقوف کر دیا۔ پوچھا کیا بے قصور بھی۔ میں نے جواب دیا کہ آپ اپنے چپراسی کی ضرورت نہیں دیکھتے یا اپنے کام کا نہیں پاتے تو موقوف کر دیتے ہیں۔ نوکر کی نوکری آقا کی مرضی پر ہے۔ پھر پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مخالفت کب سے اور کس وجہ سے شروع ہوئی۔ میں نے کہا کہ میرا قیاس مرتبۂ یقین یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ ہز ہائنس کی محبت اپنے وزیر کے ساتھ مرتبۂ عشق پر تھی منسٹر سے ایک مذہبی غلطی ہو گئی۔ منسٹر کا مذہب شیعہ ہے پس باغوائے چند فیناٹکس یعنی اہل جوش مذہبی منسٹر نے حضرات شیعہ کو بلدہ میں ضریح مع اس کے لوازمات و رسوم کے نکالنے کی اجازت دیدی اس پر اہل بلدہ میں بھی جوش پیدا ہو گیا اور نواب[1] امیر کبیر نے پگڑی اُتار کر ایک رومال سر سے باندھ لیا اور رزیڈنٹ اور ہز ہائنس کو لکھ بھیجا کہ اگر ضریح بلدہ میں نکلی تو خون کی ندیاں بہ جائیں گی اور سب سے پہلے میں جام شہادت پینے کو موجود ہوں۔ اس وقت سے رفتہ رفتہ شاہ و وزیر میں محبت مبدّل بہ نفرت ہوتی گئی۔ یہ سن کر کرنیل صاحب کے کان کھڑے ہوئے اور کہا میں ایران میں بہت رہا ہوں مجھ کو سُنّی شیعہ کی مخالفت معلوم ہے مگر میں نے یہ سُنا ہے کہ ہز ہائنس کا پرائیوٹ سکرٹری یعنی سید حسین بلگرامی باعث اس نااتفاقی کا ہے ورنہ ہز ہائنس بذات خود منسٹر سے راضی ہیں اور ہز ہائنس کی صحبت کے لوگ بھی اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بعد دو تین معمولی باتیں ہوئیں اور اُٹھ کھڑے ہوئے ہاتھ ملا کر کہا میں بہت خوش ہوا آپ سے ملاقات کر کے۔ میں نے کہا کہ میں صاحبان رزیڈنٹ سے ہمیشہ ملتا رہتا ہوں کہا ہاں آپ کا نام میں نے کتاب میں دیکھا آپ تو ایرانی ہیں۔ وہاں سے اُٹھ کر میں سیدھا در دولت شاہی پر حاضر ہوا اور کل حالات عرض کر دیئے ضریح کی حکایت

---

[1] نواب امیر کبیر سر خورشید جاہ ۱۲

سن کر حضورِ پرنور ہنس پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کرنیل صاحب کو بہت دور پھینک آیا ہوں
اب وہ زور شور ان کا نہ رہے گا۔ فدوی کی رائے یہ ہے کہ اب حضور نواب امیر کبیر کو بیچ میں ڈالیں
گفتگو کی وقعت انسان کے مرتبہ کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ علاوہ ان کے سید حسین صاحب سا ادیب
منشی اور افسر جنگ جیسا ہوشیار آدمی اور انگریزی فوج کا ملازم بھی حضور کے پاس موجود ہیں
اور فدوی عبدالحق کو بھی ہموار کر لیتا ہے۔ نہایت ایمان دار اور از حد خوش فکر آدمی ہے اور
فدوی کی تو شب و روز یہ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضور کو فتح کامل عطا فرمائے۔ اب وائسرائے
کے آنے پر کل امور منحصر ہیں۔ حضورِ پرنور نے فرمایا یہ سب سچ ہے مگر میں آپ کو نہ بیٹھنے دوں گا
اب بتاؤ کیا راستہ اختیار کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ امر غور طلب ہے پھر عرض کروں گا مگر ایک
امر تو فدوی باصرار عرض کرنے پر مجبور رہے یعنی کام ریاست کا نہ رکنے پائے نواب وزیر کے
وقتاً فوقتاً معروضات کا جواب عطا ہوتا رہے ورنہ الزام بندگانِ عالی کی طرف عائد ہو جائے گا۔
فدوی نہیں چاہتا کہ اہلکارانِ ریاست کے خلاف کوئی بات عرض کرے مگر اب وقت آگیا ہے کہ
اصل حالات حضور سے عرض کر دے تاکہ بندگانِ اقدس سے کوئی غلطی نہ ہو۔ سر اسٹیورٹ بیلی جب
آئے تھے تو انھوں نے یہ پالسی اختیار کی تھی کہ لائق علی خاں مستحق وزارت ہیں مگر چندے مہاراج
پیشکار کی شاگردی میں کار ریاست سیکھیں یہ امر اہلکارانِ ریاست کو ناگوار تھا اس واسطے کہ
نہ یہ لوگ مہاراج سے واقف تھے اور نہ مہاراج ان لوگوں سے واقف تھے یہ سب لوگ
لائق علی خاں کے گرد جمع ہو گئے اور انتظام ریاست میں خلل کامل پیدا کر دیا اور جس ذلت سے
بڑے میاں معزول ہوئے وہ بندگانِ عالی کو معلوم ہے اس کے بعد ان حضرات کو جرأت زیادہ
ہوئی اور رزیڈنٹ سے لے کر فارن آفس تک کو یہ یقین دلا دیا کہ شاہ و وزیر دونوں کم سن
اور ناتجربہ کار ہیں اور ہم وہ لوگ ہیں کہ خود وزارت پناہ مرحوم ہمارے شوریٰ اور مدد کے

محتاج تھے پس رزیڈنٹ اور فارن آفس میں اب یہ پالسی قائم ہوگئی کہ شاہ و وزیر ساقط الاعتبار
اور اہلکاران ریاست ذمہ دار امن و امان رہیں۔اس پر حضور پرنور نے فرمایا کہ اچھا اب میں
سمجھا کہ یہ لوگ اب پھر لائق علی خاں کے گرد جمع ہوئے ہیں کہ اپنا بچاؤ اس کے وجود پر منحصر
سمجھتے ہیں آپ ضرور عبدالحق اور مہدی علی کو سمجھا دیئے کہ وہ میرے نوکر ہیں۔لائق علی یا اس کے
باپ کے نوکر نہیں ہیں بلکہ خورشید جاہ ان کو بلا کر فہمائش کریں۔

ذاتی احوال متعلقہ

اب کچھ حال میں اپنا بھی تحریر کرتا ہوں مسٹر کاڈری کو جب خط کا جواب دیا گیا ایک
قیامت در دولت اور وزارت میں برپا ہوگئی۔مولوی مہدی علی نے آکر کہا کہ "یاران چوری
اور پیران دغابازی" یہ تم نے کیا کیا کہ قصہ کو طول دے دیا لیکن اس میں تم خود منھ
کی کھاؤ گے۔بہتر ہے کہ تم پھر گھر میں گھس جاؤ ہم اور سید حسین سمجھ لیں گے۔حسن بن عبداللہ تو آستینیں
چڑھائے ہوئے آئے اور کہا تم تو سید حسین سے زیادہ نمک حرام نکلے۔یاد رکھو کہ ہمارا بال بھی بیکا
نہ ہوگا۔عماد السلطنت کا معزول ہونا ہنسی کھیل نہیں ہے تم نے اپنے حق میں کانٹے بو لئے۔اور
اب ان حضرات یعنی اہلکاران ریاست کے حملے مجھ پر شروع ہوگئے۔بلکہ رائے قرار پائی کہ
ان کو کسی جرم میں گرفتار کر کے ظفر گڈھ میں قید کر دیا جائے۔کرنل راس کی نگاہ میں بھی مجھکو
حقیر کرنے کی کمال درجہ کوشش کی گئی چنانچہ کرنل صاحب نے ایک بار باریابی میں حضور پرنور سے
عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ سرور جنگ کی رائے پر کاربند ہیں وہ مجھ سے ملنے کو آئے تھے
میں نے ان کو خیر خواہ ریاست کا نہیں پایا۔اس پر حضور پرنور نے ارشاد فرمایا کہ " وہ میرے
بچپن سے استاد رہے ہیں اور اس وقت تو سوائے اُن کے مجھکو کسی پر بھروسا نہیں ہے

لہذا آپ بھی ان پر پورا اعتبار کیجئے۔ میں ان کو پھر آپ کے پاس بھیجتا ہوں "۔ چنانچہ حسب الحکم
میں پھر ان کے پاس گیا۔ بڑی عنایت سے پیش آئے اور مجھ سے کہا کہ اب مجھکو معلوم ہوا کہ
اگر تم چاہو تو یہ سب جھگڑے دب سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مجھکو طریقہ دبانے کا بتایئے میں
موجود ہوں۔ انھوں نے کہا کہ سر سالار جنگ ایک بڑا شخص تھا اور تمام برٹش نیشن
(British nation) انگریز قوم اس کی ممنون ہے۔ میں نے کہا کہ میں اُن کا خود دست گرفتہ
اور ان کی ناموری کا عظمت کرنے والا ہوں اور لائق علی خاں خود میرے شاگرد ہیں اور
مجھ پر ہر قسم کا حق رکھتے ہیں۔ مگر مجھکو وہ راستہ بتایئے جس میں آپ کو کامیابی ہو۔ انھوں نے
کہا کہ تم ہز ہائنس کو خوب سمجھا دو کہ جہاں تک ہم سے ممکن ہے منسٹر کی ہمدردی کریں گے اور
معزول نہ ہونے دیں گے۔ لہذا وہ منسٹر کا قصور معاف فرما دیں اور جو شرائط وہ چاہیں ان
ان سے لکھوا دیتا ہوں۔ ہم احسان فراموش نہیں ہیں کہ اپنے محسن کے فرزند کو بے عزتی اور
اُن کے گھر کو بربادی سے نہ بچائیں۔ میں نے کہا کہ کرنل صاحب میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں
سر سالار جنگ کیا بذات خود رئیس اور مالک ریاست تھے اگر حضرت مغفرت منزل افضل الدولہ اپنے
وزیر کی پالیسی ناپسند فرماتے اور ان کو روک دیتے تو کیا سالار جنگ کوئی کام کر سکتے تھے!
یہ نئی بات ہو کہ اپنے "یار وفادار" کو جس کے حکم سے سب کچھ ہوا چھوڑ کر محکوم اور ملازم وزیر کا
احسان مانا جائے۔ اس پر کرنل صاحب نے کہا کہ تمھاری دلیلیں بے کار ہیں میں تو چند روز کے
واسطے آیا ہوں یہ معاملہ مسٹر کاڈری بھگتیں گے۔ معلوم ہو گیا کہ تم اس فساد کو نہ مٹنے دو گے
بلکہ اس آگ کو بھڑکاؤ گے۔ میں نے کہا کہ اب میں بھی آپ سے صاف کہتا ہوں کہ جو حضرات ذمہ دار
امن و امان کئے گئے ہیں وہ باعث اس فساد کے ہوئے ہیں اور مجھکو تو اب حضور پر نور نے
یاد فرمایا ہے میں اپنے علم و یقین سے کہتا ہوں کہ ہز ہائنس نے مصمم ارادہ تبدیل وزارت کا

کرلیا ہے اور جس قدر ان پر زور ڈالا جائے گا اسی قدر ان کو ضد بڑھتی جائے گی وہ صرف
وائسرائے کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی طرح کی تھوڑی دیر اور گفتگو رہی پھر میں رخصت
ہوکر چلا آیا۔ اب معلوم ہو گیا کہ اہلکاران ریاست نے میری مخالفت پر کمر ہمت مضبوط باندھ لی
اور ان کو عمدہ موقع بھی مل گیا کہ ایک شب میرے کوچوان نیکٹی نامی نے شراب پی اور
اس کے نشہ میں وہ میرے بچوں کے بابو پر سوار ہو کر اسے سرور نگر دوڑاتا ہوا گیا اور ایسا
گرا کہ سر اس کا شق ہو گیا۔ میرا خدمتگار امیر نامی بابو اور کوچوان دونوں کو لے آیا باہر دروازہ
پر امیر کی اور کوچوان کی جورو کی لڑائی ہوئی۔ خلاصہ این کہ اس کی جورو اس کو ڈاکٹر
جانسن[۱] ایک دیسی عیسائی کے پاس جو کوتوالی کے شفاخانہ کا ڈاکٹر تھا لے گئی اور وہ وہاں
مرگیا۔ میں صبح کی نماز پڑھ رہا تھا کہ حکیم سید علی[۲] جن کو میں نے نوکر رکھا دیا تھا۔ میرے پاس آئے
اور کہا کہ آپ کس خواب غفلت میں ہیں کوتوال اکبر جنگ آپ پر کوچوان کے خون کا مقدمہ قائم
کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کوتوال کی عقل ماری گئی ہے میں ابھی رقعہ اس کو اصل حالات کا
لکھتا ہوں۔ سید علی نے کہا ایسی غلطی نہ کرو۔ اتنے میں ایک تھانہ دار آیا اور اس نے میری
نشست کے مکان کے نقشہ کی اجازت مانگی۔ میں نے اجازت دیدی۔ حکیم سید علی نے کہا
کہ جلدی سول سرجن کو بلا کر اس کا پوسٹ مارٹم کرا لو ورنہ وہ گاڑ دیا جائے گا تو صرف کوتوالی

---

[۱] یہ ڈاکٹر بینی صاحب کے نام سے مشہور تھے اور محلہ چنچل گڑھ کے قریب دیسی طرز پہ رہا کرتے تھے ۱۲

[۲] اودھ کی طرف کے متوطن نہایت ذی علم آدمی تھے۔ ابتدا میں وکالت کرتے تھے بعد ازاں سررشتہ عدالت میں ان کو رکھا دیا تھا۔ سیشن جج کی خدمت سے وظیفہ لیا ۱۲

کے ڈاکٹر کی شہادت رہ جائے گی میں نے ڈاکٹر لاری[1] کو رقعہ لکھا وہ فوراً چلے آئے اور کل حال مجھ سے سن کر کوتوالی شفاخانہ گئے اور بعد باقاعدہ کارروائی میرے پاس آئے اور کہا کہ مقدمہ بالکل صاف ہے میں نے یادداشت لکھ لی ہے اور مزدمیرا پانسو روپیہ ہے وہ بھیجدو۔ اب مقدمہ مجھ پر زور شور سے بنایا گیا اور دس بارہ گواہان چشم دید جو گویا دس بجے رات کو میرے گھر میں گھس کر میرے پاس کھڑے تھے جمع کر لئے گئے۔ ڈاکٹر جانسن سے رپورٹ لکھوائی گئی کہ میں نے پانسو روپیہ اس کو بطور رشوت بھیجے تھے۔ نواب وزیر نے معروضہ داخل کیا کہ سرور جنگ پر جرم خون کا ثابت ہے۔ مسٹر کاڈری کہ واپس آگئے تھے انھوں نے لکھا کہ سرور جنگ اپنی ذات سے پیروی مقدمہ کریں کسی بیرسٹر وکیل کی ان کو اجازت نہ دی جائے علاوہ خون کے مقدمہ کے سول سرجن کو پانسو روپیہ رشوت دیئے ہیں یہ جرم بھی ان پر لگایا جائے۔ الغرض میری گردن زدنی کا پورا سامان کر لیا گیا۔ کوچوان کی جو روکہ سب سے بڑی گواہ تھی اس پر کوتوال اکبر جنگ نے قبضہ کر کے خوب اس کو سکھایا پڑھایا اور کوشش یہ کی گئی کہ میں پابزنجیر عدالتِ فوجداری میں بھیجا جاؤں۔ اس میں نواب وزیر اور رزیڈنٹ سے لے کر کل اہلکاران ریاست بلکہ ایک دو صاحب ڈیوڑھی مبارک کے بھی شریک تھے میں نے بھی عرضی حضور پُرنور کو دی کہ برائے خدا حضور میری طرفداری نہ فرمائیں ورنہ

---

[1] رزیڈنسی سول سرجن تھے مدت دراز تک حیدرآباد میں رہے۔ رزیڈنسی کے اثر کی وجہ سے یہ اُس زمانہ میں تمام پولٹیکل معاملات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ امراء بیماری کے بہانہ سے ان کو بلواتے اور بڑی رقمیں فیس کے نام سے یا پوشیدہ ان کو دیا کرتے تھے۔ والد ماجد کی کسی فرمائش کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا بلکہ اگر ان کو چند روز نہ پوچھا تو شکایت کرتے۔ میں اکثر تمام دن ان کے گھر پر رہتا اور کھیلا کرتا تھا ان کو اسپارگس کا بہت شوق تھا اپنے مکان میں اس کی کاشت کرتے تھے اور مجھے تازہ کھلایا کرتے تھے۔ (ذوالقدر جنگ)

تباہ ہو جاؤں گا۔ البتہ مجھکو عدالت[1] میں نہ بھیجیں اور ایک کمیشن جس کو نواب وزیر اور رزیڈنٹ بھی پسند کریں برائے تحقیقات مقرر کردیا جائے میری زبان کو کوئی نہیں لے گئی ہے حضور ملاحظہ فرمائینگے کہ ان ناخداترس لوگوں کی میں کیا گت بناتا ہوں۔ چنانچہ ایک کمیشن قائم کیا گیا اور اجلاس اس کا پُرانی حویلی میں مقرر ہوا کمیشن میں مسٹر کمپبل[2] رزیڈنٹ کی طرف سے سردار عبدالحق نواب وزیر کی جانب سے اور قدیر جنگ بہادر دربار شاہی کی طرف سے مقرر ہوئے۔ کوتوال اکبر جنگ انگریزی فوج کا آدمی تھا مسٹر ٹویڈی مددگار اوّل رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس کا خاص رازدار تھا اور سید حسین صاحب بلگرامی کی توجہ سے نواب لائق علیخاں کی ابتدائی وزارت میں خدمت کوتوالی بلدہ پر سرفراز ہوگیا تھا۔ جو شدید نقصان اس نے ریاست کو پہونچایا وہ بھی حسب موقع بیان کیا جائے گا۔ یہاں بطور جملہ معترضہ اس قدر کافی ہے کہ اس کوتاہ نظر نے عربوں کی قوت توڑنے کی بنا ڈالی[3] اور افسر جنگ نے بحکم نواب وزیر نہایت سرعت کے ساتھ اپنی متعلقہ سپاہ کو

---

[1] یہ عدالت دیوانی بیرون بلدہ کے حاکم تھے ۱۲ [2] یہ اشارہ اُس فساد کی طرف ہے جو بزمانۂ مدار المہامی نواب لائق علی خاں عربوں اور جمعیت کوتوالی میں بسرکردگی اکبر جنگ ہوا تھا اور کچھ دیر عربوں کا قبضہ شہر پر رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان نواز جنگ کے پوتے موجودہ سیف نواز جنگ نہایت کم سن ہاتھی پر ۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۱ھ جانب پُرانا پل جارہے تھے راستہ میں اکبر جنگ بسواری فیل مع جلوس فوج کوتوالی ملے اور کوتوال نے سیف نواز جنگ کے ہاتھی کو بہ تشدد راستہ سے ہٹانا چاہا۔ عرب فوج معترض ہوئی کسی کوتوالی امین نے لکڑی سے ہاتھی کو مارا مگر اتفاقاً لکڑی بچے کے پیر پر لگی اور بچہ رونے لگا۔ عرب ہاتھی کو سلطان نواز جنگ کے مکان پر واپس لے آئے اور پھر باہر نکل کر اہالیان کوتوالی کو مارنا شروع کیا۔ اکبر جنگ کو راستہ میں جب خبر ملی کہ عرب بگڑے ہوئے اُن کی تلاش میں آرہے ہیں۔ یہ بے تحاشا ہاتھی سے اُتر پڑے اور وہیں بہ تبدیل لباس ایک جھٹکہ میں بیٹھکر نہایت ترسان و لرزاں اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ کوتوال کو اس درجہ خوف زدہ دیکھکر جمعیت پولس بھی حواس باختہ اپنی وردیاں اُتار اُتار کر ہر جگہ روپوش ہونے لگے۔ محض نواب لائق علی خاں کی غیر معمولی جرأت سے یہ فساد عظیم فرو ہوا اور سلطان نواز جنگ پر ایک لاکھ جرمانہ کیا گیا۔ حیدرآباد افیرز (Hyderabad Affairs) میں اس واقعہ کی تفصیل درج ہے ۱۲

کمر بستہ گولی بارود کے ساتھ سو کھے حوض پہ حاضر کر دیا۔ مگر صد مرحبا ان عربوں کو اور ان کے نمک حلال جمعدار سلطان نواز جنگ کو کہ انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا ورنہ نوبت کشت و خون کی آجاتی اور ریاست کو صدمۂ عظیم پہونچ جاتا اور سرکار انگریزی کو موقع نوجوان شاہ و وزیر پہ اعتراض کا مل جاتا۔ ان عربوں کی شوکت و عظمت و قوّت کا حال اور ان کے سبب سے جو بھرم ریاست کا قائم تھا کسی موقع پر علیحدہ تحریر کروں گا۔

حکم بریت

آمدم بر سر مطلب اوّل شہادتِ الزامی پیش ہوئی اور ساختہ و مصنوعی گواہوں نے دھوم دھام سے گواہی دی گویا اس وقت یہ مجمع کثیر باوجودیکہ عرب و علی غوں کے پہرے میرے دروازے پر متعین تھے، میرے گھر کے اندر دیوان خانہ میں گھس آئے تھے۔ اس کے بعد کوتوال پیروکار من جانب سرکار نے خوف زدہ حالت میں ہکلا ہکلا کر اپنا بیان لکھوایا اب نوبت اصل گواہ یعنی کوچوان کی جورو کی آئی۔ یہ فاحشہ عورت تھی اور کوتوال سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے شراب پلا کر پیش کیا کہ خوب بولے مگر نتیجہ برعکس ہوا سردار دلیر جنگ نے اٹھ کر اس کے موٗنھ کو سونگھا اور مسٹر کمپیل نے کہا کہ مقدمہ خراب گیا۔ اب صرف ڈاکٹر لارّی کا بیان لے لیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ڈاکٹر لارّی نے آکر کل واقعات اور اپنی یادداشت کا نتیجہ بیان کر دیا اور میری شکایت کی کہ میں نے ان کی فیس نہیں دی، یہ فیس عدالت دلوا دے میں نے اسی وقت پانسو روپیہ کی تھیلی عدالت کی میز پر رکھدی۔ ڈاکٹر صاحب تو تھیلی بغل میں مار کر چمپت ہوئے اور ارکان کمیشن نے مشورہ کیا۔ مسٹر کمپیل نے کہا کہ مقدمہ ثابت ہے میں فیصلہ لکھتا ہوں۔ اس پر سردار عبدالحق اور قدیر جنگ بہادر نے کہا کہ مقدمہ کیا تھا

ہنسی کھیل تھا۔ ہم اپنے فیصلے الگ لکھیں گے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ کل فیصلہ سنایا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میری طرف کی صفائی ابھی نہیں لی گئی۔ اس کا کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ مسٹر کیمپبل وہاں سے اٹھ کر سیدھے نواب وزیر اور مسٹر کاڈری کے پاس گئے۔ خلاصہ یہ کہ تینوں رکنوں نے بالاتفاق فیصلہ سنایا کہ مقدمہ خارج اور سرور جنگ کل الزامات سے بری ہیں۔ میں دودھ کا دھویا شہد کا نہایا گھر کو واپس آیا اور ظفر گڈھ کی تیاری بیکار گئی۔ مسٹر کاڈری نے ایک خط حضور پرنور کو لکھا کہ گو سرور جنگ کل الزامات سے بری ہیں مگر ایک الزام ان پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نادان ہیں کہ اپنے گھر کا انتظام نہ کر سکے اور ایک آدمی کی جان مفت میں ضائع ہوئی۔ لہذا وہ اس جرم میں چھ مہینے تک خانہ نشین کر دیئے جائیں اور ان کو فہمائش کی جائے کہ آئندہ وہ اپنے گھر کا انتظام عقلمندی کے ساتھ کریں۔ حضور پرنور نے مجھکو یہ خط دکھایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے جب فدوی کو ابتدا میں یاد فرمایا تھا فدوی اسی وقت اپنا انجام سمجھ گیا تھا ؎

بے فنائے خود میسر نیست دیدارِ شما

می فروشد خویش را اوّل خریدارِ شما

اب اپنے نمک خواروں اور جاں نثاروں پر رحم فرمایئے اور ان جھگڑوں کو ختم فرما دیجئے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فدوی لائق علی خاں کو لے آتا ہے اس کا قصور معاف فرمایئے اور ایسی شرطوں سے اُن کے ہاتھ جکڑ دیجئے کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکیں اور دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے شاہی اقتدار سے اس کو معزول کر دیجئے

سلطے بیدر کا قلعہ ۱۲

اور کسی دوسرے خانہ زاد کو یہ عزت عطا فرما دیجئے ورنہ ہم جاں نثاروں کی مٹی تک برباد ہو جائے گی۔ فرمایا دوسرا شخص کون تجویز کیا جائے میں نے عرض کیا کہ قبل ازیں کہ فدوی اپنی رائے ظاہر کرے فدوی ایک تاریخی واقعہ عرض کرتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے سر جان لارنس سے مشورہ لیا کہ ملکِ پنجاب کے انتظام کے واسطے لائق ترین شخص کون ان کے ذہن میں ہے۔ سر جان نے جواب دیا کہ اگر مجھ پر بدگمانی نہ کی جائے تو میں اپنے علم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کام کے واسطے میرے بھائی سر ہنری لارنس سے لائق تر کوئی آدمی آپ کو نہ ملے گا۔ لارڈ ڈلہوزی نے فوراً انتظامِ پنجاب ان کے سپرد کر دیا۔ نواب امیر کبیر کی اور میری دوستی مشہور ہے اور وہ مجھکو مثل اپنے بھائی کے سمجھتے ہیں فدوی کے نزدیک ان سے بہتر وزیر آپ کو نہ ملے گا" یہ سن کر فرمایا کہ یہ امر غور طلب ہے اور اب تو وائسرائے آ رہے ہیں"۔

ویسرائے کی آمد

اب وائسرائے کی مہمانداری[۵۰] کا انتظام بھی شروع ہوگیا۔ اہلکارانِ دیوانی نے رزیڈنسی کی طرف دوڑ شروع کردی اور بیٹے چوٹے سب مسٹر کارڈری سے ہوتے رہے تا اینکہ لارڈ ڈفرن حیدرآباد میں داخل ہوئے۔ دربار اور ڈنر اور پارٹیز وغیرہ کی تفصیل طول بیجا ہے خلاصہ اینکہ صدر صوبیدار اقلیم ہند اور شاہ دکن میں تین ملاقاتیں ہوئیں اور لارڈ ڈفرن نے خوب حضور پرنور کو ٹٹول لیا مسٹر کارڈری نے اب تمام قوت کے ساتھ لارڈ ڈفرن[۵۲] کو مجبور کرنا چاہا کہ باہم شاہ و وزیر میں صلح کرادیں مگر لارڈ ڈفرن اپنے زمانہ کے مشہور مدبران یورپ میں شمار کئے جاتے تھے ان پر کسی کا افسون نہ چل سکا۔

نواب امیر کبیر کے قصرِ دولت پر شوری قرار پایا۔ ایک کوچ پر حضور پرنور اور نواب وائسرائے اور روبرو کرسی پر نواب امیر کبیر متمکن ہوئے اور مجھکو حکم ہوا کہ میں پس پشت حضور پرنور استادہ رہوں۔ لارڈ ڈفرن[۵۳] نے تازہ زبانِ فارسی سیکھنی شروع کی تھی پس گفتگو بھی

---

[۵۱] ۲۷ صفر ۱۳۰۴ھ م ۱۸۸۶ء

[۵۲] عرصہ تک بعہد سلطان عبدالمجید خاں مرحوم قسطنطنیہ میں برٹش سفیر رہے تھے۔ لیڈی ڈفرن مثل اپنے نامور شوہر کی شرافت نفس اور اخلاق و مروت میں ہر طبقہ میں ہر دل عزیز تھیں۔

[۵۳] اس مقام پر مجھ کو ایک عجیب بات یاد آئی یعنی اثنائے قیام وائسرائے مقام مسابقت اسپاں پر حسب الحکم حضرت بندگانِ عالی میرزا محمد علی بیگ افسر جنگ بہادر نے اہتمام اسپورٹس یعنی بازی گاہ کا کیا اور نواب تدبیر جنگ کو حکم پلنگان شکاری کے حاضر رکھنے کا صادر ہوا سہ پہر کو حضور پرنور بجاہ و حشمت و اقبال معہ مصاحبین لارڈ ڈفرن کو ہمرکاب سعادت بازی گاہ پر لے گئے اور خود بدولت و اقبال کرتب و اسپ سواری و میخ کنی یعنی ٹنٹ پگنگ میں اس اسلوب سے شریک ہوئے کہ لارڈ ڈفرن نے بھی تعریف کے نعرے مارے اور جب کہ حضور پرنور فراغت پاکر نشست گاہ کی طرف واپس ہوئے لارڈ ڈفرن نے آگے بڑھکر تعریف کی اور تعریف کناں (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

اسی میں شروع کی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب حضور پرنور کی فارسی دانی کا پردہ فاش ہوتا ہے جرأت کر کے کہا یور اکسیلنسی یہاں فارسی سمجھنے والے (غیر لوگ) بہت ہیں۔ بہتر ہے کہ انگریزی میں گفتگو کیجائے۔ اس وقت لارڈ ڈفرن نے مونھ موڑ کر مجھ کو خوب غور سے دیکھا اور کہا "ویری ویل" (Very well) اب وہ انگریزی میں حضور پرنور سے گفتگو کرنے لگے۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ آپ بدل سالار جنگ سے ناراض نہیں ہیں اور یہ تو میں اب

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) چند قدم حضور پرنور کے گھوڑے کے ساتھ پیدل چلے حضرت بندگان عالی اسپ سوار اور لارڈ ڈفرن نائب بادشاہِ ممالک ہندوانگلینڈ پیادہ پا باہم ساتھ سخن کناں سب نے یہ تماشہ دیکھا لارڈ ڈفرن کہ امیر ابن امیر اور برٹش نژاد جس کی رگوں میں پردیسی و یا دوکانداری خون نہ ملا تھا ایک رئیس کے ساتھ بے تکلفانہ رفتار میں مضائقہ نہ سمجھے اور اس کے مقابلے میں اس زمانے میں لارڈ ریڈنگ نے جو مسلک اعلیٰ حضرت سکندر شوکت کے ساتھ اختیار کیا وہ بھی ایک درد خیز یادگار رہے گا۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ دیکھئے لارڈ ریڈنگ کا خط جو انہوں نے مارچ ۱۹۲۶ء میں معاملہ برار کے متعلق حضور پرنور کو لکھا تھا۔ جو برتاؤ برٹش گورنمنٹ کا رؤسائے ہند کے ساتھ عموماً ہے اُس کے متعلق سر رچرڈ ٹمپل نے اپنی کتاب "انڈیا ان ۱۸۸۰ء" جو رائے اپنی لکھی وہ قابل ملاحظہ ہے۔ دیکھو صفحہ ۶۲۔ سر رچرڈ لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کا برتاؤ دیسی ریاستوں کے ساتھ مروت اور اخلاص کے ساتھ ہو تو وہ برٹش ممالک میں اچھی نظر سے دیکھا جائیگا۔ اور اگر یہ برتاؤ نامناسب سختی اور خلافِ اخلاق ہو تو وہ نہ صرف برٹش ممالک میں ناپسند ہوگا بلکہ دیسیوں کو موقع ملے گا کہ وہ مخالفانہ نکتہ چینی کریں۔

مسٹر بلنٹ نے فروری ۱۸۸۴ء کے فارٹ نائٹلی ریویو (Fort nightly Review) میں یہ لکھا ہے کہ محض ایک والسرائے کے ہمدردانہ اور سیدھے طرز عمل نے ریاست حیدرآباد کو اپنا خیرخواہ بنالیا۔ جب میں بغرضِ تعلیم انگلستان گیا ۱۸۹۴ء تو سب سے پہلے میں سر رچرڈ ٹمپل سے ملا۔ چونکہ یہ دادا مرزا عباس بیگ سے خوب واقف تھے میرے ساتھ بکمال محبت پیش آئے۔ سر رچرڈ نے مجھکو انگلینڈ کی بہترین سوسائٹی میں شریک کردیا کیمبرج کی تعطیل میں میں ہمیشہ سر رچرڈ ٹمپل یا کسی رکن گورنمنٹ مثل رائٹ انریبل مسٹر ہائیزی مسٹر گلی (لارڈ سلی) اسپیکر وغیرہ کے پاس مہمان رہا کرتا تھا جب میں نے ٹمپل صاحب سے پلاوڈن صاحب کے مذموم طرزِ عمل کا مفصل ذکر کیا تو انہوں نے کمال افسوس کے ساتھ کہا کہ میں گورنمنٹ کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی غلطیوں سے واقف ہوں۔ دیسی ریاستوں کے ساتھ اُن کو نامناسب سختی اور تکبر کا اندیشہ ہے کہ ہماری بربادی کا باعث ہوگا۔ رچرڈ ٹمپل بزمانۂ حضرت افضل الدولہ حیدرآباد میں کچھ روز رزیڈنٹ رہے تھے اور ریاست کے ساتھ خلوص رکھتے تھے۔ (ذوالقدر جنگ)

بھی کہونگا کہ اس سے کوئی ایسا قصور صادر نہیں ہوا کہ اس کو اتنی بڑی سزا دیجائے مگر چونکہ
اب مجھ کو معلوم ہوگیا کہ کسی خاص وجہ سے آپ اس سے بیزار ہوگئے ہیں تو آپ اس کو
معزول کر دیجئے اور یہ انتخاب بھی مجھ کو پسند ہے سر خورشید جاہ پریمیر نوبل اور سن رسیدہ اور
ذی لیاقت ہیں مگر میری خواہش یہ ہے کہ میرے کلکتہ پہنچنے تک آپ تامل کریں اور کار
ریاست جس طرح چل رہا ہے چلنے دیں اور میرے فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ
نواب امیر کبیر کی طرف مخاطب ہوئے جس کا میں اردو میں ترجمہ کرتا گیا۔ کہ آپ سن رسیدہ
اور تجربہ کار ہیں یقین ہے کہ ہز ہائینس کو آپ خوش رکھکر ایڈمنسٹریشن (انتظام)
(Administration) میں ترقی کریں گے اور دونوں سرکاروں کی باہم
دوستی کو مضبوط کریں گے۔

یہ تو سب کچھ ہوا مگر مولوی مہدی علی نے اپنی دانائی اور مشکل کشا عقلمندی سے
چشم زدن میں ہماری تمام کارستانی اور طویل محنت کو برباد کردیا۔ اس شخص کو اللہ تعالیٰ
نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا کہ اگر یہ یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو بسمارک اور ڈیزریلی بھی اس
کے آگے کان پکڑتے واقعہ یہ ہے کہ ہنوز لارڈ ڈفرن روانہ نہ ہوئے تھے اور کل صبح کو
جانے والے تھے اتفاقاً حضور پر نور بلیرڈ ٹیبل کے پاس تخت پر جلوہ افروز تھے اور مصاحبین
دست بستہ گرد تخت کے کھڑے ہوئے تھے راقم بھی حاضر تھا اور نواب وزیر ترساں و
لرزاں دور دالان کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے حضور پر نور نے حسب دستور ہم سب
حاضرین کو علیٰ قدر مراتب پان عطا فرمائے اس وقت شاید ان کو حقیر کرنے کے واسطے
دو پان دست مبارک میں لیکر ان کی طرف دیکھا انہوں نے دوڑ کر آداب بجا لاکر وہ پان
لے لئے۔ اس ادنیٰ بات کا بڑا تبنگڑا بنا دیا گیا یعنے کوئی دس بجے رات کو لارڈ ڈفرن

کا خط آیا کہ میں یہ سُن کر کہ آپ نے سالار جنگ کی خطا معاف فرما دی بہت خوش ہوا
اور میں کل صبح کو اطمینان کے ساتھ روانہ ہوتا ہوں - یہ خط پڑھکر حضور پر نور نہایت پریشان
ہوگئے اور میں دریائے حیرت میں غرق ہوگیا کہ الٰہی یہ کیا جادو اہلکاران دیوانی نے
کیا اور یہ طلسم کس طرح توڑا جائے کہ یکایک بامداد غیبی میرے ذہن نے انتقال کیا میں
نے عرض کیا کہ حضور نے دیوان لائق علی خاں کو عطا فرمائے اس پر مخالفین ساحری
فن نے یہ جادو کی عمارت کھڑی کی اس کا ڈھا دینا کیا مشکل ہے فوراً جواب مرحمت
فرما دیا جائے - فرمایا کہ لکھئے کیا جواب دیا جائے - میں نے قلم برداشتہ لکھا کہ چونکہ میری
اور آپ کی رائے متفق ہو چکی تھی میں نے آج منسٹر کو رخصت نامہ یان عطا کرنے اور یہ
رسم میرے دربار کی کا ڈری صاحب کو معلوم ہے تعجب ہے کہ انہوں نے آپ کو مطلع
نہیں کیا مگر میں جو آپ سے وعدہ کر چکا ہوں اس پر مستقل ہوں یعنے جب تک کلکتہ جا کر
مجھ کو آپ نہ لکھیں گے میں اپنے دل پر جبر کر کے منسٹر سے کام لیتا رہونگا - اس خط کو پڑھکر
حضور پر نور کا چہرہ مبارک بشاش ہوگیا اور دستخط کر کے فرمایا کہ حضرت آپ خود اس خط
کو لیجائے - میں از حد پریشان ہوا کہ رات کا ایک بج چکا تھا اوّل تو مسٹر کاڈری سے
ملاقات ناممکن دوسرے نہ معلوم وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں اور کیا میری گت بنائیں خوف
زدہ خط کو لیکر رزیڈنسی پہونچا سب خواب خرگوش میں مبتلا تھے میں نے چپراسی کو بلا کر وہ خط
دیکر کہا کہ جب کاڈری صاحب اُٹھیں یہ خط ان کو دے دینا کہ لاٹھ صاحب کو پہونچا دیں اور
ملّیا شاگرد پیشہ کو وہاں چھوڑ آیا تا کہ اپنے سامنے وہ خط پہونچوا دے بعد اس کے میں
نے حضور پر نور سے عرض کیا کہ نقصان تو کچھ نہیں ہوا اگر مسٹر کاڈری کو معاملہ کو طول دینے
کا موقع مل گیا - بالآخر میں نے ایک طویل خط جس کو میموریل کہنا چاہئے بمشورہ سردار عبدالحق

لکھنا شروع کیا جس میں ابتدائی نااتفاقی سے لیکر الی الیوم کل حالات مفصل تحریر کئے اور اس عرصہ میں جو مصیبت میرے سر پر نازل ہوتی گئی اُسے برداشت کرتا گیا۔ صرف خاص کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ حضور پر نور نے اس علاقہ کی معتمدی مجھ کو عطا فرمانے کا قصد کیا مگر میں نے بہ مصلحت معافی مانگ لی اور سید عبدالرزاق کی سفارش کر دی۔

اب یہ سنئے کہ اہلکاران دیوانی امیر کبیر کے نام زد ہونے کی خبر سنکر از حد پریشان ہوگئے اودھر حاضر باشان در دولت شاہی میں بھی کمال درجہ کھلبلی پڑگئی اور ہر جانب سے حملے ان پر شروع ہوگئے یہاں تک کہ حضور پر نور بھی اُن سے مشکوک کر دئے گئے۔ نواب بشیرالدولہ[۵] آسمان جاہ امیر اکبر اس زمانہ میں انگلینڈ گئے ہوئے تھے حضور پر نور نے اس میموریل میں بجائے نواب امیر کبیر نام آسمان جاہ کا لکھوا دیا جب وہ میموریل تیار ہوا تو اُس کو صاف کرانے کی ضرورت پڑی۔ افسر جنگ کا انگریزی خط بہت اچھا تھا اور وہ زود نویس تھے باوجودیکہ میں ان حضرات کی بیوفائی کے مزے چکھ چکا تھا اور ان کی "ہل من مزید" سے واقف تھا مگر "آزمودہ را آزمودن جہل است"۔ کا مصداق بن گیا اور وہ میموریل ان سے صاف کرایا انہوں نے اپنی عادت کے مطابق فائدہ عظیم اُٹھا لیا یعنے سر آسمان جاہ کو فوراً تار دیکر ایسا ممنون بنا لیا کہ گویا ان ہی کی سفارش سے وہ وزیر بنے تھے اُدھر اپنا راستہ گورنمنٹ میں بھی کھلا رکھا اور فوجی مدارج میں بھی ترقی کرتے گئے۔ واضح رہے کہ جس وقت وزارت پناہ مرحوم کے وقت میں پانچ ہزار فوج باقاعدہ کی اجازت ہوئی تھی تو یہ شرط لگائی گئی تھی کہ کمانڈر انچیف فوج کا انگریز ہوا کرے گا مگر اس خیال سے کہ میرزا محمد علی بیگ مسلمان اور ہندوستانی ہوکر فنون سپاہ گری میں دستگاہ کامل

۵؎ ۲۰ رجب ۱۳۰۴ھ نواب آسمان جاہ کا تقرر ۲۰ شوال ۱۳۰۴ھ کو ہوا م ۱۸۸۷ء

رکھتے ہیں اور نظام کے نوکر ہوکر ہمارے بھی خیرخواہ ہیں لہٰذا ایسا آدمی کم دستیاب ہوگا سرکار
انگریزی ان کو ترقی مراتب دیتی گئی اور بعد انتقال کرنل نیول یہ نہ فقط کمانڈر فوج باقاعدہ
کئے گئے بلکہ گویا کمانڈران چیف افواج ریاست ہوگئے۔ بعد مولوی مہدی علی کے
خوش فکری دور اندیشی اور بلند حوصلگی میں مرتبہ افسر الملک بہادر کا ہے کہ چڑھتے آفتاب
کی پوجا کرکے مغرب کے وقت مونھ پھیر لیتے تھے۔ آمدم بر سر مطلب اس میموریل میں یہ بھی
درخواست تھی کہ ایک ذی وقعت انگریز برائے چندے بطور پرائیویٹ سکرٹری مابدولت
واقبال کے پاس بھیجا جائے۔ یہ درخواست میں نے اس وجہ سے درج کی تھی کہ ایک
طرف میں تنہا اور دوسری طرف اہل تجربہ گرگان باراں دیدہ اور علوم وفنون میں مجھ سے
بدرجہا لائق وفائق اور یہ خوف دامنگیر کہ ذرا سی غلطی میں میرا قلع وقمع ہوجائے گا علاوہ
اس کے معاملہ کو طول ہوگیا ہے پس ایک انگریز کی تحریر وتقریر میری تحریر وتقریر سے
زیادہ با اثر ہوگی اور معاملہ جلد ختم ہوجائے گا گو بقول مہدی علی صاحب کے مجھ سے یہ بھی بڑی
غلطی ہوئی۔ خلاصہ اینکہ کرنل[1] مارشل پنجاب سے اس خدمت پر بھیجے گئے۔ کرنل صاحب
نے آتے ہی ہنسی مذاق مسخرہ پن شروع کردیا۔ میرے قدیم مہربان ایڈی کانگ افسر جنگ
نے یہ خیال پیش بندی کرنل کو خوب یقین دلادیا کہ سرور جنگ حضور پرنور کے مزاج میں
بہت دخیل ہے تمہارا رنگ نہ جمے گا۔ ادھر اہلکاران دیوانی کرنل صاحب سے چمٹ گئے
مولوی مہدی علی نے فرد وکچی کو ان کے پاس متعین کردیا۔ سردار عبدالحق نے ان کو پورا
شیشہ میں اتار لیا۔ کرنل صاحب نے مجھ کو اپنا رقیب سمجھ کر کمر ہمت میری مخالفت پر باندھ لی۔

---

[1] تقرر ۳ ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ جن الزام کی بنا پر واٹسن اینڈ سنز سے معاملہ کرنا وغیرہ۔ کرنل صاحب خدمت سے علیحدہ ہوئے اس کی تفصیل حیدرآباد افیرز میں درج ہے۔ بابت ۱۸۸۸ء

(میرے قدیم مہربان مذکورۂ بالا نے تو رشتہ اخوت ان سے باندھ لیا۔ دونوں سپاہی پیشہ تھے بھائی بھائی بن گئے۔ حضور پر نور محبوب یار جنگ کے بنگلہ میں بمقام سیف آباد مقیم تھے میں بھی وہیں سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایک روز میں گول کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ افسر جنگ اس کمرہ میں آگئے میں شامت زدہ ان کی تعظیم کو سرو قد نہ اُٹھا انہوں نے کرنل مارشل سے شکایت کی اور سردار عبدالحق سے کہا کہ سرور جنگ کا غرور اب تک نہیں گیا اگر میں چاہتا تو چوبدار کو حکم دیکر ان کو نکلوا دیتا۔

اب ایک نئی حکایت سنئے کہ سردار عبدالحق نے کرنل سے کہا کہ تم برائے چندے یہاں آئے ہو مستقل ہونے کی فکر کرو چنانچہ باہم کرنل اور سردار اور افسر میں مشورہ ہو کر ایک خط حضور پر نور کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھوا بھیجا کہ میں اس قدر رقم برائے انتظام سرحد[1] افغانستان دیتا ہوں گورنمنٹ قبول کرئے وہاں سے جواب آیا کہ نقد رقم تو ہم نہیں لیتے مگر تھوڑی فوج ہمارے نام سے یعنی امپیریل سروس فورس باقاعدہ کھڑی کرلو اس کے قواعد اور ضوابط ہم بنالیں گے۔ خط لکھنے سے پہلے اتفاقاً عبدالحق نے مجھ سے اس کا ذکر کردیا تھا میرے ہوش اُڑ گئے تھے پس میں نے متواتر عرضیاں حضور پر نور کو برائے باریابی لکھیں اور ہر روز بامید باریابی جاتا رہتا مگر کسی طرح باریابی میسر نہ ہوئی بلکہ حضور پر نور کے تیور میں نے بدلے ہوئے پائے۔ بالآخر معلوم ہوا کہ کرنل مارشل نے حضور پر نور سے عرض کردیا کہ سرور جنگ نے نواب امیر کبیر سے ایک بڑی سازش کی ہے اور مولوی مہدی علی سے گواہی دلوادی جب میں نے مولوی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا واقعہ صحیح ہے اور میں نے بہ مجبوری گواہی دی ہے میری یہ مجبوری قابل معافی ہے۔

---

[1] پنجدہ کی فساد کی وجہ سے اُس زمانہ میں اندیشہ تھا کہ برطانیہ اور روس میں جنگ ہوگی ۱۸۸۵ء

الغرض امپیریل سروس فورس تو نہ فقط حیدرآباد میں بلکہ کل ریاستوں میں قائم ہو گئی مگر کرنل مارشل کو کوئی فائدہ نہ ہوا وہ بالآخر نکالے گئے۔

کرنل مارشل عبدالحق اور محمد علی بیگ صاحب کی تگڈم کا تو یہ حال ہوا علاوہ اس کے دوسری تگڈم مولوی مہدی علی اور فردونجی اور کرنل کی بھی قایم ہوئی اور نواب وزیر کو یقین دلایا کہ تمہارے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم خود استعفا داخل کر دو ہم نامنظور کرا دیں گے۔ چنانچہ نواب وزیر نے استعفا لکھ کر مولوی صاحب کو دیدیا۔ یہاں حضور پر نور تلے ہوئے بیٹھے تھے فوراً استعفا منظور کر لیا۔[۱]

سر آسمان جاہ کی ولایت سے واپسی

اب[۲] نواب آسمان جاہ دوڑے ہوئے انگلینڈ سے آئے اور خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے اور نواب وزیر پونے میں جا کر مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا جس وقت نواب امیر کبیر نے اُن کے انتقال کی خبر سنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا ع

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

---

[۱] ۲۴ رجب ۱۳۰۴ھ اس کے دو سال بعد پونہ میں بتاریخ ۸ ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ نواب لائق علی خاں نے انتقال کیا۔ اندرون بلدہ اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہیں۔

[۲] اب عنان حکومت ان دو کے ہاتھ میں آ گئی یعنے یہ تگڈم اور سردار عبدالحق اور جو فرے اس الیگار کے (Oligarchy) (حکومت الاعیان) نے تا دالیسی منٹر اوڑا سے اس کا قیاس ناظرین کر سکتے ہیں۔ اس حکومت کے کرنل مارشل صدر اور مہدی علی و سردار عبدالحق دست راست و دست چپ تھے۔ مسٹر فردونجی ہر سہ صاحبان الامر کے چاپلوس خدمتگار اس تگڈم یعنی کرنل اور مولانا اور فردونجی کو اپنا خیر خواہ اور صادق القول سمجھ کر نواب وزیر نے بے تکلف استعفا لکھ کر دیدیا اس کارروائی میں افسر جنگ و سردار عبدالحق شریک نہیں ہوئے

نواب امیر اکبر سر آسمان جاہ بہادر

عجب قسمت اس بچّے کی تھی جن لوگوں نے اس سے فائدے اُٹھائے ان ہی لوگوں نے اس کو برباد کیا۔ نواب امیرِکبیر کا قول صرف ایک حد تک صحیح ہے یعنی اہل سازش جو نواب وزیر کے گرد جمع ہوتے تھے اُن میں صرف دو صاحبوں نے مستقل اور دوامی فائدہ ایسا اُٹھایا کہ قدیم امرائے ریزہ تو ایک طرف امرائے عظام سے بھی دولت وحکومت وجاہ وجلال میں سبقت لے گئے اور نواب آسمان جاہ کو سیڑھی بناکر قدم بقدم بالا تر چڑھتے رہے اور جب آسمان جاہ کی معزولی کا وقت آیا تو وہاں سے اُڑکر نواب وقارالامرا کی چھتری پر جابیٹھے۔ تفصیل اس اجمال کی رفتہ رفتہ بیان ہوگی۔ راقم کا حال یہ ہوا کہ باطمینان تمام اپنی چھوٹی سی حیثیت اور عزت لیکر پھر خانہ نشینی اختیار کرلی اور جناب سیدنا ومرشدنا حضرت سید محمدؐ پاشا صاحب[۱] بخاری کے دست حق پرست پر جناب پیر دستگیر اور خواجہ غریب نواز کی غلامی میں داخل ہوکر زیادہ تر اپنے اوقات اپنے پیر مرشد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں بسر کرنے لگا اور معاملات سے کلیتہً بقول مومن خاں مومن ؎

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

قطع تعلق کردیا۔ ایک روز جو میں نماز صبح سے فارغ ہوکر باہر نکلا تو دیکھا مولوی مشتاق حسین میرے مکان کو مسجد سمجھکر تلاوت قرآن مجید کررہے ہیں۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید کو جزدان کردیا اور مجھ سے بہت تپاک سے ملے۔ مولوی صاحب ضلاع میں صدر تعلقدار نہایت متدیّن اور سچے خیر خواہ ریاست اور کمال درجہ جفاکش اور کارگزار اور ہر سازش سے پاک وصاف اور عربی فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور نواب آسمان جاہ کے

---

[۱] حضرت کا مزار مبارک درگاہ اوجالہ شاہ صاحب کے متصل جانب شرق واقع ہے۔

مشیر خاص تھے مجھ سے کہنے لگے کہ تم ناحق گوشہ نشین بنے ہو میرے ساتھ چلو میں نواب صاحب سے تمہاری سفارش و صفائی کرا دونگا میں نے ہر چند عذر کیا مگر وہ مجھ کو پکڑ لے گئے۔ نواب آسمان جاہ نہایت مستقل مزاج اور کوہ وقار اور از حد کم سخن تھے۔ مجھ سے بخندہ پیشانی ملے مگر اثنائے گفتگو میں ذکر نواب خورشید جاہ امیر کبیر کا آگیا مجھ سے فرمایا کہ آپ اکثر ان کے پاس جایا کرتے ہیں میں نے جواب دیا کہ میری ان کی قدیم راہ و رسم ہے اور ان کے فرزند میرے شاگرد ہیں۔ یہ سُن کر وہ چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا مجھ کو باہر لے آئے اور کہا کہ آپ نے غلطی کی جو یہ جواب دیا مگر میں سنبھال لونگا اب اصل مطلب سنو نواب صاحب کا حال تم خود جانتے ہو پوتڑوں کے امیر ہیں اور اہل سازش سے بھی تم خوب واقف ہو نواب صاحب نے کئی معروضے حضور پر نور میں داخل کئے کہ اضلاع سے مجھ کو بلا کر اپنے پاس رکھیں مگر اب تک کوئی جواب عطا نہیں ہوا اگر آپ سچے خیر خواہ ریاست کے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دروازہ سازش کا بند ہو اور کار ریاست میں خلل نہ واقع ہو تو آپ میرے بارے میں ضرور کوشش کیجیے۔ میں نے اُن سے کہا کہ قلم دوات کاغذ دیجیے میں آپ کے روبرو معروضہ لکھتا ہوں اور آپ ہی داخل کرا دیجیے۔ چنانچہ میں نے مختصر معروضہ یہ لکھا کہ درحالیکہ حضور نے آسمان جاہ بہادر کو اس خدمت پر سرفراز فرمایا ہے تو ضرور ہے کہ ان کو اُن کی پسند کے اہلکار دئے جائیں ورنہ نواب لائق علی خاں کے وقت کی ہنگامہ آرائی قائم رہی گی اور مولوی مشتاق حسین پر ان کو کامل اعتبار بھی ہے۔ فدوی نے یہ جرأت معروضہ کی صرف براہ خیر خواہی کی ہے۔ یہ لکھکر میں چلا آیا چند روز بعد میں نے سُنا کہ مولانا دست راست بلکہ عصائے پیری نواب آسمان جاہ کے ہو گئے اور کل حل و عقد ریاست ان

کے قبضہ میں ہو گیا اور انہوں نے فرد و نجی صاحب کو مراسلات انگریزی کے واسطے اپنا پیش دست اور رُستم جی[1] کو مشیر قانونی بنا لیا اور مہدی حسن فتح نواز جنگ کو اپنا شریک خدمت کر کے مولوی مہدی علی کو خانہ نشین کر دیا۔ یہ مہدی حسن فتح نواز جنگ چند روز اپنے بھائی حیدر حسن کے ساتھ ہمارے تعلیم خانہ و تربیت خانہ واقع قیصر باغ لکھنؤ میں میرے ساتھ بھی رہے تھے مگر کچھ حاصل نہ کیا۔ البتہ مسخرہ پن میں ممتاز تھے بعدہٗ ملک اودھ میں منصف ہوئے۔ ایک دوغلی میم کو گھر میں ڈال کر پردہ نشین کر لیا تھا اور اس ہی سے کچھ انگریزی تحریر و تقریر حاصل کر لی تھی۔ ذہن رسا پایا تھا اور بچپن میں کچھ عربی بھی پڑھ لی تھی۔ سر سید احمد خاں سے بیعت کر کے ان کی سفارش بنام وزارت پناہ لائے تھے مگر ان کا انتقال ہو چکا تھا اور مہاراج کا عہد وزارت تھا۔ مولوی مشتاق حسین ان کو اپنے ساتھ میرے پاس لائے میں نے سفارش کر کے صیغۂ عدالت میں ملازم رکھا دیا تھا مگر چند روزہ زمانہ نواب وزیر میں انہوں نے اور ان کی میم نے نواب وزیر کی صحبت میں کمال رسوخ حاصل کیا اور جب وہ معزول ہو گئے تو بامداد مولوی مشتاق حسین مصاحب و مشیر خاص نواب آسمان جاہ بن گئے مگر چونکہ نواب آسمان جاہ سن رسیدہ اور قدیم تہذیب کے پابند تھے میم صاحبہ کی دال وہاں نہ گلی۔

آمدم برسر مطلب حضور پر نور نے کل اختیارات حل و عقد جو وزارت پناہ و مہاراج و نواب وزیر کو حاصل تھے نواب آسمان جاہ کو عطا فرما کر مختار کل ریاست ابد مدت کا کر دیا صرف اہم معاملات میں ضروری معروضات مع اپنی رائے اور تجویز کے نواب صاحب کی

---

[1] وکیل بمبئی کے تھے۔ نواب وقار الامراء کے زمانہ میں ہوم سکریٹری مقرر ہوئے۔ بعد میں بالزام ۲ ماہ تک خدمت سے علیحدہ اور بمبئی واپس کر دئیے گئے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے ان کو پھر طلب فرمایا اور رستم جنگ خطاب عطا فرمایا۔

طرف سے اور ان کے نام اور دستخط سے مولوی مشتاق حسین صاحب داخل کر دیا کرتے
تھے۔ گویا درحقیقت وزیر اعظم جناب مولانا اور ان کے شریک فتح نواز جنگ بہادر تھے
نواب صاحب فقط دستخط کے مالک تھے۔ مولوی مشتاق حسین میں سوائے ضد اور ہٹ
کے اور کوئی عیب نہ تھا۔ ریاست کے خیر خواہ وزارت کے بھی خواہ متدین متقی و پرہیزگار
محنت و جفاکشی میں تیلی کا بیل شب و روز قلم دوات کاغذ سے سروکار مگر چونکہ نرے مولوی
تھے بلند پروازی میں کبھی ایک منزل کوٹھے سے زیادہ نہ اُڑ سکتے تھے۔ انگریزی معاشرت
اور انگریزی خیالات سے ناواقف تھے۔ لہذا انہوں نے جس طرح پلے ہوئے ہاتھی
کو جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے کے واسطے چھوڑ دیتے ہیں مسٹر فردونجی جیسے ادیب اور انگریزی
معاشرت کے واقفکار کو انگریزوں کو رام کرنے کے واسطے متعین کر رکھا تھا۔ اُدھر فتح
نواز جنگ مہدی حسن کو کہ حسب موقع کذب و صدق میں بیباک تھے اہل سازش کی سرکوبی
کے واسطے اپنا شریک خدمت بنایا تھا۔ خود حضور پر نور کی خوشنودی حاصل اور قائم رکھنے
کے واسطے سید حسین صاحب بلگرامی کافی تھے۔ علاوہ ان کے افسر جنگ پہلے ہی سے
اثر جما چکے تھے رہ گیا میں سو سبھوں کی دانست میں کرنل مارشل میرا کام تمام کر چکے
تھے۔ اب تین وزیر حیدرآباد میں ہو گئے۔ ایک وزیر اعظم برائے دستخط اور دو وزیر کوچک
برائے انتظام ریاست اور ایک انگشت ششم یعنی کرنل مارشل مع افسر جنگ مگر بقول
افسر جنگ ایک بیچارے سپاہی کو بڑے معاملات میں مداخلت کی قدرت کہاں ہو سکتی
ہے۔ صرف بظاہر مونھ بولے بھائی بن گئے تھے۔ اور جب کرنل صاحب کو اوّل درجہ کا
ٹکٹ دیا جا کر میل ٹرین میں روانہ کر دیا گیا تو یہ وزرائے کوچک کی برادری میں شریک
ہو گئے۔ سردار عبدالحق کا فیصلہ جس طرح ہوا وہ الگ بیان کیا جائے گا۔ مولوی مہدی علی

کی بابت کچھ رعایت ہم وطنی اور کچھ یہ خیال کہ فرد وجی کو ان سے جدا کرکے ان کو پر قبضہ کردیا گیا لہذا اُن وزراء نے ان کو یتیم و خانہ نشین کرکے چھوڑ دیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ ہر طرف سے سازش کا سدّباب ہوگیا۔ ریاست کی گاڑی کو ریل گاڑی کی رفتار پر دھوم دھام سے چلانے لگے اور حق یہ ہے کہ مولوی مشتاق حسین کی محنت اور جفاکشی اور سید حسین صاحب کی رفاقت نے ریاست کو رونق خاص بخشندی تھی۔ ان کی خوش قسمتی سے سر ڈنس فرٹز پاٹرک سا من رسیدہ نامور رکن حکومت انگریزی رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد گئے[1] اور وہ اپنی کمال قوت سے ان حضرات کے حامی ہوگئے۔ لہذا چند روز یہ جابرانہ حکومت اس زور شور سے قائم رہی کہ کل اہل بلدہ و عہدہ داران ماتحت مرعوب ہوکر مثل بید کانپتے رہے۔ بجز خیر خواہان وزرائے کوچک کسی کی رسائی وزیر اعظم تک نہ تھی اگر ایک وزیر کوچک وزیر اعظم کی نسبت یہ پکارتا تھا کہ ؎ ببیں کہ آئینہ دار جمال یار منم

تو دوسرا جواب دیتا تھا کہ ؎ بیا کہ شانہ کش زلف تاجدار منم

اور خیر خواہان وزرائے کوچک مثل شتران بے مہار ہر طرف اپنی لمبی گردنیں بڑھا کر مونھ مارنے لگے۔ افسر جنگ کہ بوجہ اپنی تاربازی کے بانی مبانی اس وزارت کے سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے نظم جمعیت اور علاقہ پیشکاری کی پلٹنوں پر بھی قبضہ کرنا چاہا بلکہ اس وزارت نے ہمت عالی اس امر کی طرف مبذول فرمائی کہ خاندان پیشکاری تک کو نیست و نابود کردیں اس واسطے کہ پیشکار گزشتہ زمانہ میں نائب وزیر اعظم کا متقرر

---

[1] رزیڈنٹ ۶ اگست ۱۸۸۹ء لغایۃ ۱۱ نومبر ۱۸۹۱ء

ہوا کرتا تھا اور اس زمانہ میں ضرورت نیابت کی نہ رہی تھی۔ لہذا یہ عہدۂ قدیم محض بار ناجائز ریاست پر رہ گیا۔ مولوی مشتاق حسین نے چھیڑ چھاڑ اس کی حضور پرنور سے شروع کردی تھی۔ اور رزیڈنٹ کو بھی ہموار کر لیا تھا۔ راجہ کشن پرشاد کہ جن کا مفصل حال اپنے مقام پر درج کیا جائے گا۔ مثل ایک معمولی درباری کے افسر جنگ اور محبوب یار جنگ وغیرہ کے پاس بیٹھنا غنیمت سمجھتے تھے تاکہ حضور پرنور کا سلام میسر آجائے اُن کے مصاحب خاص میاں اٹھل پرشاد میرے غریب خانہ پر آکر اپنے مصائب بامید استمداد بیان کیا کرتے تھے اور میں ان کو یہ شعر سنا دیا کرتا تھا ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

اس وزارت نے وزارت پناہ کے گھر کو بھی تاکا تھا۔ مگر یہ جانتے تھے کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے لیکر انگلستان کے خواص و عام تک طرفدار اس گھر کے ہیں۔ پس یہ رائے قرار پائی کہ خود الگ رہکر ایک انگریز سے فیصلہ اس کا کرا دیجئے۔ چنانچہ کپتان جو کلرک ناظم و منتظم سالار جنگ اسٹیٹ کے مقرر ہوئے اور جو روش انہوں نے اس خاندان سے رکھی اسے شیدی عنبر اور محلات وزارت سے پوچھا جائے۔ البتہ سالانہ رپورٹ و ہوم وہام کی ملاحظۂ اقدس میں اور رزیڈنٹ کے پاس داخل ہوا کرتی تھی کبھی وزرائے کو چاک یا اہلکاران

لہ سچ یہ ہے کہ خود نواب آسمان جاہ کہ امیر ابن امیر مثل اپنے ہم عصر امراء کے زینت ریاست کے تھے اپنے مشیروں سے مجبور تھے۔ خزانۂ ریاست کو تو نواب صاحب نے بربادی سے محفوظ رکھا مگر دیگر معاملات میں اپنے مشیروں کے اس قدر زیر اثر رہے کہ بالآخر بے گناہ خود برباد ہوئے۔ جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

ریاست درِ دولت وزارت پر حاضر اور پرساں حالات یکساں نہوئے گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب پشت بہ پشت نمک پروردۂ امرائے پائیگاہ تھے اور وزارت پناہ سے کوئی تعلق ہی نہ تھا صرف ایک نیم یوروپین دائی مسز بوریلین نامی یتیم صاحبزادہ[1] پر متقرر کردی گئی تھی یہ نیک بخت اور شیدی عنبر اور سید ابو تراب عرف عبدالرحمن چچا زینب بیگم محل مبارک نواب[2] وزیر میرے پاس آکر فریاد و فغاں کیا کرتے تھے۔ زینب بیگم کا نکاح نواب وزیر سے میرے مشورہ سے ہوا تھا اور وہ مجھ کو چچا کہتی تھیں۔ نواب وقارالامرائنے دامن نواب آسمان جاہ کا پکڑ لیا تھا اور صلاح و مشورہ انتظام ریاست میں شریک ہو کر دست بُردِ اغیار سے محفوظ بلکہ امیدوار عہدہ وزارت ہوگئے تھے۔ نواب امیر کبیر کی وجاہت اور رعب و داب ایسا تھا کہ ان کے نام سے یہ حضرات تھرا اُٹھتے تھے اور بجز اس کے کہ ہر وقت حضور پر نور اور رزیڈنٹ کو ان سے بدگمان رکھیں اور قدم آگے نہ بڑھا سکتے تھے۔

آخر اہل بلدہ اور مخالفین وزارت اس جابرانہ حکومت کی برداشت نہ کرسکے بقول مومن خاں مومن ؎

آخر طپش اس آتشِ خاموش میں آئی
جاں گرمیِ غیرت سے غضب جوش میں آئی

نواب مہدی علی خاں منیر نواز جنگ محسن الملک ایسے آدمی نہ تھے کہ دبی بلی بن کر چوہوں سے کان کترواتے۔ اب اخباروں میں لمبے چوڑے آرٹیکل (مضامین) نکلنے شروع ہوئے

---

[1] نواب یوسف علی خاں سالار جنگ، حال۔

[2] نواب لائق علی خاں سالار جنگ ثانی۔

وزراے کو چک آگ بگولا ہو گئے لطف یہ کہ مسٹر گریل وغیرہ جو منشی اس انشا پردازی کے تھے وہ ادھر محسن الملک بہادر کے فریق سے بھی سازش رکھتے تھے اور ادھر وزیرین سے بھی ملتے رہتے تھے۔ وزیرین نے شبہ نواب امیر کبیر پر کیا اور بڑی داد فریاد حضور پرنور اور رزیڈنٹ کے پاس مچائی بلکہ مجھ خانہ نشیں کی طرف بھی نگاہ قہر آمیز ڈالی۔ ایک روز میں پرانی حویلی میں حاضر تھا اور منجھلے وزیر یعنی مولوی مشتاق حسین بھی کچھ ضروری کاغذات دربغل موجود تھے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اب تو خوب اخبار نویسی کی مشق ہو رہی ہے آج کی باریابی میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ خطاب غیر کی طرف ہے تو چشم ماروشن دلِ ماشاد۔ اگر میری طرف ہے تو آپ کے دماغ میں خلل ہو گیا ہے ؎

بیا تا چہ داری زمردی نشاں
کمانِ کیانی و گرزِ گراں

میں وہ نوالہ ہوں کہ آدمی کے حلق میں اٹک جایا کرتا ہوں۔ مولانا تو یہ سنکر چپ رہ گئے مگر نواب وقار الامرا بہادر کو طیش آگیا اور فرمایا بہت اچھا دیکھ لیا جائے گا۔
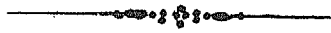
ہیرے کا مقدمہ اور لیڈی وقار نواز کا معاملہ

اب سنئے کہ امپریل ڈائمنڈ (ہیرے) کا مقدمہ کھڑا ہو گیا اور اس قدر طول اس کو ہوا کہ تمام ہندوستان میں اس کا غل مچ گیا اور یعقوب[1] بیگ صابونچی مدعا علیہ نے حضور پرنور کی شہادت اس غرض سے طلب کرائی کہ نہ شہادت پیش ہوگی نہ مقدمہ کو طول ہوگا۔ مگر مولوی مشتاق حسین خان بہادر وقار الملک اپنی ضد پر قائم رہے اور سر ڈنس[2] کو ہموار کر کے آخر حضور پرنور کو کمیشن میں طلب کرا کے اظہار ان کا قلم بند کرا دیا۔ مسٹر وڈرف ایک مشہور بیرسٹر علامۂ دہر نے خوب جرح میں حضور پرنور کو پریشان کیا اور سر ڈنس کے تو پرخچے اڑا دیئے۔ مگر مقدمہ چلتا رہا۔ پیچیدگیاں پڑتی رہیں۔ ادھر حضور پرنور اس مقدمہ کی وجہ سے پریشان تھے اور ادھر مخالفین وزارت نے نیا گل کھلایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نواب محسن الملک نے سفر ولایت اختیار کیا اور وہاں اپنی لیاقت اور ہوشیاری سے وہ رشد حاصل کیا کہ مسٹر گلاڈسٹون ان کو اپنا ہمسر اسٹیٹسمین (Slalesmen) یعنی وزیر باتدبیر سمجھ کر کمال اشتیاق سے ملے اور دونوں مدبروں کی گہری چھنی۔ وزیر کو چاپ مہدی حسن خاں فتح نواز جنگ بھی مع اپنی میم صاحبہ انگلینڈ پہونچے یہ بھی گھس بیٹھ کے فن میں مولانا سے کم نہ تھے اور بحیثیت وزیر ریاست حیدرآباد بی وزیرن کو ملکۂ[3] معظمہ کے دربار ڈربار میں پیش کرا دیا اور خود ناڑھی[4] بیرسٹر بن گئے۔ اب کچھ نہ پوچھئے

---

[1] جیکب ۱۲ [2] سر ڈنس فٹز پاٹرک ۱۲ [3] ملکہ وکٹوریا ۱۲

[4] اس خیال سے کہ مہدی حسن رکن ریاست کے ہیں ان کو اعزازی سند بارسٹری کی دی گئی تھی جس کی بنا پر انھوں نے خدمت سے علیحدہ ہونے کے بعد لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی تھی۔ مہدی حسن سے بڑی غلطی بلکہ گستاخی یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی منھ بولی بیوی کو جو گم نام بلکہ مشتبہ رویہ کی تھی ملکۂ معظمہ کے دربار ڈربار میں پیش کیا ۱۲

جو تیور ان حضرات کے ہوئے۔ مثل مشہور ہے کہ کانی چڑیا کو ایک موتی ہاتھ لگ گیا وہ آنکھ میں رکھ کر پکاری "جو میرے ہے سو راجہ کے نہیں" وزیر اعظم نے اپنے تمام اقتدارات اپنے ان مشیروں کو عطا کر دیئے۔ اہل بلدہ سیدھے سادے ان میں تو قابلیتِ سازش تھی نہیں صرف مسجدوں میں پانچوں وقت کی نماز یا دعائیں مانگا کرتے تھے۔ البتہ پردیسی لوگ کمر باندھکر مستعد ہو گئے۔ ان میں محسن الملک کے گروہ نے پیش قدمی کی چنانچہ محمد صدیق صاحب انجنیر اور سید علی صاحب بلگرامی اور محسن الملک بہادران تینوں نے اس خوبصورتی کے ساتھ کام کیا کہ وزارت کا کام ہی تمام کر دیا۔ ایک شخص متھرا نامی بنگالی مفلوک الحال ان کے ہاتھ لگ گیا اُس سے ایک رسالہ نواب فتح نواز جنگ[1] اور ان کی میم کی بابت چھپوا دیا جس میں ان دونوں کے اوائل عمر کے پوست کندہ حالات درج کئے اور یہ جرأت اس واسطے ہوئی کہ سر ڈنس کی جگہ مسٹر پلاؤڈن جو طبیعت میں سر ڈنس فٹز پاٹرک کے بالکل برعکس تھے رزیڈنٹ ہو کر آئے۔ چوں کہ صرف راقم اور سید حسین صاحب ان مسماۃ کے حالات سے واقف تھے اور سید صاحب پورے حامی و مددگار وزارت کے تھے لہذا طویلہ کی بلا بندر کے سر۔ میری طرف شبہ قائم کیا گیا۔ میں کسی کام کو ریلوے اسٹیشن پر گیا تھا وہاں میں نے سُنا کہ اس قسم کا رسالہ شائع ہوا ہے اور رزیڈنٹ نے اس بنا پہ باز پرس کی ہے کہ اس عورت نے دربار ملکہ معظمہ کی ہتک کی ہے۔ لہذا فتح نواز جنگ کو لازم ہے کہ اس رسالہ کی تکذیب میں ثبوت پیش کریں۔ تیسرے چوتھے روز مولوی میر اقبال علی رکن گروہ وزارت میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ وقار الملک اور فتح نواز جنگ کا حکم ہے کہ آپ کو ہم اپنا گواہ برائے تکذیب رسالہ پیش کریں۔ آپ اس کی تکذیب کیجئے ورنہ تو دانی و کارِ تو

---

[1] عدالت العالیہ کے رکن ہو گئے تھے ۱۲

میں نے جواب دیا کہ ؎

ہر بلائے کز آسماں آید   گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد   خانۂ انوری کجا باشد

میری طرف سے ان دونوں وزرائے شاہ منزلت کی خدمت میں عرض کرنا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ رسالہ کب شائع ہوا اور کون اس پاجیانہ امر کا مرتکب ہوا۔ میں گوشہ نشین آدمی ہوں نہ مجھ کو اس کی تصدیق سے بحث نہ تکذیب سے اگر مجھکو ستاؤ گے تو انشاء اللہ تعالیٰ موںھ کی کھاؤ گے۔ میر اقبال علی کے بعد وزیر اعظم نے مجھکو طلب کیا میں بے خوف ان کے دربار میں حاضر ہوا۔ اوّل مولوی مشتاق حسین صاحب نے علٰحدہ مجھ سے گفتگو کی اور بہت دھمکایا ڈرایا میں نے جواب دیا کہ ؎

تو جنگِ دلیراں کجا دیدہ
ہمیں خویشتن را پسندیدہ

مجھ گوشہ نشین کو نہ ستائیے ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔ اس کے بعد وہ مجھکو اندر کمرے میں وزیر اعظم کے پاس لے گئے اور کچھ اشارہ ان سے کیا جو میں نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا۔ وزیر اعظم نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتح نواز جنگ کی زوجہ سے واقف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے نہ پوچھئے۔ اس ریاست میں اکثر حضرات لکھنؤ اور اودھ کے ملازم ہیں ان کا علم اور بیان کافی ہوسکتا ہے۔ تیور بدل کر فرمایا کہ آپ کو بیان کرنا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر بجبر مجھ سے دریافت فرمایا جاتا ہے تو سُنئے اس کا نام مس ڈانالی تھا۔ اور اگرچہ میں محفوظ رہا مگر میرے ہم درس و ہم مکتب اس کے حالات سے واقف ہیں۔ میرے اس جواب پر مولانا نے آستینیں چڑھائیں اور نواب صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور دونوں وزیر اعظم اور مولانا نے

ارشاد فرمایا کہ معلوم ہوا کہ آپ ہی اس رسالہ کے مصنف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہ میں اس کا مصنف نہ مجھکو اس کی اشاعت کا علم اور نہ مجھکو یہ معلوم کہ اس کے مصنف کون ہیں مگر ایک بات میں جانتا ہوں اگر میری گستاخی معاف ہو اور قابلِ گردن زدن نہ سمجھا جاؤں تو محض آپ کی سچی خیر خواہی کی غرض سے عرض کردوں۔ فرمایا وہ کیا امر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ مقدمہ چلایا گیا اور میں بجبر پیش کیا گیا تو یہ وزارت قائم نہ رہے گی۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور سلام کرکے باہر چلا آیا۔ مولانا بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آئے اور فرمایا کہ آپنے اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری پھیرلی۔ میں نے یہ شعر ان کو سنایا ؎

قریب ہے یار و روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اور سلام علیک کرکے نہایت متردد اور پریشان گھر واپس آیا۔ اس شب کو میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک زرنگار گاڑی اور نہایت خوب صورت و بلند قد جوڑی پر سوار مع ایک اپنے ملاقاتی کے مولوی مشتاق حسین کے مکان پر گیا ہوں اور مولانا میلے کپڑے در بر اور میلی کچیلی پگڑی بر سر بہت سے کاغذات در بغل میری گاڑی کے پاس آئے اور وہ کاغذات میرے سپرد کر دیئے پھر وہ گاڑی اور جوڑی مجھسے کر اڑی اور نہایت بلند ہو گئی۔ اور بلندی پر پہنچکر ہاتھی ہو گئی اور وہ ہاتھی گویا ہوا پر پرّاں مجھکو جزیرۂ سیلون لے گیا اور وہاں کے بڑے ہوٹل کی مہز پر اترا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یہ خواب حضرت پیر[1] و مرشد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دوسرے روز بیان کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تم کو یہ خواب مبارک فرمائے اور انجام بخیر ہو۔ اس وقت میں حضرت کے ارشاد کے معنی نہیں سمجھا مگر اجمیر شریف میں مجھکو ایک بزرگ

---

[1] حضرت سید محمد بادشاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۲

اس کے معنی سمجھائے۔

خلاصہ ایں کہ دوسرے روز تحریری حکم وزارت مجھکو پہونچا کہ فوراً میں اپنا بیان لکھکر داخل کروں۔ اب میں نے خیال کیا کہ تمھاری پوری شامت آگئی۔ مجبوراً کمر بستہ دستار بسر در دولت فلک رفعت شاہی پر پہونچا۔ عجب اتفاق ہوا کہ میری اطلاع ہوتے ہی خود بدولت واقبال برآمد ہو گئے اور اپنے کمرہ نشست گاہ میں فوراً مجھکو یاد فرمالیا۔ میں چہرۂ مبارک دیکھکر دنگ رہ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں چہرہ بالکل سفید جس میں ایک بوند بھی خون کی نہ تھی آواز سے کمال درجہ کمزوری عیاں تھی میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری پرسش مزاج کے جواب میں فرمایا کہ اپنا حال تم سے کہوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کیوں حاضر ہوئے ہیں تو تم کو خود بلانے والا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور کی یہ حالت ہے تو میں اپنا حالِ زار کیا عرض کروں فرمایا مضائقہ نہیں۔ میں بھی تو اپنی رام کہانی کہنے والا ہوں۔ میں نے کل حالات مفصل عرض کر دیئے اور وہ حکم نامہ بھی پیش کر دیا۔ فرمایا آپ کو تو ڈیوڑھی مبارک اور مجھ سے تعلق ہے۔ آسماں جاہ کو کیا حق تھا کہ بے میری اطلاع و اجازت آپ سے پیام و سلام کرتے۔ میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔" یہ فرما کر عرضداشت وزیر اعظم کی بقلم مولانا مشتاق حسین خاں صاحب میز پر سے اٹھا کر مجھکو عنایت کی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ سرور جنگ پر مقدمہ قائم کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے جو واقعات آپ کو معلوم ہیں بے تکلف لکھ بھیجئے پھر ارشاد فرمایا کہ اب آپ میری سنئے مشتاق حسین، مہدی حسن اور رزیڈنٹ صاحب نے مجھکو عامۂ خلائق کے سامنے ناحق حقیر کیا زبردستی ایک ادنیٰ ہیرے کے واسطے میرا بیان لکھوایا اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاملہ اب تک چل رہا ہے اس صدمہ نے میرا یہ حال کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو فدوی اس معاملہ کو ختم کر دے۔ اس وقت یعقوب بیگ

صاحبزادہ بھی یہاں آیا ہوا ہے۔ اس کو بلا کر آپ کے قدموں پر گرا دیتا ہوں آپ اس کی خطا معاف فرما دیجئے۔ میرا خزانہ میں داخل کر دیجئے یہ سب مونھ دیکھکر رہ جائیں گے فرمایا جو کچھ کرنا ہو جلدی کر دیجئے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مقدمہ ختم ہو گیا۔ مگر اب وہ مقدمہ شروع ہوا جس نے نہ فقط اس وزارت کو تباہ کیا بلکہ برٹش گورنمنٹ کی قدیم پالسی کو بھی بدل دیا۔ زمانۂ ماضی میں گمان ہوتا ہے کہ حضرت آصف جاہ[1] کے عہد میں وزیر اعظم محض ایک پیش دست ملازم تھا اور رئیس بذات خود مشغول بحل وعقد ریاست تھے مگر رفتہ رفتہ وزیر کو اختیارات انتظامی زیادہ عطا ہوتے گئے۔ میر عالم[2] نے کہ ایران سے تازہ وارد ہوئے تھے اور نہایت عاقل و دانا و دور اندیش تھے فرانسیسیوں سے تعلقات قطع کر کے انگریزوں سے دوستی و آشتی کا راستہ قائم کیا اور باہم معاہدات ہمسرانہ تحریر کئے گئے[3]۔ راجہ چندو لال کہ در اصل دیوان یعنی وزیر کے پیش دست تھے

---

[1] حضرت آصف جاہ اول تاریخ پیدائش ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ و تاریخ وفات ۴ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ ہجری ۱۲

[2] مدار المہام ۴ ربیع الثانی ۱۲۱۹ھ ۱۲

[3] اس زمانہ میں چوں کہ اقوام یورپ کے حالات معلوم نہ تھے میر عالم سے یہ غلطی ہوئی کہ صدر صوبہ دار ہند سے ہمسرانہ عہدنامہ کئے۔ اگر یورپ کے طرز عمل یعنی پالسی و ڈپلومیسی وغیرہ الفاظ سے آگہی ہوتی تو میر عالم براہ راست اس وقت دولت برطانیہ سے ہمسرانہ معاہدات کر لیتے اور صدر صوبہ دار سے کوئی تعلق نہ رہتا صرف ایک نگراں نظام کی طرف سے کلکتہ میں بطور قونصل اور ایسا ہی عہدہ دار صوبہ دار کی طرف سے حیدرآباد میں مقیم رہتا۔ اور دونوں میں سفیر حیدرآباد انگلینڈ میں اور انگریزی سفارت حیدرآباد میں قائم ہوتی بجائے اس کے میر عالم سفیر اور وکیل کے لقب سے صوبہ دار کے پاس بھیجے گئے۔ مگر حق یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی بالادستی اس ریاست کے واسطے موجب بقا ثابت ہوئی۔ بس حالی کا یہ طریقہ باہمی مقام شکر ہے نہ محل شکایت اور اگر یہی طریقہ بصدق نیت قائم رہا تو ہر طرح بہبودی ریاست متصور ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بقول کپتان کلارک گزشتہ زمانہ میں تعلیم یافتہ شریف زادے ہندوستان میں برائے انتظام مملکت بھیجے جاتے تھے خود شریف بھی تھے شرافت پسند بھی اور شریف نواز بھی اس قدیم قاعدہ کو ڈزریلی نے اس طرح مضبوط تر کر دیا تھا کہ بادشاہ انگلینڈ کو شہنشاہ ہند خطاب دے کر صوبہ داری ہند کو صرف امرائے عظام کے واسطے مخصوص کر دیا اور باوجودیکہ مسٹر گلاڈسٹون جمہوری خیال کے پابند تھے مگر وہ بھی اس قاعدہ کے پابند رہے اور اب حالت کچھ اور ہے ۱۲

اور بہت ہوشیار و چالاک تھے دیوان کو فقط شطرنج کا فرزیں بنا کر خود پیش دست رئیس کے ہو گئے گو ملقب بلقب پیشکار رہے مگر حل و عقد ریاست کل اپنے ہاتھ میں لے لیا اور علاوہ سبسڈیری فوج کی جو حسب معاہدہ بلارم میں قائم ہوئی فوج کنٹن جنٹ سکندرآباد میں قائم کی گئی اور ملک برار اس فوج کی تنخواہ و تربیت کے واسطے حوالہ صاحبان انگریز کیا گیا اور انھوں نے راجہ چندولال کو ذریعہ رسل و رسائل اپنے اور رئیس کے درمیان اس طرح بنایا کہ صرف اہم امور میں وائسرائے کا خریطہ بنام رئیس خود رزیڈنٹ بزبان فارسی سر دربار حاضر ہو کر پیش کیا کرتا تھا باقی کل امور انتظامی کی بابت رزیڈنٹ دیوان سے مراسلات کیا کرتا تھا۔ دیوان جو امر لائق گزارش سمجھتا تھا وہ بذریعہ وکیل یا گاہ گاہ بذات خود حضور میں گزارش کرتا تھا۔ ورنہ خود مختارانہ مناسب وقت کاربند ہوتا تھا اور یہاں تک اقتدار حاصل کیا کہ خود بلدۂ حیدرآباد چندولعل کا حیدرآباد مشہور ہو گیا۔ یہ حال حضرت سکندر جاہ کے وقت تک رہا اور گورنمنٹ آف انڈیا کی بھی یہی پالسی قائم ہو گئی کہ دیوان کو ذمہ دار امن و امان ریاست کا سمجھنے لگے۔ البتہ حضرت ناصرالدولہ نے انتظامی امور میں توجہ فرمائی مگر اختیارات دیوان کے جو روز بروز وسیع تر ہوتے گئے تھے وہ اس عہد میں بھی قائم رہے اور انگریزی پالسی بھی مضبوط تر ہوتی گئی۔ چنانچہ جب میر تراب علی خاں سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک جیسا ہوشیار اور سچا خیرخواہ اور دوربین زبان انگریزی و فارسی کا عالم تدبیروں کا واقف کار دیوان ہوا تو گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنی پالسی کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ ہر چند رئیس نے دیوان کو بدلنے کی کوشش حسب مشورہ نواب وقارالامرا رشیدالدین خاں فرمائی مگر گورنمنٹ نے وزارت پناہ کو قائم رکھا۔ بعد انتقال حضرت افضل الدولہ حکومت انتظامی قائم ہوئی اور وزارت پناہ قائم مقام رئیس یعنی ریجنٹ اور نواب امیر کبیر عمدۃ الملک شریک قائم مقام یعنی "کو ریجنٹ" مقرر ہو گئے۔ اس عہد میں مذکورہ پالسی گویا برائے دوام

قائم ہو گئی کچھ تو اس وجہ سے کہ نواب عمدۃ الملک وزارت پناہ کو مثل اپنے فرزند کے سمجھتے تھے
اور کل حل و عقد ریاست بدست مختار دے کر کسی قسم کی مداخلت نہ کرتے تھے گو وزارت پناہ
ان کو اپنا بزرگ سمجھ کر ہر امر کی اطلاع ان کو دیتے رہتے تھے اور کچھ بوجہ تشخص ذاتی وزارت پناہ
کہ انتظام مدن و تدبیر منزل کے فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ہمسر و ہم رتبہ مدبران اقالیم یورپ
تھے۔ الغرض یہ اصول قائم ہو گیا کہ وزیر اعظم ذمہ دار امن و امان اور رئیس محض اہم امور میں
ملک دستخط رہیں بلکہ دستخط کی ضرورت بھی نہ تھی صرف ڈیوڑھی مبارک کے سیاہے میں زبانی
اندراج کافی ہوتا تھا۔ نواب لائق علی خاں تو بوجہ عنایات خاص شاہی اپنے والد وزارت پناہ
سے زیادہ مقتدر اور صاحب اقتدار تھے مگر مابعد وزرا کو بھی خود مختارانہ حکومت کی ہوس ہو گئی
یہ خود مختارانہ حکومت بقول سر رچرڈ میڈ فی الحقیقت تو خلاف اصول سلطنت تھی مگر وزارت پناہ کے
وقت میں نہ فقط مصلحت اس کی مقتضی تھی بلکہ امن و امان قائم رکھنے کے واسطے لابد تھی
اس امر میں مجھ سے اور سر رچرڈ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی قابل سماعت ہے۔ کسی وجہ سے
اس امر کی شہرت عوام و خواص میں ہو گئی تھی کہ وزارت پناہ اپنی دختر خرد کا جو کہ حسن و جمال میں
یکتائے روزگار تھی نکاح حضور پرنور سے کرنا چاہتے ہیں اور اس کی گفتگو بذریعہ تہنیت
یار الدولہ بڑی بیگم صاحبہ یعنی جناب جدۂ حضور پرنور سے ہو رہی تھی اور وزارت پناہ منتظر تھے
کہ پیام نسبت حضرت جدہ کی طرف سے آوے کہ یکایک زمانہ سر رچرڈ میڈ اور نواب رشید الدین
خاں امیر کبیر کا آ گیا اور یہ وہ زمانہ ہے کہ وزارت پناہ پریشان ہو کر اپنی موت مانگنے لگے تھے
میں مطابق معمول سر رچرڈ سے ملنے گیا انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس نکاح کے
بارے میں تمھارا کیا علم ہے۔ میں چوں کہ خالی الذہن تھا جواب دیا کہ اگر یہ نکاح ہو جائے تو
ازیں چہ بہتر۔ یہ سن کر وہ برہم ہوئے کہ کیا پہلے کسی نظام کا نکاح ہوا ہے میں نے جواب دیا کہ

اس کو اس نظر سے دیکھئے کہ اگر آپ کے وقت میں یہ امر ظہور میں آئے تو آپ کی کتنی نام آوری ہوگی۔ وہ بولے "ریاست کا کیا حال ہوگا۔ سر سالار اب با لصفت مختار ریاست ہی پھر بالذات مالک ریاست ہو جائے گا کیا تم چاہتے ہو کہ سالار جنگ نظام بن بیٹھے"۔ میں نے کہا کہ صاحب میں تو ایک ادنیٰ ملازم ہوں میں کیا اور میری خواہش کیا۔ اس پر وہ ایک لکچر دینے لگے اور کہا کہ تمام ریاست کو اس نے برباد کر رکھا ہے پردیسیوں، ہندوستانیوں، مدراسیوں، پارسیوں سے ریاست کو بھر دیا اور اہل بلدہ کہ جن کے وجود پر بقائے ریاست منحصر ہے، وہ سب تباہ اور برباد ہو رہے ہیں۔ یہ قول امیر کبیر اور شاپور جی کا بہت درست ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو ملک داری اور حکمرانی کی لیاقت نہ کبھی تھی اور نہ آئندہ اُمید ہے۔ دو دو تین تین سو برس ان کی سلطنت رہ کر تباہ ہو گئی"۔ ان کی اس عام اعتراض پر میری بھی رگ حمیت حرکت کرنے لگی میں نے جواب دیا کہ "اور یورپ میں کون سی سلطنت ہزار دو ہزار برس قائم رہی قرآن مجید کا ارشاد کیسا سچا ہے: تلک الایام نداولھا بین الناس اگر ناگوار خاطر نہ ہو اور میری گستاخانہ تقریر معاف ہو تو میں چند الفاظ میں اس مسئلہ کو بہ تفصیل گزارش کروں وہ یہ ہے کہ اصول حکمرانی اہل اسلام قدیم مورخین یورپ کو معلوم ہی نہیں ہوئے۔ البتہ خلف نے اس کا علم کچھ کچھ حاصل کیا ہے اور فائدہ اُٹھایا ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان اقوام باہمی جنگ و جدل کے باعث اس فن پر کیا منحصر ہے کل فنون و علوم سے بے بہرہ ہوتے گئے۔ ان اسلامی اصول کی کیا خطا ہے"۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور طعن سے کہا: "وہ کیا اصول ہیں"۔ میں نے کہا کہ "یہ ایک بحث طویل ہے۔ مگر میں ایک مثال تاریخی پیش کرتا ہوں آپ نے اُن یوروپین سیاحوں کی تصانیف پڑھی ہوں گی جو ہمارے عہد سلطنت مغویہ دہلی میں برائے سوداگری ہند میں آئے تھے۔ من جملہ اُن کے ایک فرانسیسی جوہری نے بھی اپنے

سفرِ ہند کے حالات لکھے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جب میں بندر سورت میں اُترا تو اہلکارانِ کروڑ گیری نے مجھکو گھیر لیا اور میرے تمام مال و اسباب و سامان کی ایک فہرست بنا کر مجھکو دی اور مال پر قبضہ کر لیا۔ میں نے اس پر بڑی داد و فریاد کی اس پر اُنھوں نے میری تشفی کے لئے کہا کہ یہ سامان تمھارا ضبط نہیں ہوا بلکہ تم سبکدوش ہو کر جس شہر میں جاؤ وہاں کی کروڑ گیری کے عملہ کو یہ فہرست دکھا دو وہ یہ سب سامان تمھارے حوالے کر دیں گے۔ اس پر بھی میں نے داد فریاد کی اور کہا کہ میں غریب سوداگر ہوں اپنا مال اسباب اپنے طور پر سستی باربرداری پر لے جاؤں گا معلوم نہیں سرکار کیا رقم باربرداری کی مجھ سے طلب کرے وہ بولے یہ کل سامان اسباب یہاں سے دہلی تک پہنچ سرکار جائے گا تم فقط چھتری ہاتھ میں لئے ہوئے سفر و سیاحت کرو۔ فقط کروڑ گیری میں اپنا پتا دیتے رہو۔ راستہ میں جہاں کہیں تم طلب کروگے تمھارا مال مل جائے گا۔ وہاں بیچو کھوچو اور اپنا راستہ لو۔ آپ کی عہد سلطنت میں بھی بقاعدہ انشورنس (Insurance) یعنی بیمہ یہ رعایت موجود ہے مگر چار آنہ فی صدی خواہ غریب ہو یا امیر ادا کرنا پڑتا ہے اور پھر شہری اور سرکاری محصول جدا ہیں اسلامی اصولِ دولتِ عامّہ کا علم اہل یورپ کو ابھی ناقص ہے ؎

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ
اس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے

اس کے بعد بھی اُنھوں نے وزارت پناہ پر حملہ کیا اور کہا کہ سالار جنگ ہرگز نہیں چاہتا کہ نظام بذات خود امور ریاست کو انجام دے وہ تو حکومت پر جان دے رہا ہے۔ میں نے کہا کہ خود گورنمنٹ کی یہی پالیسی ہے۔ کہا کہ تم غلط سمجھے ہو یہ صرف اس وجہ سے کہ کسی نظام میں بذاتہٖ اہلیت حکمرانی کی نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہمارے اس کم سن نظام کو وہ تعلیم دی جاتی

جس سے یہ صلاحیت پیدا ہو جائے"۔ میں نے کہا کہ سکندر جاہ اور ناصر الدولہ پر تو یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اور افضل الدولہ کے وقت میں بدمعاشوں نے شاہ و وزیر میں ہنگامہ برپا کرا دیا۔ اسلامی سلطنت میں دیسی پردیسی ملکی غیر ملکی کے کچھ معنی نہیں ہیں خواہ کسی قوم و ملک کا ہو۔ اگر مسلمان ہے تو برادر دینی ہے اگر غیر مسلم ہے تو ذمّی کے حقوق کا مستحق ہے[1]"۔ جب میں ان سے پیچھا چھوڑا کر باہر آیا تھا تو لیڈی میڈ بیچ کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھیں ان کا اصلی نام مس مالکم تھا اور وزارت پناہ کے عم بزرگوار نے کہ سوتیلے باپ بھی تھے وزارت پناہ کی نسبت ان مس صاحبہ سے کی تھی مجھکو مجبوراً لیڈی میڈ کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اُنھوں نے بھی وزارت پناہ کی شکایت شروع کی اور کہا دیکھو امیر کبیر بہادر جب یہاں آتے ہیں تو اپنے اہل جلوس کے ہمراہیوں کو پھاٹک کے باہر چھوڑ آتے ہیں اور سالار جنگ جب آتا ہے تو کھڑ کھڑ ڈھب ڈھب غل و شور گرد و غبار سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

الغرض سر آسمان جاہ کو جب خلعت وزارت عطا ہوا تو وہ بھی حکومت خود مختاری کی ہوس میں مبتلا تھے۔ نواب صاحب نہایت خاموش اور کم گو لکھے پڑھے نہ تھے مگر کمال درجہ کے صاحب وقار و تمکین اور بارعب و داب اور سوائے خاص مصاحبین اور اہل خلوت کے کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے بے تکلفانہ گفتگو کرے۔ جو قواعد و مراسم دربار اپنے چچا عمدۃ الملک اور وزارت پناہ کے دیکھے ہوئے تھے اُن کے نہایت پابند تھے۔ سوائے ازیں کہ ان کے اجداد ہمیشہ دستار بر سر خلوت و جلوت میں لوگوں سے ملتے تھے مگر یہ بعد

---

[1] فی الحقیقت یہ بحث ملکی اور غیر ملکی کی اہل مدراس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ نواب سالار جنگ اول کو اس فرق سے شدید نفرت تھی۔ اسی فرق بے معنی کی وجہ سے ریاست بہترین آدمیوں کی خدمات سے محروم رہی اور ترقی نہ کر سکی ۱۲

سفر ولایت اس رسم کے پابند نہیں رہے اور ایک سادی ٹوپی کسی ریشم کے کپڑے کی گول
برسر اور شیروانی دربر دربار وغیرہ دربار میں ملاقات کرتے تھے۔ یہ عجب اس ریاست کی
قسمت نکلی کہ بعد انتقال نواب لائق علی خاں کل وزرا ر لیاقت علمی و مادۂ انتظامی نہ ہونے کے
باعث سے محض شطرنج کے وزیر رہ گئے اور کل حل و عقد ریاست بدست معتمدین چھوڑ دیا۔
سر آسمان جاہ میں ایک خوبی صرف اس قدر تھی کہ سوائے اپنے خاص مشیروں کے دوسرے
عہدہ دار یا معتمدین وغیرہ کسی کو جرأت دخل در معقولات کی نہ دیتے تھے۔ دوسری صفت ان وزیرؔ
دیگر امرائے عظام میں یہ تھی کہ حضور پر نور کے سچے خیرخواہ اور واقعی جاں نثار تھے اور کبھی
ان کے ذہن و دماغ میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ اپنے علاقہ جات کو بامداد گورنمنٹ جدا کرا کے مختار
ہو جائیں۔ بلکہ اپنی بقا ریاست کی بقا پر منحصر سمجھتے تھے۔ حیدرآباد جو انٹریگ و سازش کے باعث
بدنام ہوا اس میں مطلق ان اُمرا کی شرکت نہ تھی۔ یہ بلید الذہن[1] سادہ لوح اپنے اپنے معاملات خانہ داری
اور روزمرہ کی زندگی میں دوسروں کے محتاج تھے۔

---

[1] چوں کہ ان امرا نے سالار جنگ اوّل۔ عمدۃ الملک جیسے اولوالعزم انسانوں کی صحبت میں پرورش
اور تربیت پائی تھی باوجود علم اور تجربہ کی بے بضاعتی کے اپنے بادشاہ اور ریاست اور خود اپنے خاندانی وقار
اور نام کا از حد پاس اور خیال رکھتے تھے ۱۲

مجھ پر پمفلٹ کا مقدمہ

القصہ وزرائے کو چک نے اپنی زور حکومت کے نشے میں حضور پرنور کو ہیرے کے مقدمہ میں ایسا پریشان کیا کہ وہ اپنے بے گناہ وزیر سے بد دل اور بدظن ہو گئے۔ دوسری طرف ایک گروہ عہدہ داران کا اپنی مخالفت میں ایسا کھڑا کیا جو نہایت ذی علم و ذی لیاقت سرد و گرم زمانہ دیدہ رنج و راحت عالم چشیدہ کسی کام میں نیک و بد صدق و کذب کی پروا نہ کرتے تھے ع

نہ جو "دع ما کدر" جانیں نہ جو "خذ ما صفی" سمجھیں

اب ان حضرات نے ایک نہایت نازیبا بد اخلاق و بد تہذیب مقدمہ کھڑا کر دیا اور خود تو الگ رہ کر تماشہ دیکھنے لگے اور مجھ خانہ نشین ناکردہ گناہ کو اس میں پھنسا دیا۔ میں اس زمانہ میں کثیر الاولاد صرف اپنی ماہوار تنخواہ پر گزران کر رہا تھا جو کچھ میرے محسن نواب وزارت پناہ نے میرے ساتھ ازراہ قدردانی سلوک کیا تھا وہ سب تعمیر مکان میں صرف کر چکا تھا۔ روپیہ کی مدد تو ایک طرف ان حضرات نے قلمے قدمے بھی میری خانہ نشینی کی حالت میں میری ہمدردی ظاہر نہ کی بلکہ سازش کے نکلنے سے میرے حق میں زیادہ آگ بھڑکاتے رہے اور مشکل یہ پڑی کہ چوں کہ میں اپنا علم تحریری ظاہر کر چکا تھا میرا فرض تھا کہ ایک ایک لفظ کو میں ثابت کر کے اپنی صفائی کروں مگر میری خوش قسمتی سے میرے ایک شاگرد رشید امیر ابن امیر نواب سرفراز حسین خاں فخر الملک بہادر نے بنظر قدردانی اور بخیال خیر خواہی سیاسی میری دستگیری بلا کسی ذاتی غرض کے فرمائی۔ مقدمہ اس طرح شروع ہوا کہ چوں کہ

حضور پُرنور نے مجھ پر مقدمہ قائم کرنا منظور فرمایا لہذا اصل مصنّف یعنی مترا بنگالی پر قائم کیا گیا۔ اور مسٹر لوسانکٹ[1] اول مددگار رزیڈنٹ فیصل کنندہ اس کے مقرر ہوئے۔ کرنل ڈائز[2] اور مسٹر ٹمپلٹن[3] وغیرہ جو موجودہ وزارت کے مخالف تھے انھوں نے مسٹر ایجلو اور مسٹر نارٹن کونسل مدراس کو من جانب مترا بلوایا مگر یہ نہیں معلوم کہ کس کی خواہش سے بلوایا۔ گمان یہ ہے کہ اہل سازش نے ذمہ داری اُن کے اخراجات کی لی ہوگی مگر جب میرا نام مقدمہ میں آیا تو یہ سب حضرات گول ہوگئے گویا کہ اس مقدمہ سے ان کو کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ مسٹر ایجلو اور مسٹر نارٹن میرے پاس آئے میں نے اُن سے کہا کہ مجھ میں اتنی مقدرت نہیں ہے کہ میں تمھاری فیس اور کل مقدمہ کا بار اُٹھا سکوں۔ یہ ممکن ہے کہ تھوڑی بہت مدد وقتاً فوقتاً میں تم کو دیتا رہوں اور بعد ختم مقدمہ تمھاری کوشش کی معقول قدر دانی بشرط امکان ریاست سے کرادوں گا اگر یہ شرط منظور ہے تو تم مترا کی طرف سے عدالت جانا شروع کردو۔ چنانچہ ان دونوں نے اس شرط کو قبول کرلیا۔ فتح نواز جنگ بہادر فوراً لکھنؤ پہونچے تاکہ وہاں کے امراء اور خوش باش لوگوں سے اپنا حیدرآبادی اقتدار اور وقعت بیان کرکے اور آیندہ فوائد کا امیدوار بناکر حسب مراد گواہی دلوائیں۔ کچھ تعجب نہ تھا کہ لکھنؤ کے امراء خوشامد درآمد سے اور خوش باش لوگ امید آیندہ سے متاثر ہوجاتے

---

[1] یہ گورنمنٹ آف انڈیا میں مختلف پولیٹکل خدمات پر مامور رہے اور اب ریاست بھوپال میں کونسل کے رکن اوّل ہیں۔

[2, 3] یہ دونوں کرنل وغیرہ دیگر انگلو انڈین کے ساتھ ریاست کے سیاسی معاملات میں دخیل رہتے تھے ٹمپلٹن ابتدا اًر نہری - اس رگنگ بانکر کے ایجنٹ کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تھے بعد ازاں اخبار حیدرآباد کرانیکل جاری کیا تھا۔

نواب فخر الملک بہادر

اسی لئے مسٹر نارٹن اور آنجیلو نے مجھ سے کہا کہ اصل کامیابی لکھنؤ میں مقابلہ کرنے پر منحصر ہے لہذا ہمارا وہاں جانا ضرور ہے میں پریشان ہوا کہ یہ خرچ عظیم میں کس طرح برداشت کروں۔ اس حالتِ مایوسی میں نواب فخر الملک بہادر نے میری دستگیری کی اگرچہ حضور پرنور نے بھی میری امداد کا قصد فرمایا تھا مگر میں نے حسب رائے مسٹر پامر بیرسٹر مناسب نہ سمجھا کہ نام نامی و اسم گرامی آنحضرت اس گندے مقدمہ میں شریک[۱] ہو۔ اپنے برادر خورد مرزا ساجد بیگ کو مسٹر نارٹن کے ساتھ روانہ کردیا۔ لکھنؤ میں جس دھوم دھام سے مقدمہ چلا اور مسٹر نارٹن نے اودھم مچایا میں نے سنا ہے کہ اس کی ایک کتاب مثل ناول کسی ظریف الطبع نے تالیف کی۔ خلاصہ یہ کہ فتح نواز جنگ کو پوری شکست لکھنؤ میں ملی اور ہمارے اصحاب خوش و خرّم عمدہ ثبوت کے ساتھ واپس آئے۔ اب صفائی کے گواہ پیش ہونے شروع ہوئے۔ میں نے دو تین گواہ لکھنؤ سے طلب کرکے پیش کئے۔ اسی اثنا میں میں مسٹر پلاؤڈن سے ملنے گیا۔ یہ پہلی ملاقات میری ان زو و غضب رزیڈنٹ سے تھی جو در اصل اس ہنگامہ آرائی کے ذمہ دار تھے مگر مجھ سے نہایت اخلاق کے ساتھ ملے۔ اور حالات مقدمہ سن کر میرے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی اور اپنی خاص مہربانی کا امید وار کیا اور اشارةً وزیر اعظم اور بالخصوص وزرائے کو چک سے اپنی ناراضگی ظاہر کی۔

حضور میں حاضر باشی اور تدوین قوانین

ادھر تو مقدمہ دھوم سے چل رہا تھا اور ادھر حضور پرنور نے مجھ کو شب و روز

---

[۱] راجہ کشن پرشاد کہ اُس وقت مدار المہام تھے چھ ہزار روپیہ سے اس مقدمہ میں انھوں نے بھی امداد کا اقرار فرمایا تھا۔

حاضر باشی کا حکم فرمایا اور کُل عرضداشتیں جو وقتاً فوقتاً وزرائے کو چاک بہ دستخط وزیر اعظم بھیجا کرتے تھے مجھ ناچیز کے سپرد فرما کر اُن کے مضار و مفاد کی تنقیح کا حکم دیا اور اب احکام شاہی بردّ و قدح جاری ہونے شروع ہو گئے۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت بدولت واقبال نے قصد مصمّم کل حل و عقد اپنے دست مبارک میں لینے کا کر لیا اور نواب امیر کبیر سر خورشید جاہ بھی آنحضرت کو رائے دینے میں مستعد ہو گئے۔ نواب فخر الملک نے بھی مثل نواب امیر کبیر بہادر بہ خلوص نیت معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب وہ زمانہ آگیا کہ قانونچہ مبارک کے تالیف کرنے کی ضرورت پڑی اور مجھ ناچیز ہیچمدان کو حکم دیا کہ ایک نظام سیاسی (Constitution) (کانسٹی ٹیوشن) ریاست کا بہت جلد مرتب کیا جائے تاکہ آیندہ کوئی از وزیر اعظم تا ادنیٰ عہدہ دار اپنے فرائض منصبی کو سمجھ کر دائرہ محدود سے قدم باہر نہ نکال سکے اور یہ ساز باز جو بعد انتقال وزارت پناہ جائے گیر ہوا ہے اس کا سدّباب کیا جائے اس وقت مجھ کو وہ گفتگو یاد آئی جو وزارت پناہ سے ایک بار اس باب میں ہوئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ نے جو اپنے تئیں ریاست کی بڑی بہو کہتے تھے اور ڈیوڑھی مبارک کے ہر کام میں دخیل تھے ایک کارخانہ برائے ساخت اوزار اور ہتیار جاری کیا اور استادان فن کو بہ تلاش و جستجو جمع کیا اور چند نمونے بندوق اور تلوار وغیرہ کے وزارت پناہ کے سامنے پیش کئے لیکن چونکہ

سلہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں اہل سازش نے حضور پُر نور کی ذات مبارک پر بھی حملہ شروع کر دیا تھا اور گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ باور کرانا چاہا تھا کہ حضور پُر نور امور جہانبانی سے بالکل غافل محل میں عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ ان کو اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کے دوبارہ حاصل کرنے میں پاس نمک کا بھی خیال نہ رہا لیس [illegible] نے حضور پر نور کو مشورہ دیا کہ وہ سلطنت کی نظم و نسق کی اصلاح اور استحکام کی طرف توجہ فرمائیں تاہم بے سر و پا خود غرضانہ حملے خود ہی بے بنیاد ثابت ہوئے

اس دور میں جاسوسی اور مخبری کا زور ہے اور دیسی ریاستوں میں خود رؤسا تک اس کے دائرے سے محفوظ نہیں ہیں۔ مخبروں نے اس کارخانہ کی اطلاع سرپرچرڈ کو کر دی کارخانہ تو بند ہو گیا مگر فرد جرائم میں وزارت پناہ کی ایک مد اور بڑھ گئی جس وقت میں وزیر ارسطو فطرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ جب اپنے ہی لوگ ناعاقبت اندیش ہوں اور بدخواہ ریاست بنیں تو غیر سے کیا گلہ ہو سکتا ہے۔ یہ اشارہ نواب امیر کبیر اور ان کے مددگار[1] کی طرف کر کے فرمایا" یہ مضحکہ انگیز بات ہے کہ میں یہ کارخانہ جاری کر کے برٹش گورنمنٹ کے مقابلے کے لئے سامان جنگ تیار کر رہا ہوں۔ ایسے چھوٹے کارخانے میں کیا سامان جنگ تیار ہو سکتا ہے کہ ایک سلطنت عظیم سے مقابلہ کیا جا سکے" میں نے گزارش کی کہ اہل بلدہ تو رزیڈنسی کا راستہ بھی نہیں جانتے اور نہ اُن میں ایسے کاموں کی صلاحیت ہے کسی بیرونی آدمی کا کام معلوم ہوتا ہے فرمایا" کہ بیرونی آدمی ریاست کے ملازم ہیں یا رزیڈنسی سے تعلق رکھتے ہیں اور کیا قوم و ملت میں ہم سے جدا ہیں یا ہمارے فوائد میں ان کا فائدہ شامل نہیں ہے مگر یہ آفت کچھ ہمارے یہاں نہیں ہے شاہ ظل اللہ ایران جس پر خفا ہوتا ہے وہ دوڑ کر روس، جرمن، فرانسیسی و انگریزی سفارت میں پناہ لیتا ہے یا حضرت امیر المومنین خلیفۂ رسول رب العالمین سلطان المعظم جس سے ناراض ہوں خواہ امیر ہو یا غریب سفارت دُوَلِ اغیار میں پناہ گزیں ہوتا ہے نہ عصبیت قوم ان میں ہے نہ حمیتِ ملت حالاں کہ ان ہی دو صفات پر ترقی منحصر ہے ہم اچھے ہماری رفتار گفتار دستار اچھی۔ ہماری زمین ہمارا آسمان ہماری آب و ہوا اچھی یہ عصبیت ہے کہ فرد کو فرد سے گروہ کو گروہ سے ضم کر کے قوم میں یکجہتی و یک دلی پیدا کر دیتی ہے اور حمیت ملت تو وہ شے ہے کہ انسان ذات و مال و اولاد

[1] شاپورجی۔

کچھ اس پر تصدق کر دیتا ہے یہ میں نے مانا کہ ہمارے ہاں یہود و ہنود و عیسائی و پارسی مختلف ملل وادیان کے لوگ بستے ہیں مگر یہ ممکن ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہ کر عصبیتِ قوم پر مضبوط رہیں تاکہ اغیار کے دست بُرد سے محفوظ ہو کر اپنے معاملات آپس میں فیصل کر لیا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ تربیت و تہذیب و تعلیمِ قوم حکّام و خواص کے دستِ قدرت میں ہے۔ میری اس عرض پر فرمایا کہ یہی تو وہ امر ہے جس کو میں رو رہا ہوں جو راہ میں اس وقت مجبوراً چل رہا ہوں اس کے نتائج دور و دراز ہیں اور حیاتِ مستعار کا کوئی اعتبار نہیں۔ نہیں معلوم کہ میرے بعد میرا جانشین کیا راستہ اختیار کرے اور اگر میں اپنی دلی آرزو کو قوت سے فعل میں لاؤں تو ایک طرف تو انگریزی شیر میرے سامنے بیٹھا ہوا غرّا رہا ہے دوسری طرف میرے ہمسر اور ہم عمر اور مقتدر ارکانِ ریاست جن کو تم مترقّین و خواص قوم سے نامزد کرتے ہو وہ سدِّراہ ہیں۔ اوّل تو وہ نفس پروری اور خود غرضی میں مبتلا ہیں اور نظیر برائے عوام بنے ہوئے ہیں دوم جاہلِ مطلق و اُمّی محض فرائضِ انسانی سے ناواقف قوم و ملت کے الفاظ بھی اُن کی لغت میں نہیں ہیں۔ سوم تم خود دیکھتے ہو کہ میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور میرے ذہن میں کوئی تدبیر ایسی نہیں ہے کہ ان کو راہِ راست پر لاؤں بجز اس کہ جب حضور پر نور اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے عنانِ سلطنت اپنے دستِ مبارک میں لیں اور میں بھی زندہ رہوں تو اپنے دل کی ہوس نکالوں میں نے عرض کیا کہ کسی کا قول ہے کہ ؎

در طلب سے کوشم ار بایم زہے عز و شرف
ورنہ یابم سعی من افتد بزرگاں را پسند

فرمایا سعی تو میں کر رہا ہوں جب میں نے دیکھا کہ قوم کی تہذیب میری دست قدرت
سے باہر ہے تو میں نے ملک کے امن وامان اور ظاہری انتظام ترقی محاصل و تہذیب
دفاتر و محکمہ جات مثل مال و عدالت و کوتوالی وغیرہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔
اس کے بعد فرمایا کہ اس کام کے واسطے مجھ کو دو آدمی تجربہ کار اور میرے بہت ہی
خیر خواہ ملے ہیں۔ ہر انتظامی نقشہ جو تم دیکھتے ہو ان ہی دو کا جمایا ہوا ہے۔ ایک
مولوی مؤید الدین[1] خاں دہلوی دوسرا (میں نام بھول گیا شاید پسٹن جی) فلاں پارسی اور
ان کے ساتھ برائے اطمینان اہل بلدہ وعیب جویان مولوی احمد علی (فرزند مولوی اکبر علی)
کو شریک کر دیا اور فوجی انتظام یعنی نظم جمعیت مولوی محمود کے سپرد کر دیا سو ایک تو
پنجۂ قضا نے اچک لیا دوسرا استعفا دے کر خانہ نشین ہو گیا۔ دو صاحب قید خانے
میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں نے جو صدر المہامیاں قائم کیں اور ان کم سن لڑکوں
مکرم الدولہ و شہاب جنگ و شمشیر جنگ و بشیر الدولہ کو اپنا شریک بنایا تو میرا یہی
قصد تھا کہ روز مرہ کی کارروائی کا ان کو تجربہ ہو جائے اور میں بفرصت اپنے فرائض
کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ضابطۂ نظم و نسق جس کو انگریزی میں کانسٹی ٹیوشن
(Constitution) کہتے ہیں سلف کے اصول پر اور موجودہ
اغراض کے مطابق تالیف کر دیا جائے جس کی پابندی پر خلف مجبور رہے گو اس
میں چند مشکلیں ہیں اول ایں کہ بادشاہ کم سن اور میں محض قائم مقام ہوں پس میری
تالیف اور صرف میرے دستخط سے اس کا اجرا اگر ہوا بھی تو کہاں تک رعایا برایا پر
تعمیل اس کی فرض ہو گی دوم ایں کہ میں نے مانا کہ اس وقت بھی ایمان دار و صاحب دیانت

---

[1] مولوی امین الدین خاں کے والد۔

اور صادق النیت لوگ مدد دینے والے مجھ کو مل سکتے ہیں مگر کیا وہ سب یک جہت ہوں گے یا محض ملّا و مولوی قال اللہ و قال الرسول پر جھگڑنے والے، آیۃ و حدیث کو معنی پہنانے والے یا اپنے خاص فن کے مدعی بلا دلیل۔ دیگر فنون سے بے بہرہ ہوں گے جامع آدمی کا دستیاب ہونا جستجو و تلاش پر منحصر ہے اور اس کو عمر نوح اور صبر ایوب درکار ہے اور اس وقت دو اہم کام درپیش ہیں ایک ضابطہ نظم و نسق برائے ترقی ملک و استحکام سلطنت دوم تعلیم عصبیت و حمیت اہل ملک یہ ہفت خوان رستم ہے اور رستم فقط ذات بابرکات حضرت بندگان حضور پر نور ہے جو اس ہفت خوان کو طے کر سکتے ہیں یا دوسروں کی تقلید پر نئے نئے دفاتر و محکمہ جات قائم کرنے یا عہدہ داران کا تغیر و تبدل یا حسب ضرورت گشتیات احکام جاری کرنے یا اخراجات روزمرہ میں تخفیف کرنی اس کا نام فن سیاست نہیں ہے مجھ کو اگر سرتی مادھوراؤ یا ٹنیاں کے جنگ بہادر کی طرح دور بیں و اعتدال پسند مدبرین مل جائیں تو سب امیدیں میری بر آئیں مجھ کو ان لوگوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر لیں اور انگلستان میں جا کر غیر ملک و غیر ملّت کے رواج کے مدّاح بن کر ان اصول کو ہمارے ہاں بلا لحاظ مناسبت و پسندیدگی جاری کریں اور اپنی جیب بھر کر ریاست کی سچی خیر خواہی اور ہمارے ساتھ وفاداری سے مستغنی ہو جائیں بڑے بھائی کا جامہ چھوٹے بھائی پر بلا قطع برید کیوں کر ٹھیک آسکتا ہے اور قطع برید کے واسطے مادھوراؤ جیسا کاریگر چاہیے یا نیا جامہ تیار کرنے کو ابوالفضل و ٹوڈرمل درکار ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں تو

سلسلہ ۱-۲ مادھوراؤ ریاست بڑودہ اور راجہ جنگ بہادر نیپال کے نامور اور سالار جنگ اول کے ہم عصر وزیر تھے سر رچرڈ ٹمپل نے اپنی کتاب "انڈیا ان ۱۸۸۰" میں ان دونوں کا حال تحریر کیا ہے۔

سب کچھ کر دوں مگر ندی پار کے شیر کے غرّانے کا میرے پاس کیا علاج ہے
بالخصوص جب کوئی سویلین آجاتا ہے تو مجھ کو نہایت تکلیف ہوجاتی ہے۔

بعد انتقالِ وزارت پناہ مہاراجہ نرندر سے اکثر اس گفتگو کا تذکرہ ہوتا رہا مگر جلّادوں نے ان کو فرصت نہ دی اور بالآخر اُن کا کام تمام کر دیا۔ یہی حال نواب وزیر فرزند وزارت پناہ کا ہوا۔ یہ ایک تازہ نو بہار گلاب کا پھول تھے بارنگ و بو جس کو اہل سازش ظالموں نے توڑ کر پھینک دیا خلاصہ ایں کہ حکم صادر ہوا کہ میں وزارت پناہ اور راجہ نرندر کے خیالات کے مطابق ایک مسودہ لکھ کر ملاحظۂ عالی میں پیش کروں۔ چنانچہ حصّۂ اوّل قانونچۂ مبارک منظور ِاقدس ہو کر واسطے طبع کے بھیجا گیا اُس وقت اتفاقاً ایک[1] میرے مددگار نے بے میری اطلاع ایک معمولی قانونی فقرہ اس میں شامل کر دیا وہ فقرہ گویا جامۂ موار میں کمل کا پیوند معلوم ہونے لگا۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو کل نسخے اس کے چھپ چکے میری یہ غفلت معاف فرمائی جائے۔ یہ بنا اس قانونچۂ مبارک کی ہے[2] اب صرف ایک مشکل درپیش ہوئی وہ یہ کہ بعد وفات وزارت پناہ رزیڈنسی کا دربہ لڑائی کے مرغوں یعنی اہل سازش کے واسطے کھل گیا تھا اور جس نے پہلے رزیڈنٹ کے کانوں پر قبضہ کیا وہی بازی لے جاتا تھا اُس وقت تک تو یہ سب وزرائے کوچک کی توڑ پھوڑ کی طرف متوجہ تھے مگر قانونچۂ مبارک کے بعد سب کی توجہ میری طرف مبذول ہوئی اور آپس میں سرگوشیاں ہوئیں کہ اگر خلاف درآمد قدیم حضور پُرنور نے عنانِ حکومت اپنے دستِ قدرت میں لی اور وزارت کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا تو پھر ہم لوگ تو

---

[1] ایک صاحب جو میری مددگاری کے امیدوار تھے [2] سنہ ۱۳۱۰ھ م سنہ ۱۸۹۲ء

محض شطرنج کے پیادے رہ جائیں گے اور یہ وقار اور اعتبار جو ہم نے انگلینڈ تک حاصل کیا ہے، یہ ظالم سرور جنگ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

مثل تارِ عنکبوت ایک ہی ہاتھ میں نیست و نابود کر دے گا۔ چنانچہ چند یورپین عہدہ دار مثل مسٹر ڈنلاپ کہ مسٹر نیول کے بقول "سفید برہمن" تھے جو انھیں حضرات کی سفارش سے ملازم ریاست ہوئے تھے، وہ بھی شریک رائے اپنے محسنین کے ہوگئے اور چند مفلوک الحال انگریز بھی جو ملازم نہ تھے مگر ان ہی لوگوں کی سخاوت پر گزران کرتے تھے، ان کے ساتھ ہوگئے۔ اب لمبے لمبے مضامین اخباروں میں نکلنے شروع ہوگئے اور رزیڈنٹ پر قدیم پالیسی کے قائم رکھنے کے واسطے زور ڈالا گیا۔ مجھ کو پھر اپنی حفاظت کی فکر کرنی پڑی۔ میری خوش قسمتی سے مسٹر پلاؤڈن کسی خاص وجہ سے مہدی حسن کے مقدمہ مرجوعہ میں میرے طرف دار بن گئے تھے۔ میں نے حضور پرنور کو مشورہ دیا کہ اگرچہ یہ اہلِ سازش کے دام میں آچکے ہیں اور مغلوب الغضب ہیں مگر حضور ان کو اپنا ممنونِ احسان کریں اور ایک خط صدر صوبہ دارِ اقلیم ہند کو لکھ بھیجئے کہ تا تکمیل قانونچۂ مبارک مسٹر پلاؤڈن کا تبادلہ نہ کیا جائے۔ یہ رائے حضور پرنور نے پسند فرمائی اور چند یوم کے واسطے سازشوں کا سدِباب بخوبی ہوگیا تاہم مسٹر پلاؤڈن کے دل میں میری بابت مخالفین کے اقوال نے گھر کر لیا تھا جو بالآخر ظہور میں آیا۔

فی الحال جب کہ ان حضرات نے دیکھا کہ ان کا افسوں مجھ پر کارگر نہ ہوا تو مولوی مہدی علی خاں محسن الملک کو اپنی رائے و مشورہ میں شریک کیا۔ جناب مولانا

نے میرے پاس معمول سے زیادہ آمد و رفت شروع کی اور میرے مکان کے غریبانہ حالات دیکھ کر کہ نہ جھاڑ ہے نہ فانوس، نہ فرنیچر نہ میز، نہ کرسی، نہ کوچ، بہت افسوس و ہمدردی میری کم استطاعتی اور بے بضاعتی پر ظاہر کی اور ہر ملاقات میں میری معمولی حالت پر اور کثرتِ اولاد کی بابت گفتگو کیا کرتے اور افسر جنگ بہادر کی مثال دیا کرتے کہ کس طرح اُنھوں نے اپنی دنیا کو سنبھالا ہے۔

الغرض ایک روز جب کہ میں دردِ نقرس میں مبتلا ایسا فرش تھا کہ کروٹ بھی لینے کی حالت نہ تھی، مرزا غضنفر بیگ جو راز دار مولانا کے تھے میرے پاس آئے اُس وقت مسٹر پالمر بیرسٹر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے مرزا صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں مسٹر پالمر یہ سُن کر باہر جا بیٹھے مرزا صاحب نے اوّل ہر طرف کے دروازہ کمرے کے بند کئے اور میرے پاس بیٹھ کر ایک پوٹلی لال کپڑے میں لپٹی ہوئی جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دی میں نے کہا بھئی یہ کیا معاملہ ہے کہ دروازے بند کئے گئے اور یہ پوٹلی کیسی ہے فرمایا کھول کر دیکھ لیجئے۔ باوجودیکہ میرا ہاتھ قابو میں نہ تھا میں نے بمشکل پوٹلی کھولی اس میں بہت سے گٹھے نوٹوں کے بندھے ہوئے تھے میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُن کی صورت دیکھنے لگا وہ بولے کہ مولانا نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ "آپ کی حماقت حد سے گزر گئی آپ کی حالت سُن کر نواب آسمان جاہ بہادر کو بہت افسوس ہوا اس کو رشوت نہ سمجھئے بلکہ دوستانہ تحفہ سمجھئے اور اپنے بچوں کی تعلیم میں صرف کیجئے نواب صاحب کا یہ عطیہ بے غرضانہ ہے یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی کام آپ سے نکالنا چاہتے ہیں وہ اور آپ اور ہم سب خیر خواہ جاں نثار حضور پُر نور کے ہیں جو راستہ آپ چل رہے

ہیں اگر یہ ریاست کے واسطے بہتر ہی تو ہم سب آپ کے شریک اور معین اور مددگار رہنے کو مستعد ہیں ہم سب کی غرض ایک ہونی چاہیئے اور وہ رئیس و ریاست کی بہتری و خیر خواہی ہے"

وہ تو یہ تقریر اور پند و نصیحت کر رہے تھے اور میرے دل و دماغ کو وہ صدمہ پہونچا کہ فکر و غور کی بھی حالت باقی نہ رہی ایک حالت بیچارگی اور سراسیگی میں چپ لیٹ گیا کہ یکایک امداد غیبی نے میری دستگیری فرمائی اور جناب پیر و مرشد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی توجہ میرے کام آئی یعنی یکایک میرے دل میں القا ہوا کہ یہ نوٹ ہیں دس جگہہ ان کے نمبر لکھے گئے ہوں گے اور ایک شخص غیر اور اجنبی یہ نوٹ لایا ہے اور اس نے میرے ہاتھ میں رکھ دئے اگر میں پھیر دوں تو پہونچنے کا ثبوت تو یاروں کے پاس کامل ہی ہے لیکن پھیرنے کا ثبوت میں کیا دے سکوں گا یہ خیال آتے ہی میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ ذرا گنئے تو کتنے نوٹ ہیں فرمایا ہزار ہزار روپیہ کے اسّی نوٹ ہیں اور یہ کہہ کر مجھ کو دکھاتے گئے اور گنتے گئے اور پوٹلی میں باندھ کر میرے تکیہ کے نیچے رکھ دئے اس کے بعد انھوں نے مجھ کو مبارک باد دی اور کہا کہ اب آپ حضور پُر نور کے پاس ہیں اور مولانا دیوان کے پاس کار ریاست عمدہ طرز پر دونوں کے مشورہ سے چلے گا۔ میں نے جواب دیا کہ مولانا کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ روپیہ تو میں نے رکھ لئے مگر میں ہرگز ہرگز آپ کا ممنون نہیں ہوا میری مدت العمر کی ملازمت میں آپ نے ایسا دھبّہ لگا دیا کہ اس کا دھونا میری قدرت سے باہر ہے اب بسم اللہ آپ تشریف لے جائیے وہ یہ کہتے ہوئے کہ واقعی مولانا کا قول صحیح ہے کہ آپ کا نام دفتر حمقا میں نمبر اوّل پر درج کیا جائے روانہ ہو گئے میں نے پالمر صاحب کو اندر بلا لیا

وہ کوئی درخواست لائے تھے میں نے وہ درخواست اس ہی وقت بھجوادی اور
پھر اُن سے کُل حال بیان کردیا اور پوٹلی بھی دکھادی اُن کا رنگ زرد پڑ گیا اور
کہا کہ مرگِ نو مبارک باد، اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے تم کو تو ہاتھ تک نہ لگانا
تھا اور فرستادہ کو گھر سے باہر نکلوادینا چاہئے تھا میں نے اُن سے اپنا منشا بیان
کیا اور کہا کہ میری حالت ذرا سنبھل جائے تو میں یہ رقم حضور پُر نور کو نذر کردیتا ہوں
وہ میرے بہترین گواہ ہو جائیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ واقعی خوب تمھارا ذہن لڑا
مگر خبردار خبردار ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرو ابھی سوار ہوجاؤ تو بچتے ہو ورنہ پھر خاتمہ
ہے میں نے پالکی کے واسطے حکم دیا پالکی زینہ کے پاس رکھی گئی پالمر صاحب اور میرے
ملازمین مجھ کو پلنگ سے اُٹھا کر زینہ تک لے گئے تھے کہ میں بیہوش ہوگیا مجبوراً پھر مجھ کو
پلنگ پر لٹا دیا اس عرصہ میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی پالمر صاحب نے گھنٹی کا جواب دیا
ادھر سے عابد نے کہا کہ حکم قضا شیم صدور پایا ہے کہ سرور جنگ ابھی فوراً حاضر ہوں
نہایت ضروری کام ہے پالمر صاحب نے کہا کہ سرور جنگ بیہوش پڑے ہوئے ہیں
ہوش میں آتے ہی ان کو اطلاع دی جائے گی خلاصہ یہ کہ جب میں ہوش میں آیا تو
مجھ کو حکم اقدس سنایا گیا میں نے فوراً ٹیلیفون دیا کہ اگر ممکن ہو سکا تو سہ پہر کو حاضر ہوتا
ہوں مگر اس روز جانا نہ ہوا دوسرے روز صبح کو میں نے خیال کیا کہ جس طرح بن سکے یہ
بلا سر سے ٹالو موت اس زندگی سے بہتر ہے۔ الغرض مصری خاں[۱] وغیرہ نے مجھ کو
اٹھا کر پالکی میں ڈال دیا۔ ڈیوڑھی مبارک پہونچ کر ملازمین نے مجھ کو کرسی پر بٹھا دیا
اور وہ کرسی افضل محل میں بندگان عالی کے کمرۂ آفس میں لے جا کر کرسی مبارک کے

---

[۱] نہایت ضعیف العمر پٹھان نظم جمعیت میں ملازم جنگلی گڑھ میں رہا کرتے تھے۔

پاس رکھ دی اس عرصہ میں حضور پُر نور بھی برآمد ہوئے اور میرے حالِ زار کو دیکھکر افسوس فرمایا میں نے عرض کیا کہ فدوی کو خود ضروری امر عرض کرنا ہے لیکن اوّل ارشاد ہو کہ فدوی کو کس امر کے واسطے یاد فرمایا ہے ارشاد ہوا کہ پلاؤڈن صاحب کا خط آیا ہوا ہے کہ کیبنٹ کونسل (Cabinet Council) کے چند جلسوں میں موجود رہنا چاہتے ہیں تاکہ ارکان کو طریق کارروائی اچھی طرح سمجھا دیں۔ یہی فلاں روز کی باریابی میں بھی مابدولت واقبال سے عرض کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو اندیشہ ناک بات ہے۔ فرمایا میں زبانی اُن سے اقرار کر چکا ہوں میں نے عرض کیا کہ اس کے انجام کار پر غور فرمائیے اوّل تو پلاؤڈن صاحب صدر نشین ہی بن کر بیٹھیں گے اور ارکان میں کون لائق علی خاں جیسا دلیر ہے کہ اُن کی رائے سے اختلاف کرے اور پھر جب ان کا دل چاہے چلے آئیں ان کو روک کون سکتا ہے علاوہ اس کے یہ نظیر دوسرے رزیڈنٹ کے واسطے بن جائے گی اور ایک عام غل مچ جائے گا کہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی یہ شہرت آپ کے اور برٹش گورنمنٹ دونوں کے حق میں مضر ہو گی۔ کچھ سوچ کر فرمایا ہاں ٹھیک عرض کرتے ہو چنانچہ یہ امر بھی منجملہ دیگر امور کے باعث ناراضگی مسٹر پلاؤڈن ہوا۔ اس کے بعد میں نے اپنا صندوقچہ منگوایا اور پوٹلی دست بستہ نذر گزرانی فرمایا یہ کیا ہے میں نے عرض کی میری نذر قبول فرمائی جائے اس کو کھول کر ملاحظہ فرمائیے۔ حضور پُر نور اس کو کھول کر نوٹ گننے لگے اور مجھ کو دیکھنے لگے میں نے عرض کیا کہ یہ اسّی ہزار کے نوٹ مجھ کو نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم نے بطور انعام عطا کئے ہیں چونکہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں حضور کی نذر گزرانتا ہوں اور تمام وکمال قصہ میں نے عرض کیا سنتے ہی چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا اور حاجب کو حکم دیا کہ ٹیلیفون دے کر آسمان جاہ کو ابھی بلاؤ میں نے قدم پکڑ لیے

اور عرض کیا کہ میرے حال پر رحم فرمائیے اور میری عرض قبول فرمائیے آسمان جاہ اس وقت فقط وزیر اعظم ہی نہیں ہیں بلکہ رکن اعظم ریاست آصفیہ اور رشتہ دار شاہی ہیں اس وقت اپنی عزت بچانے کے واسطے ان کو دس بیس لاکھ روپیہ خرچ کر دینا بڑی بات نہیں ہے علاوہ اس کے میں تنہا اور ادھر ایک گروہ ذی علم مستعد بکار چست و چالاک آسمان میں پیوند لگانے والے آسمان جاہ کا کچھ نہ بگڑے گا فدوی کی شامت آجائے گی فرمایا پھر کیا کیا جاوے میں نے عرض کیا کہ یہ رقم ایک خاص غرض سے دی گئی ہے یعنی فدوی کوشش کر کے حضور میں اور آسمان جاہ میں اتحاد قائم کرا دے تاکہ وہ خود مختارانہ حکومت پر مثل سابق مامور رہیں اور اجرائے قانونچہ مبارک بے کار ہو جائے۔ فرمایا کہ آسمان جاہ کی خود مختاری گویا اہل کاروں کی خود مختاری ہوئی۔ میں نے کہا بیشک بعد انتقال وزارت پناہ ان ہی حضرات کا زور شور رہا لیکن اگر حضور ایک عنایت نامہ آسمان جاہ کے نام بالفاظ لطف و عنایت تحریر فرما دیں تو اس میں یہ فائدہ ہوگا کہ یہ کل حضرات خواب غفلت میں پڑ کر جو جال مجھ پر ڈالا ہے اس میں خود پھنس جائیں گے۔ ان حضرات کی چال یہ ہے کہ اس خیال سے کہ فدوی نے رشوت قبول کر لی ہے چند روز میں اپنے کل کام حسب دل خواہ فدوی کے ذریعہ سے پختہ کر کے پھر فدوی پر جرم رشوت لگا کر فدوی کا خاتمہ کر دیں اگر حضور بھی یہی راستہ اختیار فرمائیں کہ یہ عنایت نامہ صادر فرما کر اور چند امور ان کے معروضات کے مطابق منظور فرما کر ان کو خواب غفلت میں مبتلا رکھیں تو بہت جلد اپنے کھودے ہوئے کنوئیں میں آپ غرق ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ آسمان جاہ کو تو میں اب نہیں رکھ سکتا میں نے عرض کیا کہ فدوی کے نزدیک تو وہ بے قصور ہیں اور اگر قصوروار بھی ہیں تو

چند روز تامل فرمانے میں کیا ہرج ہے اور فدوی مسٹر بلاؤڈن کو بھی اس راز میں شریک کرنا چاہتا ہے فرمایا کہ ہاں دیکھیے وہ کیا مشورہ دیتے ہیں میں وہاں سے رخصت ہو کر اس ہی حالتِ زار میں رزیڈنسی پہونچا وہ بھی مجھ کو دیکھ کر افسوس کرنے لگے اور کہا کہ ایسی کیا ضرورت تھی کہ تم نے اس حالت میں یہ تکلیف گوارا کی میں نے تمام رام کہانی ان کو بھی سنائی وہ سن کر ایک مرتبہ کرسی پر سے بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ تم نے رقم رکھ لی میں نے کہا کہ بجز اس کے کیا چارہ تھا مگر وہ رقم میں نے حضور میں داخل کر دی تب وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھے اور کہا کہ مجھ کو لازم ہے کہ میں فوراً فارن آفس کو رپورٹ کر دوں اور ہز ہائنس فوراً آسمان جاہ سے جواب طلب کریں میں نے کہا ابھی ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا بلکہ روزمرّہ کی کارروائی ریاست جواب تک ان حضرات کے ہاتھ میں ہے بند ہو جائے گی میرا خیال یہ ہے کہ چند روز بعد کسی ذریعہ سے یہ لوگ خود اپنے پہلو بچا کر مجھ پر رشوت ستانی کی تہمت لگائیں گے اور آپ کو اطلاع دیں گے اس وقت آپ مجھ سے جواب طلب کریں یہ سب حضرات اپنے گسترده جال میں خود پھنس جائیں گے حضورِ پرنور بھی آپ سے مشورہ لینا چاہتے ہیں اگر آپ کل حاضرِ دردولتِ شاہی ہوں تو اس کا تصفیہ ہو جائے میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ کرنل نیول سرعسکرِ فوج باقاعدہ بھی آ گئے اور انھوں نے یہ خبر سنائی کہ مولوی مہدی علی نے ان کو بھی اور ان کے ذریعہ سے مسٹر نارٹن و ایجلو کو بھی رام کرنا چاہا اور معتد بہ رقم کا نام لیا مگر میں نے بھی ان کو صاف جواب دیدیا یہ سن کر اب مسٹر بلاؤڈن جامہ سے باہر ہو گئے اور کہا کہ "بائی جوو" (Jove) ان سب کو پھانسی ملنی چاہیے اور مجھ سے کہا کہ تم جاؤ اور ہز ہائنس سے عرض کرو کہ کل ہی

کی ملاقات میں اس کا تصفیہ ہونا ضرور ہے میں اسی حالتِ زار میں پھر ڈیوڑھی مبارک واپس آیا اور کل حال عرض کرکے مسٹر پلاؤڈن کو کل کی ملاقات کے واسطے لکھ بھیجا۔ بعدازاں اطمینان سے میں گھر واپس آیا دوسرے دن بندگانِ عالی اور رزیڈنٹ کے باہم مشورہ میں یہی رائے قرار پائی کہ فی الحال خاموش رہنا چاہیے۔ حضور پرنور نے عنایت نامہ بالفاظِ مراحم قدیمہ مجھ کو دے دیا میں نے بذریعہ چوبدار وزیر اعظم کے پاس بھجوادیا۔ اب مولوی مہدی علی بھی جو نیم خانہ نشین بنے بیٹھے ہوئے تھے مشیر خاص وزیر اعظم بن گئے اور مجھ پر مناسب اور غیر مناسب فرمائشوں کی بوچھار ہونے لگی میں نے بھی چند معروضات کی منظوریاں حاصل کرکے ان گرگانِ باراں دیدہ کو پورا یقین دلادیا کہ میں یہ رقم ہضم کر بیٹھا ہوں۔ فتح نواز جنگ نے بغلیں بجائیں کہ اب مجھ کو کون نکال سکتا ہے اور بے صبری کی حالت میں یکایک مسٹر پلاؤڈن کو خط لکھ بھیجا کہ سرور جنگ نے رعب ناجائز ڈال کر ایک[1] لاکھ روپیہ سر آسمان جاہ سے وصول کیا ہے۔ مسٹر پلاؤڈن نے شاہ و وزیر دونوں کو بزور تحریر کیا کہ سرور جنگ سے فوراً جواب طلب کیا جائے اور جو لوگ اس شرمناک معاملہ میں شریک ہوں ان کا بھی بیان قلم بند کرکے میرے پاس بھیجا جائے۔ مولوی مہدی علی پریشان حال میرے پاس آئے اور کہا کہ تم صاف انکار کردو میں نے کہا کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں نواب صاحب نے مجھ کو یہ رقم میرے بچوں کی تعلیم کے واسطے عنایت فرمائی میں علانیہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بلکہ لاکھ روپیہ میں سے جو بیس ہزار کم ہیں میں وہ بھی وصول کرنا چاہتا ہوں وہ بولے ایک سیّد کا خونِ ناحق تمھاری گردن پر ہوگا۔ میں کچھ کھا کر سو رہوں گا

---

[1] اسی ہزار کلدار کے ایک لاکھ حالی ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ سیّد تو زمانہ علی مرتضیٰ علیہ السلام کے وقت سے مظلوم اور شہید ہوتے چلے آئے ہیں یہ تو آپ کا ورثہ ہے چشم پُرآب ہوکر کہا کہ تم کو ہنسی سوجھی ہے اور میرا کام تمام ہو رہا ہے میں نے کہا مولانا میں ہرگز انکار نہ کروں گا اور کُل واقعات لکھ بھیجوں گا۔

اُن کے بعد مولوی محمد صدیقؒ رُکن رکین گروہِ مخالف میرے پاس آئے اور کہا کہ تم کو نواب وقارالامرا نے بُلایا ہے میرے ساتھ چلو نواب وزیرِ اعظم بھی موجود ہیں میں نے بذریعہ ٹیلیفون حضورِ پرنور سے اجازت حاصل کی اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں ایک ہنگامۂ رقص و سرود برپا تھا۔ لولیانِ شوخ چشم پری تمثال گروہ گروہ جُوق جُوق اہلِ جلسہ کی تاک میں خراماں خراماں ہر طرف پھر رہی تھیں گویا بزبانِ حال کہہ رہی تھیں کہ[۵]

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

نہیم شہرمہ بیکسو و باہم آویزیم بشوخئے کہ رُخِ اختراں بگردانیم

نواب وقارالامرا مجھ کو ایک کمرہ میں علیحدہ لے گئے اور پوچھا کہ آپ کو کتنے روپیہ مولوی مہدی علی نے دئے۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی مہدی علی نے مجھ کو ایک کوڑی بھی نہیں دی البتہ مرزا غضنفر علی بیگ مختار شاہ عبدالرحیم نے مجھ کو نواب آسمان جاہ کی طرف سے اسّی ہزار کے نوٹ فی نوٹ ہزار روپیہ دئے ہیں۔ اس پر مولوی محمد صدیق نے قہقہہ مارا اور کہا کہ بیس ہزار جناب مولانا کھا گئے۔ میں نے جواب دیا کہ نواب آسمان جاہ بہادر کی فیاضی سے ہر کہ و مہ فائدہ اُٹھا رہا ہے اگر مولوی مہدی علی نے کچھ فائدہ اٹھایا تو کیا تعجب ہے مگر میرا حق مجھ کو ملنا چاہئے جب نواب صاحب کے دفتر میں میرے نام ایک لاکھ درج ہوئے ہیں تو باقی بیس ہزار عنایت

---

[۵] عماد جنگ۔

نواب سر وقار الامراء بہادر

فرمائے جائیں۔ نواب وقار الامرا نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ ہم لوگ بہت کچھ سلوک کرنے والے ہیں لاکھ بیس ہزار کی کیا اصل ہے۔ نواب وقار الامرا اور مولوی محمد صدیق میں قرار پایا کہ بیس ہزار مولوی مہدی علی سے واپس لے کر مجھ کو دئے جائیں اس شرط پر کہ میں مسٹر بلاؤڈن کے جواب میں صاف انکار کردوں اور اس قصہ کو آگے نہ بڑھنے دوں۔ میں نے کہا کہ یہ قصہ تو آپ کے مشیروں نے آگے بڑھا دیا ہے میں اس وقت تک خاموش رہا لیکن اب چوں کہ افشاء راز ہو گیا ہے تو میں ہرگز انکار نہ کروں گا آپ اپنی صفائی جس طرح دل چاہے کر لیجئے۔

یہ سب گفتگو میں نے پھر بوقت باریابی حضور پر نور سے عرض کر دی ارشاد فرمایا کہ آپ کچھ پروا نہ کیجئے اور واقعات لکھ دیجئے میں نے عرض کیا کہ واقعات تو میرے پاس پہلے ہی سے قلمبند ہیں مگر یہ کل بیانات حضور کے پاس داخل ہونے چاہئیں اور حضور ہی اس کا فیصلہ فرمائیں پس حکم اقدس بنام وزیر اعظم شرف صدور پائے کہ وہ اپنے اور دیگر اہلکاروں کے بیانات فلاں تاریخ تک حضور میں داخل کریں اور حضور ان بیانات کی بابت دوستانہ مشورہ مسٹر بلاؤڈن سے لیں۔ ارشاد ہوا ٹھیک ہے آپ احکام بنام سر آسمان جاہ جاری کر دیجئے اس پر جو غدر اہلکاران ریاست میں مچا اس کی تفصیل لکھنی فضول ہے سوائے علامۂ روزگار مولانائے مکرم نواب محسن الملک مہدی علی خاں بہادر کے اور سب کے حواس باختہ ہو گئے لیکن اس شیر بیشۂ فطرت و دانائی نے ایسا جواب لکھا کہ اگر اصل واقعات چند ماہ پیشتر حضور پر نور اور مسٹر بلاؤڈن کو معلوم نہ ہو جاتے تو مجھ کو کہیں منہ دکھانے کو جگہ بھی نہ رہتی۔

لے یہ جواب حیدرآباد میں تو مفید نہ ہوا مگر باہر اس جواب کے باعث وہ بڑے بڑے صاحبان لام حکام
(بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

جواب ان کا مختصر یہ تھا کہ سلف سے امرائے دربار کا دستور یہ ہے کہ رئیس اور بادشاہ کے گرد و نواح کے لوگوں کو امرائے عظام انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں تاکہ اُن کی غمّازی اور بدگوئی سے محفوظ رہیں ورائے ازیں حاضر باشانِ خلوت و جلوت شاہی خود منتظر و متوقع ایسے انعامات کے ہوا کرتے ہیں اور رئیس و بادشاہ کو کوئی اعتراض اس پر نہیں ہوا کرتا پس اس کا نام رشوت نہیں ہوا کرتا اسی طرح کے چند امور اپنی برائت میں تحریر کرکے لکھا کہ سرور جنگ بہادر کو بھی یہ رقم حسبِ دستورِ قدیم دی گئی ہے یہ جواب لکھ کر پہلے وہ میرے پاس لائے اور مسٹر پالمر کو ساتھ لیتے آئے مجھ سے کہا کہ لے یار اب تو اپنے ہاتھ کو روک اور ایک سیّد کا خونِ ناحق اپنی گردن پر مت لے میں نے تجھ کو اور نواب صاحب راشی و مرتشی دونوں کو بچا لیا ہے۔ یہ سب ہنگامہ آرائی اُن چند اہلِ سازش کی ہے کہ جو چاہتے ہیں کہ ایک ہاتھ میں ہم سب کا وارا نیارا کرکے خود مزے اُڑائیں میں نے وہ جواب پڑھ کر اُن کی عقل و فطرت کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ع

اقرار تو ہے آپ کے انکار سے ظاہر

اب میں اصل حال تم سے کہتا ہوں جس دن تم نے وہ رقم مجھ کو بھیجی میں نے فوراً حضورِ پُر نور کو نذر گزران دی اور مسٹر پلاوڈن کو بھی اطلاع کر دی اب اصلاح اس کی میرے ہاتھ سے نکل چکی لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ حتی الامکان میں تم کو بچا لوں گا بشرطیکہ تم بھی اصل واقعات تحریر کر دو اور ان تاویلات بے معنی سے دست بردار

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) انگریز سے ملتے رہے اور کوئی شک نہ تھا کہ بحیثیت سکرٹری دار العلوم اسلامیہ علی گڑھ و بخطاب کے سی۔ ایس آئی پھر حیدرآباد دُگنی قوت کے ساتھ واپس جاتے اور جیسا کہ کہا کرتے تھے فردون جی سے بدلا لیتے۔

ہو جاؤ - یہ سُن کر آن کے ہوش بجا نہ رہے اور کہا " ہائے غضب بڑا دھوکہ کھایا اور تم نے خوب ہم کو خوابِ غفلت میں رکھا اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں نواب صاحب کا شریکِ حال ہو جاؤں اور تم سے مقابلہ کروں" مسٹر پامر نے بھی ان کو سمجھایا کہ درحالیکہ سرور جنگ تم سے وعدہ کرتے ہیں تو تم ان کی رائے پر چلو مگر انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور پریشان حال وہاں سے اُٹھ گئے اور وہی جواب انھوں نے داخل کیا -

جب سب کے بیانات داخل ہو گئے تو حضورِ پُر نور نے مسٹر بلاؤڈن کو طلب کیا میں تو بری کیا گیا مولانا کو حکم جلد ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی سے نکل[۵۱] جانے کا ہوا - مہدی حسن، فتح نواز جنگ یہ حال دیکھ کر مع میم صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے اور مولوی مشتاق حسین شہر بدر کئے گئے سر آسمان جاہ بے گناہ خدمت وزارت سے معزول[۵۲] ہو گئے یہ تو نتیجہ اس وزارت کا ہوا مگر بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پالسی برٹش گورنمنٹ کی بدل گئی

افواج خدمت شاہی کی تحریک

تفصیل اس اجمال کی جس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے یہ ہے کہ کرنل مارشل کے وقت میں ایک تگڈم یعنی حکومت ثلاثہ قائم ہوئی کرنل مارشل، نواب افسر جنگ بہادر - سیّد عبد الحق سردار دلیر جنگ بہادر رُکن اس تگڈم کے ہوئے اور باہم یہ رائے قرار پائی کہ معلوم نہیں کہ آسمان جاہ بہادر کے وقت میں یہ فلک کج رفتار کیا رنگ بدلے - کوئی کام ہم کو ایسا کرنا چاہئے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہماری ممنون ہو جائے پھر ہم کو کون اکھاڑ سکتا ہے پس ایک خط حضورِ پُر نور کی طرف سے صدر صوبہ دار

---

[۵۱] یکم محرم الحرام ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۳ء [۵۲] ۷ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۳ء

اقلیم ہند یعنی نواب گورنر جنرل وائسرائے بہادر کو لکھا گیا کہ ہم سرحد افغانستان کے انتظامی اخراجات کے واسطے اس قدر رقم پیش کش کرتے ہیں اس راز سے صرف دو بیرونی شخص واقف تھے ایک نواب محسن الملک دوسرے مسٹر فردونجی (جن کو نواب محسن الملک نے اپنی ذاتی اغراض کے واسطے کرنل مارشل کے پاس مقرر کیا تھا) چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا نے بجائے نقد امداد کے فوجی امداد قبول کرلی اور اس کا نام امپیریل سروس فورس رکھا گیا مگر یہ فلک بازی گر اپنی رفتار سے کیا باز آتا تھا۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں بہادر نے اپنے زمانہ حکومت میں پہلا کام یہ کیا کہ کرنل صاحب کو انگشت ششم قرار دے کر ریل پر سوار کر دیا۔ سردار عبد الحق کہ سالہائے دراز سے رقیب نواب محسن الملک کے تھے اُدھر موقعہ پا کر ان کو نیچا دکھا دیتے تھے، بالآخر بمبئی کی ہوٹل کے منیجر بنا دئے گئے۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر ریاست پر بار عظیم پڑ گیا اور وزرائے کو حکیہ کی ہمت عالی ادھر مصروف ہوئی کہ اس بار عظیم سے ریاست کو بچا لینا چاہئے۔ مگر راستہ غلط چلے۔ دلیرانہ انکار کے عوض گورنمنٹ کے ہر تقاضے پر ہاں جی ہاں جی کہتے اور معاملہ کو ڈھیل میں ڈالتے جاتے تھے یہاں تک کہ مسٹر پلاؤڈن کا عہد سفارت آگیا اور وزارت درہم برہم ہوگئی اور ادھر گورنمنٹ آف انڈیا کو ہاں جی ہاں جی کی روش پر غصہ آگیا اور اخیر مراسلات ان کے یہ آئے کہ آپ خود تو بانی مبانی اس فوج کے قیام کے ہوئے اور دیگر ریاست ہائے اقلیم ہند نے پیش قدمی کر کے فوجیں مرتب کرلیں مگر آپ ہاں جی ہاں جی کہتے ہوئے سب سے پیچھے رہ گئے اور اب تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی لہٰذا صدر صوبہ دار اقلیم ہند بذات خود حیدرآباد میں آکر اس لیت ولعل کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان مراسلات کو ان حضرات

اور نواب وقارالامرا وزیر افواج نے چھپا رکھا تھا اور حضور پرنور کو اس کی اطلاع بھی نہ تھی۔ اتفاقاً مسٹر پلاؤڈن نے اس کا ذکر مجھ سے کیا اور کہا کہ میں دوستانہ کہتا ہوں کہ ہزہائنس جلد اس کا فیصلہ فرما دیں۔ کب تک یہ ہوتا رہے گا کہ ہماری ریاست بہت بڑی ہے لہٰذا ہم اپنی قدر و منزلت کے موافق افواج دیں گے اور اس کے واسطے ہماری مالی حالت اس وقت مناسب نہیں ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایک طرف ہوم گورنمنٹ اب صبر نہیں کر سکتی اور لارڈ لینسڈاؤن جو آ رہے ہیں وہ بہت ناراضی کی حالت میں آ رہے ہیں بہتر ہے کہ ہزہائنس اس معاملہ کو اُن کے آنے سے پیشتر ختم کر دیں اور تھوڑی بہت جس قدر فوج وہ مناسب حال سمجھیں نام زد کر دیں۔ میں نے کہا کہ ہزہائنس کو مطلق اس کا علم نہیں ہے میں اس کی مسل منگوا کر مفصل کیفیت ملاحظۂ اقدس میں پیش کروں گا اور اس کے بعد آپ کو اطلاع دوں گا۔ چنانچہ مسل طلب کر کے کل کیفیت ملاحظۂ اقدس میں پیش کی۔ فرمایا مسٹر پلاؤڈن کو کل بلاؤ میں خود اس معاملہ کو طے کر دوں گا۔ مسٹر پلاؤڈن نے یہ رائے دی کہ یور ہائنس اس وقت سولہ سو سوار ہم کو عنایت فرمائیں اور آج ہی اس مضمون کا خط مجھ کو لکھ بھیجیں۔ سرور جنگ نے بڑی خیر خواہی کی ہے کہ اس معاملہ سے آپ کو مطلع کر دیا ورنہ لارڈ لینسڈاؤن معلوم نہیں کیا راستہ اختیار کرتے۔ رزیڈنٹ کے جانے کے بعد مجھ کو ارشاد ہوا کہ اس مضمون کا خط مسٹر پلاؤڈن کو فوراً لکھ بھیجو۔ یہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے اور عرض کیا کہ سولہ سو سوار کے بار کا تحمل ریاست میں مطلق نہیں ہے اور پھر اُن کی ترتیب و تہذیب گورنمنٹ کرے گی۔ کنٹنجنٹ کی مثال سامنے موجود ہے اسی پیمانہ پر یہ فوج مرتب ہو گی۔ فرمایا اب میں اقرار کر چکا ہوں اس مضمون کا خط میرے ملاحظہ میں پیش کیجئے۔ میں مغموم و محزوں اپنے دفتر میں چلا آیا اور خیال کیا کہ عوام میں اس بدنامی کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگے گا۔ تمام شب مجھ کو نیند نہیں آئی اس حالت مایوسی میں میرے پیر و مرشد

رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امداد غیبی نے میری دستگیری فرمائی اور مضمون خط کا خود بخود میرے ذہن میں آگیا۔ میں نے فوراً اٹھ کر مضمون کو قلمبند کر لیا اور اب آرام سے سو رہا۔ صبح کو میں نے مسودہ لکھ کر بوقت باریابی ملاحظہ اقدس میں پیش کیا اور عرض کیا کہ حضور ایک ایک لفظ اس کا بغور پڑھ لیں۔ فرمایا میں نے پڑھ لیا مضمون ٹھیک ہے اور اس پر دستخط فرمانے لگے میں نے عرض کیا کہ یہ مسودہ ہے میں صاف کر کے پیش کروں گا۔ مگر ایک بار مکرر حضور اس کو ملاحظہ فرمالیں۔ دوبارہ اس کو پڑھ کر فرمایا سب ٹھیک ہے۔ آپ صاف کر کے پیش کریں۔ میں نے اسی وقت اس کو صاف کیا اور دستخط مبارک حاصل کر کے خود اس کو مسٹر گلانسی (بلاؤڈن) کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس خط کو پڑھ کر کہا بہتر ہے مگر یہ عرض کردینا۔ میں اس خط کو آج ہی روانہ کیے دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مکرر اس خط کو پڑھ لیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور معاملہ بہت بڑا ہے۔ انھوں نے دوبارہ اس کو پڑھ کر کہا کہ یقین ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے بڑا شکریہ اس خط کا آئے گا اور لارڈ لینڈ ڈاؤن کی ناراضی مبدل بہ خوشنودی ہو جائے گی۔ میں اطمینان کے ساتھ وہاں سے واپس آیا اور اب لارڈ لینڈ ڈاؤن بھی آپہونچے۔ معمولی طیاریاں ان کی آؤبھگت کی کی گئیں جن کی تفصیل بے کار ہے۔ شاہی دعوت کل پیرون کے قصر میں ہوئی۔ میری ہمیشہ کی عادت تھی کہ دعوت پارٹی وغیرہ تقریبوں میں شریک تو رہتا تھا مگر الگ تھلگ حتیٰ کہ ڈنر میں بھی نہ بیٹھتا تھا۔ چنانچہ میں افضل محل کے چبوترے پر جا نماز بچھا کر اپنی نماز عشا اور وظائف میں مصروف رہا۔ وہاں لمبی چوڑی اسپیچ (Speech) وائسرائے نے دی اور اپنی پالسی بدلنے کا اعلان کر دیا یعنی یہ کہ اب تک برائے نام تو دیوان ریاست ورنہ سالار جنگ اعظم کے وقت کے اہلکار امن وامان ریاست کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور ذات مقدس حضور پرنور کی دورے

پوجا ہوا کرتی تھی لیکن اب چوں کہ ہزہائنس بذات مقدس کاروبار ریاست کی طرف متوجہ ہوئے
ہیں اور جدید انتظامات بمشورۂ رزیڈنٹ کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ لہذا دیوان اور عہدہ داروں
کی خود مختاری و ذمہ داری امن وامان کو توڑ دیا۔

بعد ختم ڈنر وغیرہ حضور پر نور مع چند مصاحبین فرحاں وخنداں افضل محل میں تشریف
لائے اور چوں کہ میں نماز میں مشغول تھا میرے پس پشت بانتظار ختم نماز کھڑے ہوگئے مجھکو
علم تشریف آوری کا نہ ہوا۔ جب میں نے سجدہ سے سر اٹھایا اور سلام پھیرا اور انھیں دیکھا تو
گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خود حضور پر نور اور کل حاضر باشوں نے مجھکو مبارک باد دی اور
والسرائے کے لفظ "فری ہینڈ" کا مژدہ سنایا۔

مسئلہ تبدیل وزارت

اب صرف تبدّل وزارت کا مسئلہ درپیش رہا مگر وہ دقّتیں اور دشواریاں جو نواب
وزیر کے موقوف کرنے کے وقت پیش آئیں بوجہ "فری ہینڈ" یعنی آزادیِ رائے ہونے کے
سب ہٹ گئیں اور راستہ صاف ہوگیا۔ اور مسٹر پلاؤڈن نے زور ڈالنا شروع کر دیا کہ
اس میں دیر لگانے سے اندیشہ نقص امن کا ہے۔ حضور سر آسمان جاہ کو پھر معتمد علیہ بنائیں
ورنہ موقوف کر دیں۔ حضور پر نور نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر امیر دربار کی رفتار و چال چلن اور
لیاقت علمی کی بابت اپنے تجربہ کے مطابق سچی کیفیت مع اپنی رائے کے بلا لحاظ محبت و رعایت
پیش کروں۔ چنانچہ میں نے ہر امیر کی بابت اپنا سچا علم لکھ کر پیش کر دیا اور عرض کیا کہ یہ تو
میرا علم ہے مگر تقرر وزارت کی بابت اپنی رائے میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اختیار بدست مختار ہے
رائے رائے اقدس و انتخاب انتخاب اقدس ہے۔ لیاقت میں سوائے امیر کبیر بہادر سب

موجودہ امرا برابر ہیں کچھ اردو تحریر کر سکتے ہیں لیکن چوں کہ قانونچۂ مبارک اب جاری ہو گیا ہے ان کی کم لیاقتی چنداں نقصان دہ نہ ہوگی اور زیادہ تر امر باعثِ اطمینان یہ ہے کہ یہ سب امرا بلکہ سب خوش باش اہلِ بلدہ چہ ہنود و چہ مسلمان سب سچے وفادار اور جاں نثار اور خیر خواہِ ریاست ہیں اب تک جو ہنگامہ آرائی رہی ہے وہ صرف عہدہ داروں کی طمعِ حکومت و خود مختاری کی وجہ سے ہوئی ہے جس کا انسداد قانونچہ مبارک نے کر دیا ہے اور آیندہ بھی حسبِ ضرورت حضور پر نور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ سکتے ہیں۔

میری اس تحریر پر حضور پُر نور نے مسئلۂ وزارت کے فیصلہ کی بابت اس قدر تامل فرمایا کہ وزیرِ اعظم و عہدہ دارانِ ریاست چکمہ میں پڑ گئے اور آستینیں چڑھا کر میری گردن کاٹنے پر مستعد ہو گئے۔ ایک اخبار نیا دہلی میں جاری ہوا تھا اس میں ایک سید صاحب نے سخت حملے مجھ پر چھپوائے[1]۔ پانیر میں بڑے بڑے آرٹیکل نکلے۔ رزیڈنٹ کے پاس بھی دوڑ شروع ہو گئی۔ ایک نیم یورپین ذی رتبہ ملازم ریاست یعنی مسٹر ڈنلاپ نے مسٹر بلاؤڈن کو اطلاع دی کہ سرور جنگ ایک گمنام آدمی ہے۔ نہ علمی لیاقت رکھتا ہے نہ خاندانی شرافت۔ یہ قانونچہ اس وجہ سے جاری کیا گیا ہے کہ منسٹر کو معطل کر کے خود حکومت کے مزے اڑائے نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی بدنام ہو گے اور ریاست بھی بدنام ہوگی۔ مسٹر بلاؤڈن خود مجھ سے کشیدہ ہو چکے تھے اس واسطے کہ میں نے ان کو کیبنٹ کونسل میں نہ آنے دیا تھا اور جب وہ قدم کو حد سے زیادہ بڑھاتے تھے تو میں سدِ راہ ہو جاتا تھا۔ کل عہدہ دار یک دل و یک جہت ہاتھ جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ مسٹر بلاؤڈن البتہ مجھ سے ظاہر داری کرتے رہے ابھی ایک بڑا حملہ مجھ پر ایک

---

[1] ایک بار حضور پر نور نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں نے ایک شیر ڈیوڑھی میں بٹھا رکھا ہے اس پر نامہ نگار صاحب نے اخبار دہلی میں چھپوایا کہ یہ شیر مردم خوار ہے اس کو گولی سے مارنا چاہیے ۱۲

لاکھ روپیہ کی رشوتِ مذکورۂ صدر کی بابت ہو چکا تھا کہ اب سر سیمور کے نامی ایک رکن دار العوام میری گردن زدنی کے واسطے مقرر کیے گئے۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا اس کی داد فریاد نہیں سنتی تو اس نے پارلیمنٹ میں میری نسبت سوالات پیش کیے اور گورنمنٹ آف انڈیا سے کاغذات اُسی ایک لاکھ کی رشوت کے متعلق طلب کرائے۔ مگر ایسی شکست کھائی کہ پھر اس نے میرا نام بھی نہ لیا۔ انگلستان کے معتبر اخباروں میں بھی بہت کچھ غل مچایا گیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ سوائے گالی گلوچ کے کوئی خاص جرم مجھ پر نہ لگا سکے[1]

جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو اُنھوں نے سیدھا راستہ اختیار کیا اور رزیڈنٹ کو مجھ سے بدظن کرنا شروع کیا اور اس کو یقین دلایا کہ میں ایک خود غرض حکومت کا طامع اور بازاری آدمی ہوں اور امرائے ریاست ایسے گمنام خاندان اور بازاری آدمی کو حضورِ پرنور کے پاس بارسوخ دیکھنا پسند نہیں کرتے اور ایسا کم لیاقت ہوں کہ بہت ریاست کو نقصان پہونچا دوں گا۔ مگر چوں کہ مسٹر پلاؤڈن کو تبدلِ وزارت پر بڑا اصرار تھا اور وہ یہ کام مجھ سے لینا چاہتے تھے اور جس طرح مولوی مشتاق حسین و مہدی حسن و مولوی مہدی علی کو اُنھوں نے نکلوایا اب وہ سر آسماں جاہ کو خدمتِ وزارت سے علیحدہ کرانا چاہتے تھے مجھ سے ظاہر داری برتتے رہے۔ میں نے یہ سب کیفیت حضورِ پرنور سے عرض کر کے درخواست پیش کی کہ چوں کہ حضور نے قانونچہ جاری فرما دیا ہے اب مجھ کو اجازت خانہ نشینی کی عطا ہو ورنہ میری حالت مہاراجہ نرندر اور نواب وزیر یعنی لائق علی خاں سے بدتر ہو گی۔ فرمایا

---

[1] مثلاً ایک الزام یہ تھا کہ ایک معزز ہندو رکن خاندان راجہ شیوراج کو بعد برطرفی کپتان بو کلرک انتظام خاندان جاگیرات نواب وزارت پناہ مرحوم پر مقرر کیا تھا اس کے متعلق انگلینڈ کے اخبار میں یہ چھاپ دیا کہ یہ شخص سرور جنگ کا بھتیجا ہے' اس معزز ہندو کا نام للتا پرشاد تھا ۱۲

تبدل وزارت میں جو دیر لگی اس واسطے آپ شکستہ خاطر ہو گئے ہیں آج میں حکم جاری کر دیتا ہوں مگر میں اس شش و پنج میں ہوں کہ سر آسمان جاہ کے بعد کس کو نامزد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ تبدل وزارت سے فدوی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا علاوہ اس کے میں نواب آسمان جاہ کو بے قصور محض سمجھتا ہوں وہ ایک امیر ابن امیر سادہ لوح اہل دنیا کی مکاریوں سے ناواقف اپنے مشیروں کی رائے پر ایک فعل کر گئے یہ سچ ہے کہ حضور چشم زدن میں ان کو امیر سے فقیر بنا سکتے ہیں مگر بادشاہوں کے دربار کی رونق امرائے عظام سے ہوا کرتی ہے اور رعب داب شاہی اور عظمت جلال بھی اپنے امرا سے ہوا کرتی ہے اور یہی امیر پشت و پناہ و زور بازو سے بادشاہاں و رؤسا ہوتے ہیں کہ وقت پر جاں نثاری کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں ان کے بگاڑ دینے میں واقعی قوت ریاست نہ فقط کم بلکہ بالکل جاتی رہتی ہے۔ بادشاہ رستم بنا رہتا ہے اور یہ امرا رستم کے نام سے مہمات عظمیٰ سر کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھکو اس وقت ایک حکایت یاد آئی کہ سر رچرڈ میڈ کے وقت میں وزارت پناہ نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں جرأت کے ساتھ سر رچرڈ میڈ سے گفتگو کر کے ان کے خیالات کی تردید کروں اور مجھ سے کہا کہ آپ کو ڈر کس کا ہے جب تک میں زندہ ہوں آپ کو نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالےٰ آپ کی ذات بابرکات کو قائم و دائم رکھے مجھکو کسی کا بھی ڈر نہیں ہے مگر کلام کی وقعت کلام کرنے والے کی وقعت پر منحصر ہے میں ایک ادنیٰ آدمی صرف شاگرد حضور پر نور کا ہوں میرے کلام میں وقعت رزیڈنٹ کے سامنے کیا ہوگی معاملہ تعلیمی نہیں ہے اگر آپ خود اس معاملہ کو بالمشافہ فیصل فرمائیں تو بہتر ہوگا۔ اس پر فرمایا کہ آپ نے وہ مثل نہیں سنی کہ "نام رستم بہ از رستم"۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک روز رستم اپنی جواہر نگار ڈھال تلوار سرہانے رکھے ہوئے جنگل میں سو رہا تھا اتفاقاً ایک گنوار دیہاتی آدمی اس طرف آنکلا۔ جواہر نگار ڈھال تلوار

رستم کے سرہانے سے گھسیٹ کرلے چلا رستم کی آنکھ کھل گئی اور اس کے پیچھے دوڑا اور پکارا کہ ٹھیر تو سہی رستم آپہونچا۔ اس گنوار نے جو یہ صدا سُنی تو پھینک کر بھاگ گیا۔ اب اگر حضور کی مصلحت اسی میں ہے کہ وزارت تبدیل کی جائے تو مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ فرمایا کہ مجھکو اصرار نہیں ہے مگر مسٹر پلاؤڈن تقاضا کر رہے ہیں اور ہر وقت وقارالامرا کا نام لے رہے ہیں۔ وقارالامرا سے تو ہزار درجہ آسمان جاہ بہتر ہیں۔ میں نے عرض کیا جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ہوئے۔ فرمایا تم ایک گفتگو مسٹر پلاؤڈن سے کر لو۔ اس کے بعد جو مناسب ہوگا کر لیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور ایک عنایت نامہ مسٹر پلاؤڈن کے نام مجھکو عنایت فرمائیں جس کے ذریعے سے فدوی گفتگو کرے ورنہ کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوگا۔ چنانچہ حضور پُرنور نے اسی وقت اپنے خیالات لکھ کر مجھکو عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ ان کے مطابق آپ خط لکھ کر لائیے میں دستخط کر دیتا ہوں۔ خلاصہ اس خط کا یہ تھا کہ مجھ کو وقارالامرا سے کوئی امید بہتری کی نہیں ہے۔ میں اس خط کو لے کر رزیڈنٹ کے پاس گیا اور بڑی دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی۔ مسٹر پلاؤڈن نے یہ کہا کہ سر آسمان جاہ سے جرم صادر ہوا ہے اور مجرم ایسی خدمت پر نہیں رہ سکتا اور وقارالامرا ایک جوان آدمی وجیہہ و خوبصورت اور آسمان جاہ کی شرکت میں انتظامی تجربہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ نواب امیر کبیر اب بڈھے ہوگئے بارِ ریاست اٹھا نہیں سکتے اور فخرالملک امرائے پائگاہ میں سے نہیں ہیں۔ خلاصہ ایں کہ دوسرے روز مسٹر پلاؤڈن باریاب ہوئے اور نواب وقارالامرا کی قسمت بازی لے گئی۔ حضور پُرنور نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم چند شرائط نواب وقارالامرا سے لکھوا لاؤ۔ اس کے بعد خلعت وزارت ان کو عطا ہوگا اور جب تک وہ فقط منصرمانہ کارِ خدمت ادا کرتے رہیں۔ چنانچہ میں نے وہ شرائط نواب وقارالامرا سے لکھوا کر پیش کر دیئے اور وہ منصرمانہ وزیر مقرر ہوگئے۔ اس کے بعد بھی

حضورِ پر نور ان کے استقلال کی بابت عرصہ دراز تک تامل فرماتے رہے۔ بالآخر مسٹر پلاوڈن کے تقاضہ پر اور میرے معروضات پر کہ یا ان کو مستقل فرمایئے یا دوسرا انتخاب فرمایئے تاکہ کارِ ریاست میں خلل واقع نہ ہو، باکراہ تمام خلعتِ وزارت نواب وقار الامرا کو عطا ہوا۔ اب پھر میں نے موقع پاکر عرض کیا کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضور اپنے کل مقاصد پر کامیاب ہوگئے۔ عنانِ ریاست اپنے دستِ قدرت میں لے لیا۔ ضابطہ نظم و نسق یعنی کانسٹی ٹیوشن جاری فرماکر دیوان اور عہدہ داروں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔ تبدّلِ وزارت بھی کر دیا۔ اب فدوی کو اجازت عطا ہو کہ اپنی جان و آبرو بچا کر چند روز آرام سے خانہ نشین رہے۔ اس کا جواب کچھ عطا نہ ہوا مگر دوسرے روز ارشاد ہوا کہ میں نے وقار الامرا کو حکم دیدیا ہے کہ سات سو روپیہ ماہوار منصب آپ کا نسلاً بعد نسلٍ جاری کر دیں اور آپ اپنے متعلقین کا نام مجھکو لکھ بھیجیں میں ان کے نام بھی مناصب جاری کر دیتا ہوں، رہ گئی آپ کی درخواستِ خانہ نشینی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کا کیا مقصد ہے۔ چند روز تامل کرنا چاہیئے تاکہ وقار الامرا کی رفتاریں دیکھ لوں۔

نواب وقار الامرا ایک شاہانہ مزاج کے آدمی تھے نہایت فیاض اور سخاوت میں مثل اپنے والدِ ماجد وقار الامرا امیر کبیر نواب رشید الدین خاں مرحوم بڑے بلند ہمت تھے مگر فطرۃً قوتِ فکر و غور میں اس قدر کوتاہ تھے کہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا میرے واسطے فکر و غور کر لیا کرے۔ خود اپنے دماغ پر زور ڈالنے سے عاری تھے۔ پس ہر کہ و مہ کی رائے کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ ابھی ایک شخص کی رائے کو قبول کیا ہے کہ دوسرا آن پہونچا اور اُس نے ان کو اپنی رائے پر گھسیٹ لیا۔ پس بہت جلد اہلِ فطرت عہدہ داروں کے پھندے میں پھنس گئے اور بہت جلد آسمانِ جاہ کے وقت سے بدتر حالت ہوگئی۔ قانونچہ مبارک نے

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر

جو ہاتھ پاؤں معتمدین کے باندھ دیئے تھے اب دیوان کو عاری اور اتّی دیکھکر پھر ان عہدہ داروں کی طمع اور ہوسِ خودمختاری نے زور کیا اور ظاہر تھا کہ میرا وجود ان کی ہوسِ خودمختاری کا سدِ راہ تھا۔ لہذا اُنھوں نے نوابؔ وقارالامرا کو یقین دلادیا کہ جب تک سرورجنگ برسرکار رہے آپ برائے نام وزیر ہیں۔ ادھر میں نے بھی حماقت سے قانونچۂ مبارک کی نگرانی پر کمرِ ہمت مضبوط باندھی اور نہایت زور اور قوت کے ساتھ دیوان یعنی وزیر و عہدہ داروں کو اُس کی پابندی پر مجبور کیا۔ اگر کسی نے دائرۂ محدود کے باہر قدم رکھا میں نے فوراً حضورِ اقدس و اعلیٰ میں اطلاع کی اور انسداد اس کا کردیا۔ یہ میں خوب سمجھتا تھا کہ ایسی سخت گیری سے میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماررہا ہوں۔ پس میں موقع کا منتظر تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے تئیں اس مصیبت سے بچاکر خانہ نشین ہوجاؤں۔ سوائے عوام و خاص اہلِ بلدہ کے باقی کل گروہ وزارت میرا دشمن جان و آبرو بن گیا تھا حتّیٰ کہ ارکانِ کیبنٹ کونسل پر بھی بدگوئی کا اثر پڑگیا۔ اس واسطے کہ کیبنٹ کونسل کی ماہانہ کارروائی برائے ملاحظۂ اقدس میرے پاس آیا کرتی تھی اور جو اعتراض بندگانِ اقدس فرمایا کرتے تھے وہ مجھ غریب کی طرف منسوب ہوتا تھا حتّیٰ کہ نواب فخرالملک اور راجہ کشن پرشاد کونسل میں کہہ بیٹھے کہ ہم تو سرورجنگ کے ماتحت بن گئے اور وزیر کے متفق الرائے ہوکر مجھ غریب کو خارِ پہلو سمجھنے لگے۔

مہاراجہ کشن پرشاد

مہاراجہ کشن پرشاد کا حال کچھ لکھ چکا ہوں مختصر یہ ہے کہ یہ راجہ نرندر مہاراجہ پیشکار کے نواسے تھے اور ان کے جانشین سمجھے جاتے تھے مگر اپنی کسی رفتار سے مہاراج کو ایسا ناراض کیا کہ اُنھوں نے ایک دوسرے نواسے بہاری پرشاد کو جو نہایت کم سن تھا اپنا جانشین بنالیا

اور ایک معروضہ بندگان عالی میں داخل کر دیا کہ کشن پرشاد کو میں نے اپنی جانشینی سے خارج کر کے اپنے دوسرے نواسے کو (اس بچے کو مہاراج چنو پاشا پکارا کرتے تھے) میں نے اپنا وارث بنا لیا۔ لہذا میری درخواست منظور فرما کر سیاہہ میں درج فرمادی جائے۔ اس وقت میں نے بہ مشکل تمام مہاراج کو راضی کیا اور دوسرا معروضہ ان سے لکھوا کر بنام راجہ کشن پرشاد سیاہہ میں مندرج کرا دیا۔ اُدھر اس عرصہ میں نواب آسمان جاہ وزیر اعظم نے بمشورۂ وزرائے کو چک عہدۂ پیشکاری ریاست کو توڑ کر جاگیرات کے ضبط کرنے کا ارادہ مصمم کر لیا اور نواب افسر جنگ نے علاقۂ پیشکاری کی پلٹن پر ہاتھ ڈال دیا۔ مگر راجہ کی خوش قسمتی سے یہ وزارت جلد معزول ہو گئی اور اب راجہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ راجہ نرندر مجھکو بھائی کہتے تھے میں نے فاتحۂ مبارک کے جاری ہونے کے وقت ان کی سفارش برائے وزارت فوج کر دی اور یہ وزیر فوج ہو گئے اتفاقاً نواب وقار الامرا کو برائے ملاقات نواب وائسرائے شملہ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی غیر حاضری میں کون خدمت وزارت پر منصرم و قائم مقام نامزد ہو نواب وقار الامرا نے یہ معروضہ داخل کیا کہ معمولی کار ریاست ذمہ دار عہدہ دار چلاتے رہیں گے اور غیر معمولی کام میرے پاس بھیجتے رہیں گے کسی کی منصرمی کی ضرورت نہیں حضور پر نور نے اس معروضہ کو نامنظور فرمایا۔ راجہ کشن پرشاد نے میرے ذریعے سے اپنی ایک غزل برائے اصلاح داخل کی تھی اور شاگردی کی نذر بھی گزرانی تھی۔ پس میری سفارش پر حضور پر نور نے ان کو قائم مقام و منصرم مقرر فرمایا۔ مہاراجہ نرندر کے احسان کو میں بھول نہیں سکتا تھا جب مجھے موقع ملا ہر امر میں میں نے اُن کے نواسے کی تائید کی اور حضور پر نور کو میں نے راضی کر لیا تھا کہ اگر وقار الامرا خدمت سے ہٹائے گئے تو راجہ کشن پرشاد مدار المہام مقرر ہوں گے لیکن افسوس ہے کہ منصرم ہوتے ہی راجہ صاحب نے کچھ بھی میری قدر نہ کی کسی خاص امر میں محمد صدیق صاحب نے راجہ سے

احکام بلا منظوری حضرت خداوند نعمت جاری کرائے تھے۔ جب راجہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے زبانی ان کو ہوشیار کیا تاکہ آئندہ ایسا نہ کریں۔ غرض وہ احکام تو حضور پرنور نے منسوخ فرما دیئے مگر راجہ صاحب کے دل میں میری طرف سے ناخوشی زیادہ ہوگئی ادھر نواب وقارالامرا نے یہ خیال کیا کہ میں نے راجہ کو اُن کی مخالفت میں منصرم کرایا ہے۔ یہ مولوی محمد صدیق ابتدا میں پیش دست مولوی امین الدین خاں کے تھے بعدہٗ مولوی صاحب[1] نے ان کو رکن مجلس عالیہ تک پہونچا دیا جس قدر ان کے بھائی مولوی شیخ احمد صاحب[2] خوش خُلق سیدھے سادے مسلمان اور سازش سے بری تھے اسی قدر مولوی محمد صدیق اپنے بھائی کی ضد واقع ہوئے تھے۔ بعد معزولی وزرائے کو چاک اُنھوں نے نواب آسمان جاہ پر اثر ڈالنا چاہا مگر وہ وزارت قائم نہ رہی اس کے بعد انہوں نے نواب وقارالامرا کے پاس گھس بیٹھ شروع کی مگر مسٹر ہرمز جی نے اُن کی دال نہ گلنے دی۔ مولوی محی الدین[3] خاں نے جس طرح سے بے میری اطلاع قانونچہ مبارک میں دخل دیا تھا۔ اسی طرح ان کا نام جریدہ میں خدمت معتمدی امور عامہ پر چھپوا دیا باوجودیکہ میں نے ایک نہایت متقی و پرہیزگار مسلمان مولوی عبدالکریم کی سفارش کرکے حکم خداوندی ان کے نام جاری کرایا تھا۔ بہرحال میں نے مسٹر ہرمز جی کی سفارش اس خدمت پر کردی اور ان کو اضلاع[۳] پر بھجوا دیا۔ اب ان سب حضرات نے بشرکت اکبر جنگ کو توال ایک فہرست تمام ہندوستانیوں کی مرتب کرکے رزیڈنٹ کے پاس بھیجی کہ یہ سب میرے رشتہ دار ہیں اور میں ریاست کو لوٹ رہا ہوں۔ کرنل میکنزی ایک

---

[1] رفعت یار جنگ ۱۲ [2] برادر خرد مولوی امین الدین خاں ان کو بلحاظ تعلق خاندانی والد نے اپنا مددگار مقرر کیا تھا ۱۲ ذوالقدر جنگ

[3] گلبرگہ شریف کی صوبہ داری ۱۲

خود پسند بڈھے آدمی اکبر جنگ کے کسی وقت میں مربّی برائے چندے بجائے مسٹر بلاوڈن رخصت گرفتہ مقرر ہوئے تھے اُنھوں نے کیفیت طلب کی۔ اُدھر کوتوال نے چند عرضیاں بھی گونڈ نیوں[۱] سے رزیڈنٹ کے پاس بھجوادیں کہ سرور جنگ ہمارے مکانات زبردستی چھین رہا ہے اور بنگلور کے ایک اخبار نے اور کسی اردو اخبار بمبئی نے اس قدر غل مچایا کہ گالیاں تک چھاپنے لگے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر اگھور ناتھ کو جو کہ نہایت لائق اور علم دوست آدمی تھے، بار دگر خدمت دلوادی تھی اور اُن کی دختر سروجنی نامی کو وظیفۂ معقول برائے تعلیم انگلستان بھجوایا تھا۔ اسی طرح اکثر ہنود کو باوقعت عہدوں پر سفارش کر کے ترقیاں دلوائیں تھیں اب میرے ان سب کاموں کی مذموم تاویلات کر کے ہر چہار طرف سے حملے شروع کر دیئے اور بلیغ کوشش کی کہ جرم بد دیانتی یا بد خواہی کا مجھ پر لگائیں۔ مگر چوں کہ دامن میرا بفضل الٰہی پاک وصاف تھا کوئی گنجائش ان تہمتوں کی اُن کے ہاتھ نہ لگی۔ جب کوئی حملہ ان کا مجھ پر کارگر نہ ہوا بلکہ شکست پر شکست کھاتے رہے تو کوتوال نے مجھکو جادوگر اور بدنیت عامل مشہور کیا کہ حضور پُرنور کو میں نے عملیات کے زور سے مسخر کر لیا ہے۔ سالار جنگ اسٹیٹ میں نے اپنے ہاتھ میں لی تھی اس واسطے کہ اس خاندان میں چند بیوائیں اور ایک یتیم بچہ جو اب سالار جنگ کے خطاب سے ممتاز ہے رہ گئے تھے[۵۲]۔ اور آسمان جاہ اور وقار الامرا کی خواہش یہ تھی کہ اس

---

[۱] طوائف پیشہ عورتیں چنچل گرٹھ میں مکان کی پشت پر رہا کرتی تھیں ۱۲

[۵۲] نواب میر سعادت علی خاں منیر الملک نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی وزیر اعظم کے برادر خُرد تھے بعد انتقال وزیر اعظم یہ اُمیدوار اس عہدۂ جلیلہ کے تھے اور اگر زندگی ان کی وفا کرتی تو یقیناً بعد معزولی آسمان جاہ یہ اپنے والد اور برادر کی مسند پر متمکن ہوتے ان کے انتقال سے چند روز قبل حسن بن عبداللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو بُلایا ہے میں فوراً ان کے ساتھ چلا گیا مجھکو اپنے پہلو میں کوچ پر بٹھالیا۔ (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

خاندان کو رفتہ رفتہ اس ترکیب سے خود الگ رہ کر مٹائیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہم پر شبہ نہ کرے گو اس لئے مسٹر ہلاؤڈن کا زور ڈال کر وہ جاگیر میری نگرانی سے نکلوا لی مگر شکر ہے کہ وہ گھر اغیار کی دست برد سے بچ گیا۔

واضح رہے کہ وقار الامرا کوئی اپنی ذاتی رائے یا مسلک نہ رکھتے تھے اور قریب قریب یہی حال آسمان جاہ کا تھا۔ بقول شخصے "جیٹھ کے برتے پیٹ" جو ان کی پیشی کے عہدہ داروں نے لکھ کر پیش کیا اس پر دستخط کر دیتے تھے۔ اب ان عہدہ داروں نے دیکھا کہ وزیر تو محض ہیچ ہیں اور مثل کوتاہ رفتار طفل ہماری انگلی پکڑنے کے محتاج ہیں۔ لہذا کل اختیارات عطیہ قانونچہ مبارک پر خود قبضہ کر بیٹھے اور بجائے اس کے کہ منشا رقانونچہ مبارک کا حاصل ہو وہی اودھم اور ہنگامہ آرائی قائم ہو گئی۔ میں بھی اپنی حماقتوں سے ان حضرات کو اپنا زیادہ مخالف بناتا رہا حتیٰ کہ رزیڈنٹ اور منسٹر کو بھی میں نے اپنا مخالف بنالیا اور ان کے حدود سے باہر ان کو قدم نہ رکھنے دیا اور اپنی خدمتی موت کا نہایت بے خوف ہو کر منتظر رہا چنانچہ میری شہادت کا بھی وقت آپہونچا اور کسی اہل دل کا یہ شعر میری زبان پر جاری ہو گیا ؎

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

میں دریائے حیرت میں غرق ہو گیا یعنی یہ معلوم ہوا کہ گویا میں ایک مُردے کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہوں رنگ چہرہ تیرہ و تار رخسارے دھنسے ہوئے آنکھیں گڑھی ہوئیں۔ آواز نہایت ناتواں اور دھیمی اسی آواز میں مجھ سے فرمایا کہ حضرت کیا میں آپکا شاگرد نہیں ہوں کیوں آپ مجھکو بھولے ہوئے ہیں؟ آپ خود جانتے ہیں کہ اعلیحضرت کس قدر مجھکو عزیز رکھتے ہیں صرف تحریک کی دیر ہے۔ میں نے کہا کہ میں بجان و دل حاضر ہوں میرا گمان یہ تھا کہ آپ اس خدمت کے طالب نہیں ہیں۔ نہ آپنے مجھکو یاد فرمایا اور نہ کبھی محبوب یار جنگ اور افسر جنگ نے مجھ سے ذکر کیا۔ فرمایا ریاست علی بیگ تو یہ نہ حوصلہ ہے اور نہ ہمت اور محمد علی بیگ نے جو وفاداری بھائی صاحب سے کی آپ بھی جانتے ہیں یہ کہکر آنسو آنکھوں میں بھر لائے اُن کے ساتھ حسن بن عبداللہ نے بھی رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔ میں یہ کہکر کہ میں ان امور پر غور کرکے پھر حاضر ہوں گا ان سے رخصت ہوا اس کے ایک ہفتہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا ۱۲

حاذقاً نمگیں مشورہ روزِ شہادت دُور نیست
کشتۂ راہ وفا را حاجتِ کافور نیست

اوّل مسٹر بلاؤڈن نے مجھ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ چنانچہ ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں
کیبنٹ کونسل میں اُن کی مداخلت کو میں روک چکا تھا وہ خلش ان کے دل میں موجود تھی ایک
مقدمہ کوتوال نے اپنی خیر خواہی اور بیدار مغزی ثابت کرنے اور حضور بندگان عالی اور
مسٹر بلاؤڈن کو اپنا ممنون کرنے کی غرض سے عجیب و غریب ڈھونگ کھڑا کیا۔

ایک بے سرو پا فتنہ

ایک شخص مولوی جواد حسین[1] صاحب نامی شاید بھوپال کے باشندہ نہایت ذی علم مگر سخت
جوشیلے گویا مجنون۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ وزراے کو چک و کل ذی مقدرت

---

[1] علی گڑھ کے قیام میں مولانا موصوف کے تعلیمی و خاندانی حالات مفصل مجھے اُن کے بھتیجے خان بہادر چودھری نبی احمد صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مولوی ابرار حسین صاحب ایم اے لکچرر مسلم یونیورسٹی کی زبانی معلوم ہوئے جن کا میں شکر گزار ہوں۔ اجمالاً ان کو درج ذیل کرتا ہوں:۔

مولوی جواد حسین صاحب بن مولوی ہادی حسن خاں صاحب قصبہ گوپامئو ضلع ہردوئی (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ یہ گوپامئو کے اُس ممتاز گھرانے کے فرد تھے جس میں قاضی مبارک اولیا (خلیفہ حضرت محبوب الٰہیؒ) قاضی مبارک شارح سلّم" و ملا وجیہ الدینؒ مولف فتاویٰ عالمگیری جیسے زر فیش و فضلا پیدا ہوئے۔ مولانا کے دادا خان بہادر مولوی فریدالدین احمد خاں صاحب مرحوم شاہ اودھ کی طرف سے چکلیدار (حاکم ضلع) تھے۔ ان کے دو بھائی مولوی احمد حسین خاں صاحب اور مولوی حیدر حسین صاحب ریاست بھوپال میں ہز ہائی نس کے میر منشی اور ناظم ضلع علی الترتیب رہے اور انھیں عہدوں سے پنشن پائی۔ ان کے ایک بھائی مولوی سجاد حسین صاحب ریاست ٹونک کی طرف سے وکیل اور ناظم رہے جس کے صلہ میں ان کو ہز ہائی نس نے جاگیر بھی عطا کی اور پنشن بھی۔ مولانا نے درسیات اپنے چچا ملا قطب الدین

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

اہلکاران ریاست مثل مولوی مہدی علی وغیرہ ان کے علم کی قدر کرتے تھے اور نقد وجنس سے ان کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ یہ علاّمہ میرے پاس بھی آیا کرتے تھے جن کی صحبت سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ یہ نہایت بے باکانہ حمیت اسلامی ظاہر کیا کرتے تھے "حضرت جبریل گویا ان کے ساتھ دوڑا کرتے تھے اور من جانب اللہ تعالیٰ فرشتہ مثل خدمتگار ان کے پاس متعین" من جملہ دیگر علوم و فنون کے اس درویش صفت مُلاّ کو فنون سپاہگری تلوار بازی، تیر اندازی، چابک سواری وغیرہ میں بھی بڑا دعویٰ تھا۔ مولوی مہدی علی نے ان کو کہیں سے ایک رقم کثیر دلوا دی۔ انھوں نے ایک گھوڑا خریدا اور ایک تیر کمان اور ایک تلوار بھی مول لی۔ یہ مذہبی مجنون مولانا سکندرآباد سے ایک بار اپنے گھوڑے کو کداتے پھنداتے ہوئے آرہے تھے ادھر سے کرنل نیول سکندرآباد جا رہے تھے۔ دونوں کا سامنا گٹھ تالاب پر ہوا۔ کرنل نے معمولی طور پر کہا ہٹو ہٹو مگر انھوں نے گھوڑے کو کرنل کی گاڑی کے سامنے سینہ بٹایا اور کہا "اے کافر چہ خرستی کہ مرد مسلماں را ہٹو ہٹو می گوئی" اور چابک ان کی طرف اٹھایا۔ کرنل ایک مہذب آدمی تھا وہ اپنی گاڑی کو ایک جانب سے نکال کرلے گیا۔ یہ حضرت گھوڑا کداتے ہوئے اپنے گھر پہونچے اور اپنی بہادری کی اور تیر و تبر و شمشیر کے فنون میں اپنے کمال کے اعلان ہر ایک سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

سے ختم کیں اس کے بعد بھوپال جاکر حضرت شیخ حسین رح یمنی سے حدیث کی سند حاصل کی حیدرآباد سے اخراج کے بعد انھوں نے اپنا مستقل قیام بمبئی میں کرلیا تھا۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر جنجیرہ (جزیرہ) ان کا وظیفہ مقرر کردیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کے مسلمان سیٹھ ان کا بہت احترام کرتے تھے اور سلوک ہوا کرتے تھے ۱۹۲۳ء میں وہ بغرض علاج چشم دہلی آئے اور حکیم مسیح الملک محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کے مہمان ہوئے۔ اسی زمانہ میں ان کو پیچش یا "اطلاق البطن" کا مرض لاحق ہوگیا اور اسی میں ان کا ایک ہفتہ کے بعد انتقال ہوگیا حضرت خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہیں۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

سامنے کرنے لگے۔ کوتوال نے اپنے ایک دوست کے ہاں ان کی دعوت کرادی اور دو تین مخبر حجرہ میں پوشیدہ بٹھادیئے۔ اس دوست نے بعد فراغت از طعام ان کو باتوں میں لگایا یہ بے تکلف کھل گئے اور زبانی تیر و کمان سے کفار کو مارنے لگے۔ دوسرے روز کوتوال نے ان کو گرفتار کرلیا اور رزیڈنٹ اور حضرت بندگانِ عالی کو رپورٹ دی کہ ایک متعصب شخص دست گرفتہ مولوی مہدی علی، حضور پرنور اور رزیڈنٹ پر اور سر در جنگ پر حملہ کرنے والا تھا۔ میں نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اگرچہ کوتوال میری جان وآبرو کا دشمن تھا مگر میرا نام اس واسطے شریک کیا کہ کہیں میں مخالفانہ دخل نہ دوں۔ رزیڈنٹ نے فوراً ایک خط منسٹر کو لکھا کہ مقدمہ اس متعصب ملّا پر قائم کیا جائے اور خود باریاب ہوکر حضور پرنور پر زور ڈالا۔ میں نے جو یہ زور شور مسٹر پلاوڈن کا دیکھا تو میرے کان کھڑے ہوگئے کوتوال کی رفتار سے میں خوب واقف تھا۔ سوچا کہ کوتوال کی یہ کارروائی دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ مولوی مہدی علی پر حملہ کرنا چاہتا ہے یا اپنی چستی اور مستعدی ثابت کرکے حضور پرنور اور رزیڈنٹ کو ممنون کیا چاہتا ہے کہ میں نے جان بچائی۔ بہرحال میں نے حضور پرنور سے عرض کیا کہ مقدمہ خواہ کسی غرض سے کھڑا کیا گیا ہو ہرگز آگے نہ چلنے پائے۔ یہ اسلامی ریاست اور کل عیسائی اقوام نے مسلمانوں کو مذہبی دیوانوں کا لقب دے رکھا ہے۔ مبادا یہ ریاست ابدمدت ایسے ہی مجنون لوگوں کا گھر مشہور ہوجائے۔ فرمایا میں کیا کروں مسٹر پلاوڈن شدید زور مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر حضور ان کو ارشاد فرمادیں گے تو پھر وہ اصرار نہ کریں گے۔ فرمایا تمھارا ہی قول ہے کہ "نام رستم بہ از رستم" کیوں نہیں وقارالامرا میرے نام سے رزیڈنٹ کو فہمائش کردیتے۔ میں نے عرض کیا کہ وقارالامرا اگرچہ حضور کے اور ریاست کے خیرخواہ ہیں مگر وہ خیرخواہی کے معنی ہی نہیں سمجھتے۔ یہ سن کر حضور پرنور ہنس پڑے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ آپ اس مقدمہ سے واقف ہیں آپ خود

مسٹر پلاوڈن سے گفتگو کیجیے مگر کوتوال اکبر جنگ اور افسر جنگ بلکہ خود وقار الامرا مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ کی پالسی یعنی مسلک غلط ہے۔ اس کے بعد مجھے حکم ہوا کہ آپ کی رائے مناسب ہے اس مقدمہ کو دیوان کے پاس سے طلب کرکے مابدولت واقبال کو اطلاع دو اور میرے حکم کے پابند رہو۔ فرمایا بہتر ہے چنانچہ وہ مقدمہ میں نے اپنے پاس منگا لیا۔ وقار الامرا اس کو اپنی ہتک سمجھے اور وہ اور مسٹر پلاوڈن کوتوال اکبر جنگ کی فریاد پر خفگی کا خنجر میرے واسطے نکال بیٹھے۔ مگر میں اپنے پیر و مرشد کے ارشاد کے مطابق مطمئن رہا۔ اگر نیت نیک ہے تو انجام بھی نیک ہے اور مسٹر پلاوڈن کو لکھ بھیجا کہ آپ کی خواہش کے مطابق اس فقیر منش عالم پر مقدمہ قائم کیا جاتا ہے مگر چونکہ یہ معاملہ قابل عدالت میں بھیجنے کے نہیں ہے لہذا خاص کمیشن مقرر کیا جاتا ہے جس کو صرف دریافت کا اختیار رہوگا بعدہٗ حضور پرنور اور آپ مل کر اس کا فیصلہ کردیں گے۔ اب یہ بحث ہوئی کہ اس کمیشن کے ارکان کون مقرر کیے جائیں۔ بالآخر مولوی نظام الدین[۱] صاحب اور لیسین[۲] خاں صاحب باشارہ مسٹر پلاوڈن مقرر ہوئے۔ یہ دونوں صاحب نہایت نیک نیت اور بادیانت تھے اور انصاف کے وقت دوستی دشمنی یا کسی کے خوف و رعب و داب سفارش کو پاس نہ آنے دیتے اور کسی سازش میں شریک نہ تھے۔ فرق اتنا تھا کہ مولوی نظام الدین صاحب نہایت ذی علم انگریزی ادب میں بی اے اور انگریزی قوانین میں امتحان وکالت میں کامیاب اس کے ساتھ فقہ و حدیث وغیرہ علوم عربی میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ شاید نواب وزیر نے یا ان کے والد نواب وزارت پناہ نے ان کو انگریزی سرکار سے دام لے کر رکن مجلس عدالت عالیہ مقرر کیا تھا۔ دوسرے صاحب لیسین خاں جاورہ کے امیرزادے پڑھے نہ لکھے بوجہ خصوصیت خاندانی ملک برار میں کسی اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھے رزیڈنٹ نے ان کی سفارش کرکے عدالت عالیہ میں

[۱و۲] مجلس عالیہ عدالت کے دونوں رکن تھے ۱۲

رکن مقرر کرا دیا تھا۔ تھے بچھیا کے باوا۔ اور ایسے کوتوال کے اثر میں آگئے کہ میرے پاس آستینیں چڑھا کر آئے اور کہا کہ آپ مجھکو بددیانت سمجھتے ہیں اور میری شکایت ہر جگہ کرتے پھرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے تو آپ کے تقرر کو نہایت خوشی سے منظور کرایا ہے اور حضرت بندگان عالی حضور پر نور بھی آپ کو اس خدمت کے لائق سمجھتے ہیں مگر وہ آگ بگولا بنے رہے خلاصہ این کہ مقدمہ کی تحقیقات زور شور سے شروع ہوئی مقدمہ چوں کہ ہیچ تھا ہیچ ثابت ہوا۔ مگر رزیڈنٹ نے زور سے لکھا کہ یہ شخص ریاست سے نکال دیا جائے۔ مولوی مہدی علی بھی میرے پاس خوش خوش آئے اور میرا شکریہ ادا کیا اور غریب الوطن مولوی جواد حسین بے گناہ ملزم کی جان بچ گئی۔ مگر مسٹر پلاؤڈن میری جان کے دشمن ہو گئے۔

میری خدمت کے آخری ایام

افواج خدمت شاہی کا معاملہ

اسی طرح امپیریل سروس فورس کے معاملہ میں میری شامت آئی۔ رزیڈنٹ افسر جنگ بہادر کی بابت زور ڈال رہے تھے کہ یہ افسر اس فوج کے مقرر کئے جائیں اور حضور پر نور کسی وجہ سے تامل فرما رہے تھے۔ آخر مسٹر پلاؤڈن نے مجھ سے ذکر کیا کہ ہنوز ترتیب رسالہ نہیں ہوئی اور ایک انگریزی عہدہ دار اس فوج کی ترتیب کے واسطے آرہا ہے میرا علم تو یہ تھا کہ ہز ہائنس افسر جنگ کو اس خدمت پر نامزد فرما کر رسالہ مرتب فرما دینگے تم مجھکو جلدی اطلاع دو کہ ہز ہائنس کا منشاء مبارک کیا ہے۔ میں نے یہ کیفیت حضور پر نور سے عرض کر دی۔ خلاصہ این کہ افسر جنگ بہادر اس فوج کے کمانڈر ہوئے اور کپتان ملر ایک افیسر من جانب گورنمنٹ آپہونچا۔ اور نواب وقار الامرا سے حکم جاری کرا دیا کہ چوں کہ آٹھ سو

سلہ ۱۵ شعبان ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء۔

مسٹر ڈی سی پلاؤڈن

سوار ترتیب رسالہ کے واسطے کافی نہیں ہیں لہذا ہزار سوار فی الحال دیدیئے جائیں اس کے علاوہ گھوڑوں کا سامان عمدہ انگلش ساخت کا اور بارگیر سائیس گھسیارے خیمہ و خرگاہ بیل و خچر کل ضروریات برائے رسالہ ہزار سوار افسر جنگ بہادر کے انتخاب اور پسند کے مطابق بہ تعجیل تمام تر اخیں دیدیئے جائیں اور ایک خط مسٹر پلاؤڈن کا ان امور کی بابت ملاحظۂ اقدس میں داخل کر دیا حضور پرنور کو اس خط اور ان احکام پر بہت حیرت ہوئی کہ بغیر اجازت حاصل کئے یہ احکام جاری کر دیئے گئے۔ لہذا حکم اقدس صادر ہوا کہ فوراً یہ احکام منسوخ کئے جائیں۔ یہ جرم بھی میری طرف منسوب کیا گیا باوجودیکہ مجھکو اس وقت خبر ہوئی کہ جب حضرت بندگان عالی نے معروضہ منسٹر کا اور خط مسٹر پلاؤڈن کا مجھکو عطا فرما کر منسوخی احکام کا حکم صادر فرمایا۔

بہر حال چوں کہ "امپیریل پالسی" کی مخالفت حد بغاوت تک پہونچتی ہے وہ کون شامت زدہ ہے کہ جو گورنمنٹ کے مقاصد میں خلل انداز ہو اس کے برخلاف گورنمنٹ کے مقاصد کی تائید کرنے سے بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں۔ اگر آقا خفا ہو جائے تو رزیڈنٹ سے لے کر فارن آفس تک آقا کے خنگل سے بچانے کو موجود ہیں۔ نواب فیض علی خاں وزیر جے پور کی مثال موجود ہے کہ نہ فقط خطابات و جاگیرات سے سرفراز ہوئے بلکہ ریاستہائے راجپوتانہ پر صاحب حکومت بنا دیئے گئے اور آج تک وزارت جے پور ان کے خاندان میں موجود ہے چنانچہ معلوم نہیں کہ مخالفین نے میری نسبت کیا کیا باور کرایا کہ اختلاف رائے بھی جرم قرار پائی اور مسٹر پلاؤڈن نے مجھ سے کہا کہ "سرور جنگ یاد رکھو کہ تمھاری آئندہ بہبودی میرے ہاتھ میں ہے اگر سیدھے چلوگے تو انعام و اکرام خطابات سب کچھ تمھارا حصہ ہے ورنہ میرے قلم کی ایک گردش میں تمھارے نام و نشان کا پتا بھی نہ رہے گا" مجھ شامت زدہ نے جواب دیا کہ "مسٹر پلاؤڈن میں نے اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں رکھی ہے غیر کے ہاتھ میں نہیں دی مجھکو اپنی خدمت

موجودہ پر فخر نہیں ہے بلکہ اس امر پر ناز ہے کہ میں ہز ہائینس کا وہ شاگرد ہوں کہ میرے ہاتھ پر تعلیم شروع ہوئی اور میرے ہی ہاتھ پر ختم ہوئی اور میری یہ شیخی کیا کم ہے کہ میرے "رائل ماسٹر" میری دیانت و امانت پر اعتبار کلّی فرماتے ہیں۔"

ادھر اسی زمانہ میں ہر فرجی و فریدونجی اور دیگر بارسوخ لوگ منسٹر کی طرف سے میرے پاس آئے اور بہت فہمائش کی کہ منسٹر کا یہ قول صحیح ہے کہ آپ کا مسلک نہ فقط غلط ہے بلکہ ہم سب کے واسطے نقصان دہ ہے۔ جب ہم نے سولہ سو سوار کا اقرار کر لیا تو اب نقض عہد میں بڑے اندیشے ہیں۔ پھر مجھے دھوکہ سے فلک نما بلا کر اس انگریزی افسر سے میری مٹھ بھیڑ کرا دی اس صحبت میں میجر گاف، افسر جنگ، ہر فرجی اور خود وزیر وقت موجود تھے۔ افسر جنگ بہادر نے جو مونھ میں آیا میری نسبت کہہ ڈالا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اس پر حاضرین جلسہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ یہ مونھ زوری ان کی صرف اس انگریزی افسر کی موجودگی کے باعث ہوئی ہے۔ لہذا ہنس کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

مسٹر پلاؤڈن نے حضور پر نور کو لکھا کہ جب سولہ سو سوار آپ عنایت فرما چکے ہیں، جن میں سے ہم صرف ایک ہزار مانگتے ہیں تو اب کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ میں نے وہ مسودۂ دستخط فرمودہ پیش کیا اور عرض کیا کہ حضور نے صرف آٹھ سو سوار عنایت فرمائے ہیں عبارت ملاحظہ فرمائیے صاف لکھا ہے کہ "اس وقت آٹھ سو سوار دیتا ہوں اگر ضرورت کا وقت آیا تو باقی سوار بھی دیدیئے جائیں گے۔" فدوی نے اسی وقت چند بار مسودہ پڑھوایا اور حضور نے اس کو پسند فرمایا۔ پھر یہ خط میں نے مسٹر پلاؤڈن سے بار بار پڑھوایا۔ اب لفظ "اگر" شرطیہ کو یہاں سے فارن آفس تک کسی نے نہ دیکھا تو میری کیا خطا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے مسٹر پلاؤڈن کو بھی دکھایا اس وقت وہ چونک پڑے اور کہا۔ سرور جنگ تمھارا

استدلال صحیح ہے ہم نے بڑا دھوکا کھایا۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں اور اس آفیسر کو کیا جواب دوں۔ میں نے کہا کہ یہ سب ہنگامہ افسر جنگ بہادر کا مچایا ہوا ہے آٹھ سو سوار سے زیادہ کسی طرح اس وقت ممکن نہیں ہیں۔ وہ بولے کہ افسر جنگ کا ناحق نام لیتے ہو یہ کارستانی تمھاری ہے۔ میں باقسمت بانصیب کہہ کر چلا آیا۔

رسالہ کے قیام گاہ کا مسئلہ

اس کے بعد اس رسالہ کی قیام کا مسئلہ پیش ہوا افسر جنگ نے قلعہ گولکنڈہ[1] اور اس کا میدان تجویز کیا۔ میں نے حضور پرنور سے عرض کیا کہ قلعۂ گولکنڈہ خاص تمغائے ریاست آصفیہ اور نہایت قدیم اور تاریخی مقام ہے معلوم نہیں رفتہ رفتہ اس فوج کا کیا انجام ہو اور بعد افسر جنگ بہادر کون اس کا کمانڈر مقرر ہو۔ مگر بہرصورت کسی نہ کسی وقت قلعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور اکثر سواری مبارک مع محلات قلعہ میں رونق افروز ہوتی ہے۔ لہذا یہ فوج جس قدر ہو بلدہ سے دور رکھی جائے۔ حضور پرنور نے اس رائے کو پسند فرمایا۔ مگر یہ ایک جرم اور میری فرد جرائم میں بڑھایا گیا۔ ایک بار افسر جنگ بہادر چند جاپانی فوجی سپاہیوں کو قلعہ میں لے گئے ہیں نے بحکم حضور پرنور فوراً وزیر وقت کو لکھا کہ قلعہ جائے ہوا خوری حضرت اقدس و اعلیٰ ہے مناسب ہے کہ بغیر آپ کی اطلاع اور خاص اجازت کے آئندہ کوئی سیاح قلعہ میں جاکر دعوت وغیرہ نہ کھایا کرے۔

---

[1] قلعہ بلدۂ حیدرآباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر جانب غرب واقع ہے۔ ابتدا میں راجہ ورنگل نے اس کو تعمیر کیا تھا ۱۳۶۴ء میں قلعہ مع مضافات کے محمد شاہ بہمنی کے قبضہ و تصرف میں آیا اور محمد نگر کے نام سے موسوم ہوا ۱۵۱۲ء میں قلعہ بعد ختم سلطنت بہمنیہ قطب شاہوں کے قبضہ میں آیا اور شہر حیدرآباد کی بنا تک یعنی ۱۶۷۰ء تک قطب شاہی حکومت کا دارالسلطنت رہا۔ جہاں اس وقت شہر حیدرآباد ہے وہاں سابق میں ایک مختصر قصبہ تھا جسے بھاگ نگر کہتے تھے ۱۲

پنسل کا رقعہ | ایک روز رزیڈنٹ نے خانگی طور پر ایک رقعہ پنسل سے لکھا ہوا چند گاڑیوں کی طلب کے واسطے حضور پرنور کو لکھا وہ خط سوار میرے پاس لایا میں نے وہ خط فوراً واپس کر دیا اور سوار سے کہہ دیا کہ اس قسم کے خط یہاں نہیں لئے جاتے ؟

استقبال نہ ہونا | ایک بار اور شاید گورنر مدراس یا اور کوئی عزیز مہمان رزیڈنسی میں آیا ہوا تھا اور حضور پرنور باز دید کے واسطے حسب دستور رزیڈنسی تشریف لے گئے۔ مسٹر بلاؤڈن استقبال کو نہ آئے اس کا رنج حضور پرنور کو ہوا۔ مجھ احمق نے فوراً مسٹر بلاؤڈن سے جواب طلب کیا۔

فوٹو کا واقعہ | حضور پرنور اور مسٹر بلاؤڈن نے ایک روز راجہ دین دیال فوٹوگرافر کے ہاں جا کر تصویر کھچوائی فوٹوگرافر نے اونچی کرسی حضور پرنور کے واسطے اور پست تر کرسی مسٹر بلاؤڈن کے واسطے رکھی اس وقت تو مسٹر بلاؤڈن مذکور خاموش رہے بعدہٗ مصور کو بلا کر خوب ڈانٹا اور حکم دیا کہ یہ تصویریں کسی کو نہ دی جائیں۔ ایک عرصہ کے بعد حضور پرنور نے ارشاد فرمایا کہ راجہ دین دیال وہ تصویریں نہیں لایا۔ آپ منگوا لیجئے۔ راجہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ مسٹر بلاؤڈن اس کو تباہ کر دیں گے۔ میں نے تحریری حکم اُس کو دیدیا اور تصویریں منگوا لیں۔

ڈاکخانہ کی گستاخی | اور سنئیے پوسٹ آفس چادر گھاٹ سے ایک نوٹس حضور پرنور کے نام آیا کہ "خود حاضر ہو کر یا کسی اپنے مختار کو بھیج کر پلندہ پارسل اپنے نام کے لے لو" میں نے اس پر بڑی خط وکتابت کی اور یاد دلایا کہ یہ مکان رزیڈنسی اور بازار رزیڈنسی صرف بخیال دوستی رزیڈنٹ کو دیا گیا ہے ورنہ ابتداءً آپ کا قیام بلارم میں تھا۔ پس پوسٹ آفس و تار گھر وغیرہ محض برعایت یہاں قائم کیا گیا اگر ایسی گستاخیاں ادنیٰ ادنیٰ ملازم رزیڈنسی کریں گے تو پھر

بلا رم ہی بہتر مقام ہوگا

خود مختارانہ کار روائیاں

ادھر منسٹر نے کئی منصب اور وظائف بلا منظوری حضور پر نور جاری کردیئے تھے اس خود مختارانہ کارروائی کو میں نے تہدید کے ساتھ روکا۔ خلاصہ ایں کہ کل اہلکاران ریاست چہ ہندوستانی وچہ یورپین میری سخت گیری[1] کے باعث یک دل ہوکر میری مخالفت پر مستعد ہوگئے اور میں بھی موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ اپنی عزت بچاکر اس خدمت سے سبکدوش ہوجاؤں اس واسطے کہ اب صاف صاف مجھ میں اور نواب وقار الامرا بہادر میں مخالفت کلّی قائم ہوگئی اور مسٹر بلاؤڈن نے اپنی پوری قوت کے ساتھ منسٹر کو مدد دینی شروع کردی۔ منسٹر نے مسٹر ہرمزجی اور فردونجی کو میرے پاس یہ پیام دے کر بھیجا کہ اب تم اپنی خدمت سے الگ ہوجاؤ اور میں ذمہ کرتا ہوں کہ کل حقوق آپ کے میں قائم رکھوں گا۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ میں خود اپنی طرف سے علٰحدگی اختیار نہیں کرسکتا۔ بندگی بیچارگی بعد حضرت رب العزت جل جلالہ وعم نوالہ اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم مجھ پر اطاعت حضرت بندگان عالی حضور پر نور مدظلہ تعالیٰ فرض ہے پس بہتر ہوگا کہ آپ میری علٰحدگی کے واسطے درخواست داخل کریں یا مسٹر بلاؤڈن درخواست پیش کریں۔ پھر بطور شکایت دوستانہ میں نے خود ہرمزجی کو یاد دلایا کہ یہ خدمت معتمدی تم کو میری سفارش سے میسر ہوئی اور پانسو روپیہ منصب بھی میں نے ہی منظور کرائے۔ ورنہ تمھارے نام سے حضور پر نور کو غصہ آجاتا ہے۔ غرض یہ دونوں صاحب جواب لے کر چلے گئے۔ اگرچہ مسٹر فردونجی[2] نے دوستانہ چند الفاظ بطور نصیحت مجھ سے کہے مگر

---

[1] اس زمانہ میں چند یوروپین قلم فروش میرے پاس بھی آئے تھے مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ مثل دیگر عہدہ داران ریاست میں ان کے قلم کا محتاج نہیں ہوں ۱۲ [2] سر فردون الملک جنھوں نے بعہد مبارک اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ ایسی ترقی کی کہ صدر اعظم باب حکومت مقرر ہوئے۔ نواب محسن الملک کے وابستہ تھے اور محسن الملک ہی نے ان کو

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آیندہ)

میں تو اپنی پولیٹکل موت کو بہت دنوں سے سمجھ گیا تھا اس واسطے کہ نواب وقار الامرا بہادر مجھکو اپنا رقیب سمجھ چکے تھے اور میں ایسے بڑے امیر اور وزیر سلطنت کا کسی طرح مدمقابل نہ تھا مگر اپنی طرف سے درخواست دینے میں بھی مجھے خوف تھا کہ مبادا حضور پر نور یہ خیال فرمائیں کہ میں پھر ترقی کا طامع ہوا ہوں جو درخواست دے رہا ہوں - اب کشش و کوشش بدرجۂ غایت بڑھ گئی - ڈاکٹر لاڈر جو خانگی ملازم نواب وقار الامرا کے تھے ان کو مسٹر فردونجی کی خدمت لینے کی ہوس پیدا ہوئی اور منسٹر اور مسٹر پلاؤڈن نے بھی ان کی تائید زور سے کی مگر ایسی نازک خدمت پر کسی ایسے شخص کا تقرر جو اپنے قابو سے باہر ہو نہایت اندیشہ ناک تھا - حضور پر نور نے میری رائے پسند فرمائی اور مسٹر فردونجی کو ان کی خدمت پر قائم رکھا -

ولی عہد بہادر کی تعلیم کا مسئلہ

اسی زمانہ میں مسئلہ تعلیم خاقان فلاطون بداہت خورشید آسمان احسان و رافت منظرۂ چارطاق غایت عناصر لائق حکومت و ایالت اقالیم و اراضی محسود شاہان حال و ماضی عالی جاہ عالم پناہ شہزادہ میر عثمان علی خاں بہادر پیش ہوا - میں نے عرض کیا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

ر نواب لائق علی خاں کا پرائیویٹ سکرٹری مقرر کرایا تھا - مہاراجہ کشن پرشاد کے زمانۂ مدار المہامی تک یہ ہر منسٹر کے محض پرائیویٹ سکرٹری رہے ان کا کام صرف یہ تھا کہ سرکاری مہمانوں کے آرام و آسائش کا انتظام کریں - نواب وقار الامرا جب وزیر ہوئے تو نواب صاحب نے بجائے فردونجی کے مسٹر لاڈر اپنے ملازم خانگی کو اپنا سرکاری پرائیویٹ سکرٹری مقرر کرنا چاہا - فردون جی سراسیمہ اور پریشان مسٹر ارڈل مارٹن کو ساتھ لئے ہوئے والد کے پاس آئے اور فردون جی نے آفتاب کی طرف اشارہ کرکے قسم کھائی اگر آپ مجھے اس وقت بچالیں تو جب تک زندہ ہوں آپ کا غلام رہوں گا - چنانچہ والد نے نواب وقار الامرا سے کہدیا تھا کہ گورنمنٹ پرائیویٹ سکرٹری فردون جی ہی رہیں گے - مارٹن صاحب نے اس کا ذکر اپنے حالات زندگی (Reminiscences) میں کیا ہے - صبح کا وقت تھا اور اُس وقت والد کے پاس میں خود موجود تھا ۔ ذوالقدر جنگ

کپتان جان کلارک کہ چند روز شاگرد[1] حضور پرنور رہ چکے ہیں اور بخطاب استحکام الدولہ مستقل جنگ
کپتان جان کلارک خان بہادر ہفت ہزاری منصب سے سرفراز ہو چکے ہیں اور ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند کے
ایکوری اور مصاحب خاص پرنس آف ویلز رہے ہیں ان کو پھر طلب فرمالیا جائے وہ نہایت
مستقل مزاج و بلند حوصلہ آدمی ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا پر بھی پڑ سکتا ہے
چنانچہ حسب الحکم میں نے کپتان[2] موصوف کو لکھا کہ اگر آپ پھر ارادہ ہندوستان کا رکھتے ہیں تو
حضور پرنور آپ کو بکمال قدردانی طلب فرمارہے ہیں فوراً چلے آیئے۔ میری یہ کارروائی مسٹر
پلاؤڈن کو نہایت ناگوار گزری مگر چوں کہ اتنی قدرت نہ رکھتے تھے کہ اس کو روک سکیں نہایت
ذلیل راستہ اختیار کرکے میری اس عمدہ تدبیر کو خراب کردیا اور ڈاکٹر کو پورا موقع مجھ سے
بدلا لینے کا مل گیا۔

ریلوے کے حصص کے فروخت کی تجویز

یہ سب امور میری خرابی کے جمع ہورہے تھے کہ ایک روز ایجنٹ بنک
آف بنگال کا جس کا نام میں بھول گیا مسٹر پالمر کے ہمراہ میرے پاس آیا
اور ایک نیا قصہ اس نے بیان کیا۔ میں نہایت متردد ہوا کہ یہ جرأت ان لوگوں کو کیوں کر ہوئی
گویا نواب وقار الامرا اور ان کے مشیر اور اہلکار خود اپنی ذات کو مالک بالاستحقاق ریاست آصفیہ کا

---

[1] قدیم شاہی آداب کی رو سے "استاد شاہ" کو "شاگرد" ہی لکھتے تھے۔ اسی وجہ سے شاہ دکن کے استاد کے لیے "شاگرد" لکھا گیا۔ لہٰذا جس جگہ "شاگرد حضور پرنور" لکھا ہو اس کے معنی "استاد" ہی کے لینے چاہئیں ۱۲

[2] کلارک صاحب شاید ۱۸۹۵ء میں طلب ہوئے تھے۔ میں اس وقت انگلستان میں تعلیم پا رہا تھا۔ والد کے لکھنے پر میں بھی کلارک صاحب سے ملا تھا اس وقت یہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی صاحبزادی پرنسس آف باٹنبرگ کے بچوں کے اتالیق تھے۔ از حد خوش تھے کہ حضور نظام نے "مجھے پھر یاد فرمایا ہے" مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جب یہ بمبئی پہونچے باوجود اطلاع نواب وقار الامرا کے مہمان ہو گئے۔ حضرت غفران مکان کو یہ فعل کلارک صاحب کا ناپسند ہوا ۱۲

ذوالقدر جنگ

سمجھنے لگے کہ بغیر اطلاع و منظوری حضرت ظل اللہ ایسا اہم اور عظیم کام کر بیٹھے اور مسٹر بلاؤڈن مسٹر کی محبت میں لارڈ لینسڈون کے "فری ہینڈ" کا لفظ ایسی جلد بھول گئے۔ میں نے اسی وقت عرضی حضور پرنور کو لکھی کہ ایک امر ایسا ضروری واقع ہوا ہے کہ فدوی کی باریابی ضروری ہے۔ چنانچہ معروضہ میرا قبول ہوا اور میں نے کل حال گزارش کر دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر فرحی نواب وقار الامرا کے مشیر خاص ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ ان کو فینانس سے کچھ تعلق نہ تھا تاہم بمشورہ مسٹر بلاؤڈن انھوں نے ایک اسکیم مرتب کی کہ چوں کہ سکہ حالی بازار میں کم ہو گیا ہے لہٰذا جو ہمارے ریلوے کے حصے انگلستان میں بے کار پڑے ہوئے ہیں ان کو بیچ کر چاندی خریدی جائے اور سکہ حالی بمبئی کی ٹکسال میں ڈھلوا کر حیدرآباد کے بازار میں چلایا جائے۔ ایجنٹ بینک آف بنگال نے مجھ سے کہا کہ حالی سکہ کافی موجود ہے مگر عہدہ داروں کی بدانتظامی سے ساہوکاروں نے روپیہ دبا رکھا ہے۔ میں نے حضور سے عرض کیا کہ یہ ریلوے کے حصے کسی شدید ضرورت کے واسطے رکھے گئے ہیں جو اب برباد کیے جاتے ہیں اور یہ تجویز بھی شیخ چلی کی تجویز ہے کہ لندن کے بازار میں چاندی خریدی جائے اور وہ بمبئی لائی جائے۔ اب اگر اس کی خرید اور اس کی باربرداری اور ضرب سکہ میں نقصان عظیم ہوا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا۔ دوسرے اس تجویز کی برائی بھلائی سے قطع نظر یہ کتنے غضب کی بات ہے کہ اتنے بڑے کام کے متعلق بلا اطلاع حضور کے اور بلا اخذ اجازت خود مختارانہ کارروائی شروع کر دی۔ فینانس کا فن ایسا دقیق ہے کہ بڑے بڑے دور اندیش اور خوش فکر مدبرین اور مشاق و تجربہ کار یورپ اور امریکہ کے غلطی کر جاتے ہیں تو دیوالہ نکل جاتا ہے اور نواب وقار الامرا تو جو ان کے مشیروں نے رائے پیش کی اس پر دستخط کر دیتے ہیں۔ میں یہ معروضات کر ہی رہا تھا کہ مسٹر پالمر کا خط میرے پاس آیا کہ کل صبح کو

مسٹر گرائی صدر محاسب تجویز سے کر کلکتہ روانہ ہوتے ہیں تاکہ وائسرائے کے فینانشیل ممبر کونسل سے مشورہ لے کر ان سے استمداد کریں۔ یہ نیا شگوفہ کھلا میں نے فوراً حسب الحکم مسٹر گرائے کو ٹیلیفون دیا کہ اگر تم کل ریلوے اسٹیشن پر گئے تو تم اپنے تئیں برطرف سمجھو۔ اس ٹیلیفون سے جو قیامت برپا ہوئی وہ قابل بیان نہیں ہے۔ مسٹر گرائے تو خوف زدہ میرے پاس آئے اور معذرت کر کے اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور مسٹر بلاؤڈن گویا شمشیر برہنہ بے ٹوپی اُتارے سیدھے حضور پرنور کے روبرو کھڑے ہوگئے اور بیٹھنے سے پہلے تشدد کے ساتھ کہا کہ پہلے یہ فرمایئے کہ سررجنگ یہاں منسٹر ہے یا وقارالامرا؟

علیحدگی کی درخواست | اب میں کہاں تک اس قصہ کو تفصیل کے ساتھ لکھوں میں نے باریاب ہو کر عرض کیا کہ میری وجہ سے مسٹر بلاؤڈن ان خلاف ادب افعال کے مرتکب ہو رہے ہیں جو فدوی دیکھ نہیں سکتا۔ علاوہ ازیں خود منسٹر اور اس کے مشیر خود مختار بننا چاہتے ہیں اس کے لئے اور کوئی درجہ کوشش کا نہ اٹھا رکھیں گے۔ لہذا اس وقت فدوی کی علیحدگی مناسب ہے فرمایا کہ "حضرت اگر آپ الگ ہو گئے تو میں گویا گدی سے اُتر گیا" میں نے عرض کیا کہ میں کب ان قدموں سے جدا ہوتا ہوں ؎

عزیزے کہ از درگہت سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

لیکن مصلحت یہ ہی ہے کہ یہ وقت شدید ٹال دینا چاہیئے اس کے بعد ؎

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس دم
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

نواب امیر کبیر بہادر[1] کے کمرہ میں حاضر تھے ان کو طلب فرما کر مشورہ فرمایا نواب صاحب

---

[1] نواب سر خورشید جاہ بہادر ۱۲

سن رسیدہ تجربہ کار اور نہایت بلند ہمت امیر تھے اُنھوں نے عرض کیا کہ اگر مسٹر پلاؤڈن کی یہ بے جا کارروائیاں گورنمنٹ آف انڈیا کو معلوم ہوجائیں تو ضرور ان سے باز پرس ہوگی پس مجھکو اجازت ہو کہ میں ان کو کامل فہمائش کردوں۔ باایں ہمہ خود میرے اصرار پر قرار پایا کہ چند روز میرا ہٹ جانا مناسب ہے۔ اس کو شاید ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ مسٹر پلاؤڈن نے پھر دھمکی کا ایک خط بھیجا۔ حضور پرنور نے نواب امیر کبیر کو یاد فرمایا آنھوں نے پھر عرض کیا آپ کیوں خاطر مبارک پریشان فرماتے ہیں میں یہاں سے گورنمنٹ تک مسٹر پلاؤڈن کی اصلاح کرسکتا ہوں۔ مگر حضور پرنور کا رنج اور فکر رفع نہ ہوا۔ یہ حالت دیکھکر نواب صاحب بھی متردد ہوگئے اور عرض کیا کہ سرور جنگ ہی کو اجازت عطا ہوجائے بہرحال جلد معاملہ کی یکسوئی ہونی چاہیئے۔ آپ کی پریشانی ہم خانہ زاد ہرگز برداشت نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد اُنھوں نے باہر آکر مجھے بلایا اور کل کیفیت بیان کرکے کہا کہ آپ خود باریاب ہوکر حضور پرنور کی پریشانی رفع کیجئے۔ وقارالامرا اور ان کے ہواخواہ حاضرباشان ڈیوڑھی مبارک نہایت پریشان کن باتیں گوش گزار کر رہے ہیں۔ میں اسی وقت کمرہ میں گیا۔ حضور پرنور نہایت افسردہ خاطر کرسی پر رونق افروز تھے۔ حضور پرنور نے مجھکو دیکھکر فرمایا کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ چند روز علحدہ ہوکر بلدہ ہی میں مقیم رہیں میں نے عرض کیا بہت ممکن ہے مگر اغیار کے حملے برابر جاری رہیں گے۔ اس وقت تو فدوی اپنی مصلحت سے جائے گا آئندہ نہ معلوم کیا تہمتیں مجھ پر لگائیں فرمایا "کیا وہ تہمتیں ممکن ہیں دراں حالے کہ میں موجود ہوں" میں نے عرض کیا کہ میری آبرو اسی میں بچتی ہے کہ میں خود چند روز کے واسطے باہر چلا جاؤں حضور فدوی کو چھ ماہ کی رخصت عطا فرمائیں اور یہ مدّت چشم زدن میں ختم ہوجائے گی مگر کوئی حکم تحریری نہ فرمایا جائے خانگی طور پر اجازت عطا ہو۔ چنانچہ دوسرے یا تیسرے روز نواب خورشید جاہ نے مجھکو اطلاع دی کہ

آپ کی رائے منظورِ اقدس ہوئی - برائے شش ماہ آپ جا سکتے ہیں - میں نے اسی وقت احمد حسین[۱]
اپنے مددگار کو جن کو میں بوجہ ان کی دیانت اور ایمانداری کے اپنے فرزندوں کی برابر سمجھتا تھا

---

[۱] احمد حسین اب سرامین جنگ اور صدر المہام پیشی ہیں - جس وقت مولوی محی الدین خاں کو والد ماجد نے اپنی مددگاری سے علیحدہ کر کے بہ ترقی ہائی کورٹ کی ججی پر مامور کیا تو مسٹر ارڈلی نارٹن احمد حسین کو اپنے ہمراہ لائے اور کہا کہ یہ میرے شاگرد ہیں - آدمی لائق رازدار اور امانت دار ہیں اور ہمیشہ آپ کے خیرخواہ رہیں گے - چوں کہ محی الدین خاں کے قدیم تعلق اور خیر خواہی کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا - والد نے احمد حسین کو ماہوار تین سو روپیہ اپنی مددگاری پر مقرر کر لیا اور پھر قلیل عرصہ میں پانسو اور پھر بارہ سو روپیہ ان کی تنخواہ کر دی - آخر بار حسب خواہش احمد حسین حضرت غفران مکان سے سات سو کی سفارش کی لیکن حضور پر نور نے سہواً سات سو ماہوار کی ترقی کا حکم صادر فرمایا اور والد نے یہی حکم جاری کر دیا - نواب وقار الامراء نے بلحاظ قواعد مندرجہ قانونچہ مبارک توجہ دلائی کہ مددگار کی تنخواہ آٹھ سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن حکم نافذ ہوا کہ قانونچہ مبارک کا اثر وزیر کے اختیارات پر پڑتا ہے نہ کہ اقتدار شاہی پر - پس حکم کی تعمیل کی جائے - اور جب والد حیدر آباد سے روانہ ہوئے تو حضور پر نور سے سفارش کی کہ چوں کہ احمد حسین نے امانت اور رازداری کے ساتھ کام کیا ہے - لہذا معتمد پیشی کا کام ان ہی سے اگر لیا جائے تو مناسب ہو گا - اسٹیشن پر احمد حسین زار و قطار رو رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ جب آپ یہاں نہیں تو میرا یہاں کیا کام ہے میں بھی آپ کے ہمراہ چلتا ہوں - والد نے ان کی کماں درجہ تشفی کی اور کہا کہ دیکھو تمہارے واسطے کیا ہوتا ہے - ابتدا میں تو احمد حسین نے خیر خواہی کے ساتھ کام کیا مگر جب ان کے تعلقات مخالفین کے ساتھ قائم ہوئے اور ان کے قدم جمتے گئے تو رفتہ رفتہ احسان اور خیر خواہی کا پاس اور خیال ان کے قلب سے محو ہوتا گیا اور میرے ساتھ تو انھوں نے وہ کیا جو شاید کبھی دشمن بھی نہ کرتا - جب میں ۱۸۹۸ء میں بوجہ علالت انگلستان سے ہندوستان آیا تھا تو احمد حسین نے چنچل گوڑہ کے مکان میں خود آکر مجھ سے کہا تھا کہ مبارک ہو تم حضرت ولی عہد شہزادہ میر عثمان علی خاں کے شاگرد مقرر ہوئے اور حضور پر نور کا ارشاد ہے کہ نہایت احتیاط سے کام کرنا ہوگا - مگر خود انھوں نے اس تجویز کو نابود کر دیا - میری ترقی کبھی برادر محترم کو پسند نہ ہوئی اور جب میں اپنی شومی قسمت سے عتاب شاہی میں آیا اور وطن چھوڑنا پڑا تب بھائی صاحب نے ذرا سی بھی مجھ بے گناہ کے بچانے میں کوشش نہیں کی - جب میرے آقائے ولی نعمت نے میری بے گناہی سے واقف ہو کر ۱۹۲۱ء میں حیدر آباد طلب فرمایا اور خدمت معتمدی عدالت و کوتوالی سے سرفراز فرمایا تو انھوں نے پھر مجھ سے ظاہر برادرانہ تعلق قائم کیا - اس کے بعد جب بھائی احمد حسین چند روز کے واسطے صدر المہام عدالت مقرر ہوئے تو اپنی مخالفت کو علانیہ ظاہر کر دیا - جو شدید نقصان کہ مجھ کو پہونچایا گیا اُس کی گواہی برادرم موصوف کا دل خود دے گا - اب تک معلوم نہ ہوا کہ بھائی صاحب میرے اس قدر درپے نقصان کیوں ہوئے - اس لئے کہ میں سچے دل سے ہمیشہ ان کا خیر خواہ رہا ۱۲

ذوالقدر جنگ

طلب کیا اور کل معاملات ان کو سمجھا دیئے۔ اس کے بعد نماز عشا سے فارغ ہو کر میں نے استخارہ کیا۔ حکم اوّل مجھکو فوراً چلے جانے کا منکشف ہوا۔ میں نے نواب سربلند جنگ[1] کو طلب کر کے ان سے کہا کہ میں علی الصباح ریل پر سوار ہو جاتا ہوں آپ اپنی بھابی اماں اور بچوں کو معاملہ سمجھا دیجئے تاکہ پریشان نہ ہوں۔ وہ اور احمد حسین آب دیدہ ہونے لگے مگر میں نے اس وقت عرضی حضور پرنور کو لکھی اور ریلیاشاگرد پیشہ کے ذریعے سے داخل کرا دی۔ اس نے واپس آکر اطلاع دی کہ حضور پرنور اس وقت آرام فرما رہے ہیں اور رات کے دو بجگئے ہیں میں نے کہا کہ عرضی داخل کر کے چلا آ۔ جب بیدار ہونگے ملاحظہ فرمالیں گے۔ خلاصہ اس عرضی کا یہ تھا کہ فدوی علی الصباح ریل پر سوار ہوتا ہے اپنے اہل و عیال کو مکرمت سلطانی کی پناہ میں چھوڑے جاتا ہوں۔ فدوی کو استخارہ سے بھی معلوم ہوا ہے کہ میں فوراً روانہ ہو جاؤں۔ علاوہ اس کے چند امور بہ تفصیل بھی اس عرضی میں مندرج کر دیئے جن کا بیان طوالت بیجا ہوگا۔ بعد نماز صبح میں کمربستہ و دستار بہ سر سرکاری گاڑی و جوڑی میں سوار سرکاری چوبدار کوچ بکس پر نشستہ سیدھا اسٹیشن ریلوے[2] پر پہونچا۔ یہاں کرنل ڈابز سے ملاقات ہوئی میں نے ان کے ذریعے سے مسٹر پلاؤڈن کو پیام اس مضمون کا بھیجا کہ ؎

---

[1] ابن مولوی سمیع اللہ خاں سی۔ ام۔ جی داماد نواب سرور الملک ۱۲

[2] ۳۰ شعبان ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء۔ حیدرآباد سے جانے کے بعد بھی نواب سرور الملک بہادر کا تعلق امور ریاست سے رہا۔ چنانچہ دیکھو میموریل مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۷ء۔ حضرت غفران مکان جب تک زندہ رہے کوئی اہم کام بغیر مشورہ ان کے نہیں کرتے تھے۔ نواب صاحب کا نام اس وقت تک سول لسٹ میں شریک ہے ۱۲

ذوالقدر جنگ

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر مرا گلو بھی نہیں رہے گا
مگر میں قاتل کی او ستمگر ہمیشہ تو بھی نہیں رہے گا

میری حیدرآباد بلکہ ملازمت سرکاری کی زندگی اسی پر ختم ہو گئی۔ مابقی زندگی کے حالات میں عام دلچسپی کی کوئی بات نہیں نظر آتی البتہ اپنی اولاد کے فائدے اور نصیحت کے لئے اسے علیحدہ تحریر کروں گا۔

امرائے عظام و خوش باشان بلدہ و عہدہ داران ریاست جو بروئے کار تھے ان کی تصویریں تو میں حسب موقع کھینچ چکا ہوں۔ بعض اور حالات نیز کچھ اپنے حالات جو ذہن میں آتے جاتے ہیں وہ یہاں قلم بند کرتا ہوں کہ وہ بھی خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ ایک قول تو سر ریچرڈ میڈ کا صحیح ہے کہ اسلامی سلطنتیں جہاں جہاں قائم ہوئی ہیں چند سال کے اندر ایسی مفقود ہوئی ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ مگر اس ناپائیداری کے وجہ سے ناواقف رہ کر سر ریچرڈ نے اسلام کو اس کا ملزم قرار دیا۔ کتب تاریخ میں جو کچھ پڑھا وہ ایک طرف جو آنکھوں سے حیدرآباد میں دیکھا وہ بقول شخصے ؎

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

یعنی میں نے یہ دیکھا کہ ریاست حیدرآباد میں ہندو امرا بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ لاکھ کے جاگیردار مع خطابات و ڈنکا و نشان و چتر و عماری ہمسر مسلمان امرا کے موجود تھے اور پارسی و یورپین و دیسی عیسائی عہدہ دار بڑے بڑے مشاہروں پر اور راز کی خدمتوں پر مامور تھے اور حضرات سکھ یعنی سنگھ جی مہاراجوں کی تو بستی اور گردوارہ[1] ہی وہاں موجود ہے۔

[1] نانڈیر کا گردوارہ ۔ امرتسر (پنجاب) کے بعد اس گردوارہ کا درجہ ہے اور سرکار سے بڑی جاگیر اس کے اخراجات کے لئے عطا ہوئی ہے ۱۲

اسی طرح قریب قریب ہر مندر و ہر گرجا و آتشکدہ وہاں پر نقد و زمین و یومیہ و انعام و جاگیر سے سرفراز ہے۔ الغرض ہر ملت و مذہب و قوم کے لوگ ہمسر و ہم مرتبت اہل اسلام کے وہاں سمجھے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ شاید زیادہ تر اسناد یومیہ و انعام و وطن کے اہل ہنود کو بادشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے عطا کئے ہوئے ہیں گو اس بادشاہ کو یورپین مورخین نے درسی کتابوں میں بدنام کیا ہے۔ ان ہی اسناد کو دربار آصفیہ نے اب تک قائم رکھا ہے اور اس مذہبی خیرات میں بہت بڑا حصہ محاصل ریاست کا صرف ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلامی سلطنتوں میں گورے کالے مسلم غیر مسلم کے حقوق یکساں و برابر رکھے گئے تھے۔ مسلمانوں میں باہم ملک کے لحاظ سے کوئی مغل کوئی پٹھان کوئی ایرانی کوئی ترک و عرب وغیرہ کہلاتا تھا۔ لیکن مذہبی لحاظ سے سب ہم قوم سمجھے جاتے تھے۔ برخلاف عیسوی اقوام کے کہ ہمیشہ رنگ و زبان و ملک کے لحاظ سے غیر قوم و غیر وطنی دیسی و پردیسی ملکی و غیر ملکی کا فرق و جدائی قائم رہا ہے اور یہ تعصب قومی و مذہبی بالخصوص مغربی یورپ کی اقوام میں نہایت مذموم شکل پر قائم ہے اور یہ قومی اور مذہبی تعصب ان اقوام میں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ سوائے اپنے دوسری اقوام عالم کو بنی نوع انسان ہی نہیں سمجھتے اور مثل بہائم و سباع کے ان کا شکار کھیلنا اور ان کے مال و املاک پر قبضہ کرنا ایسا جانتے ہیں کہ گویا یہ دنیا صرف ان کے فوائد اور بہبودی کے واسطے خلق ہوئی ہے اور ان تعصبات مذکورہ کا نام انھوں نے "وطنیت" و قوم پرستی Nationalism رکھا ہے اور بنی آدم کے شکار کھیلنے کا اور ان کے مال و املاک و ممالک پر قبضہ کر لینے کا نام ڈپلومیسی Diplomacy یعنی اسٹیٹ مین شپ Statesmanship بمعنی تدبر[1] رکھا ہے۔ جہاں زور نہیں چلتا وہاں فریب و دغا

[1] اس بیسویں صدی عیسوی میں اس ڈاکہ زنی کا ثبوت اٹلی نے دیا کہ طرابلس غرب جو صدیوں سے دولت عثمانیہ یعنی ترکی میں شریک تھا اس کو بغیر کسی وجہ کے بجبر چھین لیا۔ اور دول یورپ نے ڈاکہ زنی کو روا رکھا ۱۲

کذب سے اور جہاں یہ بھی نہیں چلتا وہاں عجز و انکسار و چاپلوسی سے کام نکالتے ہیں یہ ان کی ڈپلومیسی ہے۔ خلاصہ این کہ اسلام نے تو ایسے نیشنلزم کو مٹایا اور اقوام یورپ و امریکہ نے اس کو ترقی دی۔ پس من جملہ دیگر وجوہ کے ایک بڑی وجہ اسلامی سلطنتوں کی خرابی کی یہ ہوئی کہ ان کی لغت میں نیشنلزم و ڈپلومیسی کا پتا نہ تھا۔ حبّ وطنی کے معنی محبت اسلام تھے کہ بحر اطلانتک مغربی سے لے کر تا حدود ختن سب گویا ایک قوم ہیں اور جہاں جہاں غیر ملت کے ممالک انھوں نے فتح کئے وہاں کے باشندوں کے حقوق و رسم و رواج و دین و ملت میں دخل نہیں دیا اور آج کل کے لحاظ سے بڑی غلطی یہ کی کہ ان کی آزادی اور خود مختاری کو قائم رکھا۔ ان اصول تمدّن اور ایسی طرز حکومت میں استحکام دولت شخصی دشوار تھا بالخصوص عیسوی ممالک مفتوحہ بصفات مذکورہ میں تو نہ فقط دشوار بلکہ ناممکن ثابت ہوا۔

غرض سر رچرڈ میڈ کا اعتراض اس حد تک تو ضرور درست ہے کہ اہل اسلام آزادی کو وضع الشیٔ علی غیر محلّہ برت کر اپنی حکومتوں کو مٹا بیٹھے۔ گو میں جانتا ہوں کہ موالات ان غیر مسلموں کے ساتھ جو برسر حساب نہیں ہیں احکام قرآن مجید و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بلا ریب جائز ہے۔ مگر سیاست و تدبیر ریاست میں وہ حزم و احتیاط جو ممنوع المذہب نہیں ہے نہ فقط جائز بلکہ فرض ہے۔ اگر ہمارا سلف اس احتیاط کو مدّ نظر رکھتا تو سوداگران برطانیۂ عظمیٰ بنگلہ و اڑیسہ کے دیوان نہ بنتے اور خلعت وزارت شاہان دہلی سے سرفراز نہ ہوتے اور ممالک ہند میں ڈھنڈورا " خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا" نہ پٹیا جاتا۔ یہی نقشہ میں نے حیدرآباد میں دیکھا کہ پہلے پارسی اور پھر مدراسی اور ان کے بعد حضرات ہندوستان برسرکار رہے یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا اس واسطے کہ یہ سب لوگ ہم وطن اور گویا ہم قوم و ہم زبان تھے۔ مگر رفتہ رفتہ نیم یورپین اور خالص یورپین بھی دخیل ریاست ہو گئے اور یہ غلطی

زیادہ تر مولوی مہدی علی خاں محسن الملک مرحوم سے نواب وزیر کے وقت میں ہوئی گو اور بھی لوگ موجود ہیں جو بطمع زر روزمین بلکہ صرف الفاظِ خان بہادری دسی۔ آئی آئی کے واسطے قوم و ملک فروشی سے دریغ نہیں کرتے۔

ریاست حیدر آباد میں ابتدا ابتدا میں یہ بھی میں نے دیکھا کہ سوائے دفاترِ تعمیراتِ عامّہ و معتمدِ خانگی کے کسی سررشتہ و محکمہ میں میز و کرسی ڈیسک وغیرہ انگریزی سامان مطلق نہ تھا حتی کہ کاغذ بھی کاغذی گدّے کا بنا ہوا تمام محکمہ جات و دفاتر و سررشتہ جات میں مستعمل تھا۔ عدالتوں میں دری چاندنی کا فرش تھا کل مکانات دیسی وضع کے تھے۔ مولوی صاحب ایک حجرے میں چلمن افگندہ اور اہل عملہ دالانوں میں اہل مقدمہ صحنوں میں بیٹھتے تھے۔ وکلاء کا تقرر جناب مولوی صاحب کے اختیار میں تھا۔ وکلاء اپنے مؤکلوں کو لے کر درِ عدالت پر حاضر رہتے اور مولوی صاحب فریقین کی بحث سن کر فتویٰ جاری فرماتے۔ بعض مرتبہ کوئی ماما اصیری کتب فقہ بغل میں لئے ہوئے اپنے موکل کی طرف سے قال اللہ و قال الرسول کے احکام سنا کر جناب مولانا سے فریقِ ثانی کے مقابلہ میں بازی لے جاتی۔ نہ قانون کی پیچیدگیاں تھیں نہ عدالت کے تباہ کن اخراجات تھے۔ مسلم غیر مسلم سب کے واسطے فقہ کا قانون تھا۔ قتل کے مقدمات میں مولوی صاحب کا فتویٰ با جازتِ وزارت پناہ بذریعہ تہنیت یار الدولہ برائے منظوری و حکم آخر بابِ خلافت میں بھیج کر سیاہہ ہوا کرتا تھا۔

ایک نوجوان مرد آدمی موسوم بہ فقیر صاحب مرید حضرت نور الدین شاہ قادری میرے پاس اکثر آیا کرتے تھے قلمدان کو قلمدان اور خربوزہ کو قربوزہ کہا کرتے تھے۔ جولب و لہجہ میں نے اکثر اہل بلدہ سے سنا جس سے میں نے قیاس کیا کہ ساکنانِ بلدہ اولاد میں ان اہل دہلی کے ہیں جو ہمراہ حضرت آصف جاہ آکر یہاں متوطن ہوئے تھے ان کا لب و لہجہ میں نے اکثر

اکثر باشندگان قدیم دہلی سے بہت ملتا جلتا پایا۔ اصل کہنی نژاد لوگ اضلاع کے دیہات میں بستے تھے اور بلدہ میں کم پائے جاتے تھے۔ ایک اور صاحب اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کا اسم شریف حافظ منصب علی تھا۔ اس زمانہ میں چوں کہ مصنوعی اہل دل صاحب کرامت فقرا و مشائخ بہت جمع ہو گئے تھے۔ اور اپنے وکلا کو ڈیوڑھی مبارک میں قائم کرکے امیرانہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے۔

حافظ صاحب نے بھی کسی فقیر مثل ڈوچی شاہ وغیرہ کے وکیل بن کر حضرت افضل الدولہ جنت آرامگاہ کے پاس بہت رسوخ حاصل کرلیا تھا اور شاید محلات مبارک کی کسی متوسلہ سے نکاح کرکے صاحب مال و دولت ہو گئے تھے۔ مگر باوجود اس کے اپنی سادگی پر تادم مرگ قایم رہے۔ بہت گھیر دار جامہ پہنے کمر ایک لمبے ڈوپٹہ سے بندھی ہوئی۔ دستار بسر۔ گرمی۔ جاڑے۔ برسات میں پیدل چلتے پھرتے تھے کبھی کسی سواری پر نہ نکلتے تھے۔ ان کا ایک لڑکا ممتاز علی نامی بشکل "وہنگ بائی" میرا شاگرد بھی تھا۔ حافظ صاحب[۵۱] نہایت با وضع ملنسار اور سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ ایک اور صاحب امداد حسین خاں صاحب باشندۂ لکھنؤ بھی مجھ سے ملا کرتے تھے۔ ایک شب کو کہ چاندنی تھی اور چند ملاقاتی جمع تھے کہ ایک بچھو سوزنی پر رینگتا ہوا نظر آیا۔ ایک صاحب اسے دیکھکر کہ نزدیک آگیا، گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ خاں صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ واہ صاحب ایک انگل بھر کیڑے سے آپ ڈر کر پریشان ہو گئے۔ ان صاحب نے کہا آپ ہی مرد دے بنئے اور اس کو پکڑ کر پھینک دیجئے۔ خاں صاحب نے جونہیں ہاتھ اس کی طرف دراز کیا اس نے انگلی پر ڈنک ماردیا۔ اِدھر تو خاں صاحب واہ بے بچھو۔ واہ بے بچھو کہہ کر تڑپ رہے تھے۔ اُدھر یاروں نے اب اِن پر قہقہے لگائے۔

ان دو مثالوں کی تحریر سے میری مراد یہ ہے کہ بلدۂ حیدرآباد از ابتدا دوسرے قطعات ہند کے

---

[۵۱] حافظ منصب علی صاحب ذوالقدر جنگ کی زوجہ کے حقیقی نانا ہوتے ہیں۔ اور ممتاز یار الدولہ اور لیاقت جنگ کے والد تھے۔

باشندوں سے آباد ہوتا رہا۔ بلکہ بیرونِ ہند کے باشندے بھی ایران و عرب و سرحد شمالی پنجاب سے اس ریاست کے فیضِ عام سے مستفید ہو کر یہاں رہ پڑے۔ یا اپنے وطن آتے جاتے رہے ہے۔ اور ملازمت کا تعلق یہیں رہتا۔ ایک نظم جمعیت کا رسائی دار میرے پاس رہا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ دیگر قطعات ہند کے باشندگان ملازمین ریاست کے بابتہ کہا کرتا تھا کہ "نہ لویا نہ جوتا۔ اللہ میاں نے دیا پوتا" خان صاحب تو یہاں خدمت پر ہیں اور گھر سے خط آرہا ہے کہ آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ قدیم دستور یہ تھا کہ مرد لوگ "یبتغون فضلاً من اللہ" دور دور کمانے کے واسطے جاتے اور عورتیں اپنے گھروں میں رہتی تھیں اب تو بوجہ تسلط صاحبانِ انگریز اہلِ ہند اپنے کمانے کے مقامات پر بی بی بچوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں تو مسلمانانِ ہند بہ پیرویِ شائستگانِ مغرب جورو کا ہاتھ بغل میں لے کر ٹھنڈی سڑک پر چہل قدمی کرتے ہیں یا فٹن پر بیٹھ کر ہوا کھاتے ہیں۔ خلاصہ این کہ حیدرآباد از ابتدا مرجع ہر قوم و ملت رہا۔ خود خاندانِ شاہی دہلی سے حیدرآباد میں آکر صاحبِ حکومت ہوا۔ خاندانِ وزارت بھی واسطی الاصل ہے۔ اسی طرح دیگر امرا کوئی اپنے تئیں عبدالرحیم خاں خانخاناں اور کوئی راجہ ٹوڈر مل کی باقیات الصالحات میں شمار کرتا ہے۔ ان معنوں میں دلّی والوں کا حق بوجہ ہم وطنی حیدرآباد پر بہ نسبت باشندگانِ دیگر قطعات ہند زیادہ تر ثابت ہے۔

اوپر میں کچھ حال ماما امیری کا لکھ آیا ہوں۔ یہ بھی قابلِ بیان ہے کہ حیدرآباد میں عورتوں کی قدر و منزلت بہت تھی۔ گو امرا و خوش باش لوگ ہندو و مسلمان کمال درجہ پردہ دار تھے۔ مگر عوام میں پردہ نہ تھا۔ خانہ داری کی حکومت پوری عورتوں کے ہاتھ میں تھی۔ گھر کی بزرگ تر بی بی کو سیاہ و سفید کا کامل اختیار تھا۔ بلکہ امورِ ریاست میں بھی عورتیں اتنی دخیل تھیں کہ شاہی احکام بنام امرا و وزرا ماماؤں کے ذریعے سے درج سیاہہ ہو کر جاری کئے جاتے تھے۔ ہر امیر کے ہاں ایک لشکر ماماؤں کا ملازم تھا۔ اور یہی خدمت بجا لاتی تھیں۔

ہندو امرا کے ہاں مثل پیشکار و مال والے و دفتر والے وغیرہم تلنگنیاں و دہیڑنیاں اس خدمت پر ملازم تھیں ایک امر خاص قابلِ بیان یہ کہ ہر امیر کے پاس ایک گروہ عورتوں کا ملازم تھا جن کو گارڈنیاں کہتے تھے۔ اِن کو خاص وردی دی جاتی تھی۔ مختصر اینکہ حیدرآباد میں عورتوں کو معاشرتی معاملات میں بڑی آزادی حاصل تھی۔ برخلاف اس کے امریکہ و اقوامِ یوروپ میں بہت تھوڑے زمانہ پہلے تک صرف آزادی ظاہری آزادی عورتوں کو حاصل تھی۔ مذہباً و معشرتاً و سیاستاً مردوں کے مقابلہ میں اِن کے کل حقوق معدوم تھے۔ اس زمانہ میں البتہ تعلیم یافتہ عورتوں نے اپنے حقوق مردوں سے طلب کرنے شروع کئے مگر یا بایں بے تمکی یا بایں شوری شوری اپنے استحقاق میں ایسا غلو کیا نہ فقط معاشرتی بلکہ سیاسی اُمور میں بھی مردوں کے ساتھ دعویٰ ہمسری کا کر رہی ہیں۔ اور ہر محکمہ میں و ہر دفتر میں خدمت و ملازمت کی مدعی ہیں اور کامیاب ہو رہی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی چوبیس برس قبل ماما امیری فقہ و حدیث و اصولِ قرآن کے مسائل پر بر سرِ عدالت بحث کر کے مقدمات مار لے جاتی تھی۔

عیسوی اقوام میں اب بی بی بیرسٹر دکھائی دیتی ہیں۔ باوجود اس کے سرکارِ انگریزی کے مدارس میں ہمارے نفوس پر یہ خیال نقش کیا گیا ہے کہ ہمارے مذہب میں عورتیں مثل جانورانِ باربرداری سمجھی جاتی ہیں۔ اور ہم لوگ اِن باتوں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیتے ہیں۔ کہ اپنے سلف کے سے مذہب پر یوروپین آزادی کو ترجیح دینے لگے۔ یہ مسئلہ کہ امورِ معاشرت میں احسن کون ہے۔ یہاں پر بوجہہ اختلافِ آرا، بحث کی گنجایش نہیں رکھتا مگر دوسروں کے سونے کو پیتل تعبیر کرنا اور چاندی کو رانگ بنا دینا مغرب یوروپ کے عیسائیوں کو اور اُنکی اولاد و اَحفاد کو جو دیگر ممالک و جزائر میں اصلی باشندوں کو نسکار کر کے آباد ہوئے ہیں۔ خوب آتا ہے۔ اور چونکہ فن کیمیا میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اپنے پیتل کو سونا اور اپنے رانگ کو چاندی۔ غرض بازار کرنے میں بہت چابک دست ہیں۔ المقصود جو مہذب آزادی اور معاشرتی و عرفی حقوق عورتوں کے واسطے مقرر کئے ہیں۔ وہ اس زمانہ میں

بلدہ فرخندہ بنیاد میں عام طور پر مروّج تھے۔ بقول "قدیم "کمائیں خانخاناں اڑائیں میاں فستوں" کمانے والے عورتیں خرچ کرنے والے۔ یہ عام اصول معشرت مُسلم و غیر مُسلم از سلف تا خلف اسوقت تک قائم ہے۔ ہماری عورتوں کو چار دیواری کے اندر وہ حکومت حاصل ہے جو اس وقت بھی باہر پھرنے والیوں کو نہیں ہے۔ رسم قوم کی ترقی کے واسطے مضر ہے یا مفید یہ ایک طویل بحث ہے۔ مگر ایشیائی اقوام میں کہیں بھی پردہ نہیں تھا۔ اور اسلام میں بھی بے نقاب نکلنا جائز ہے۔ ایک امر اور قابل بیان یہ ہے کہ نیشنلزم (Nationalism) جس کی بابتہ میں کچھ اوپر تحریر کر آیا ہوں پتہ بھی حیدرآباد میں نہ تھا۔

نواب محی الدولہ محتسب و صدر الصدور کی حکایت مشہور ہے کہ جو ہندِ شمالی غریب بلدۂ حیدرآباد میں وارد اور نواب ممدوح کی رسائی ہو جاتی تو وہ اِن کے ہاں مہمان رہتا۔ تا وقتیکہ اس کا مقصود حاصل ہو جاتا حتیٰ کہ نواب وزارت پناہ اونکی سفارشوں سے پریشان ہونے لگے۔ ہر سفارش کے وقت محتسب صاحب عہد نئی سفارش نہ کرنے کا کیا کرتے تھے۔ بقول ؎ تباہ گردد آں مملکت عنقریب
کز و خاطر آزردہ گردد غریب

میرے وقت تک ہر کہ و مہ نہایت غریب نواز تھا۔ مگر عہدِ وزارتِ نواب وزیر (لائق علی خاں) میں حضرات مدراس کے الفاظ ملکی و غیر ملکی ایجاد کئے۔ یعنی مدراسی ملکی و اہلِ ہندِ شمالی غیر ملکی نا قرد ہوئے۔ اس میں نواب موتمن جنگ سید حسین بلگرامی ہم زبان اہلِ مدراس کے ہوئے۔
مگر بعد ختم وزارت نواب وزیر اور دوران وزارت نواب سر آسمان جاہ میں یہ الفاظ مولوی محمد صدیق عماد جنگ کی زبان پر جاری رہے۔ فقط

تمت

نواب خانخانان بہادر